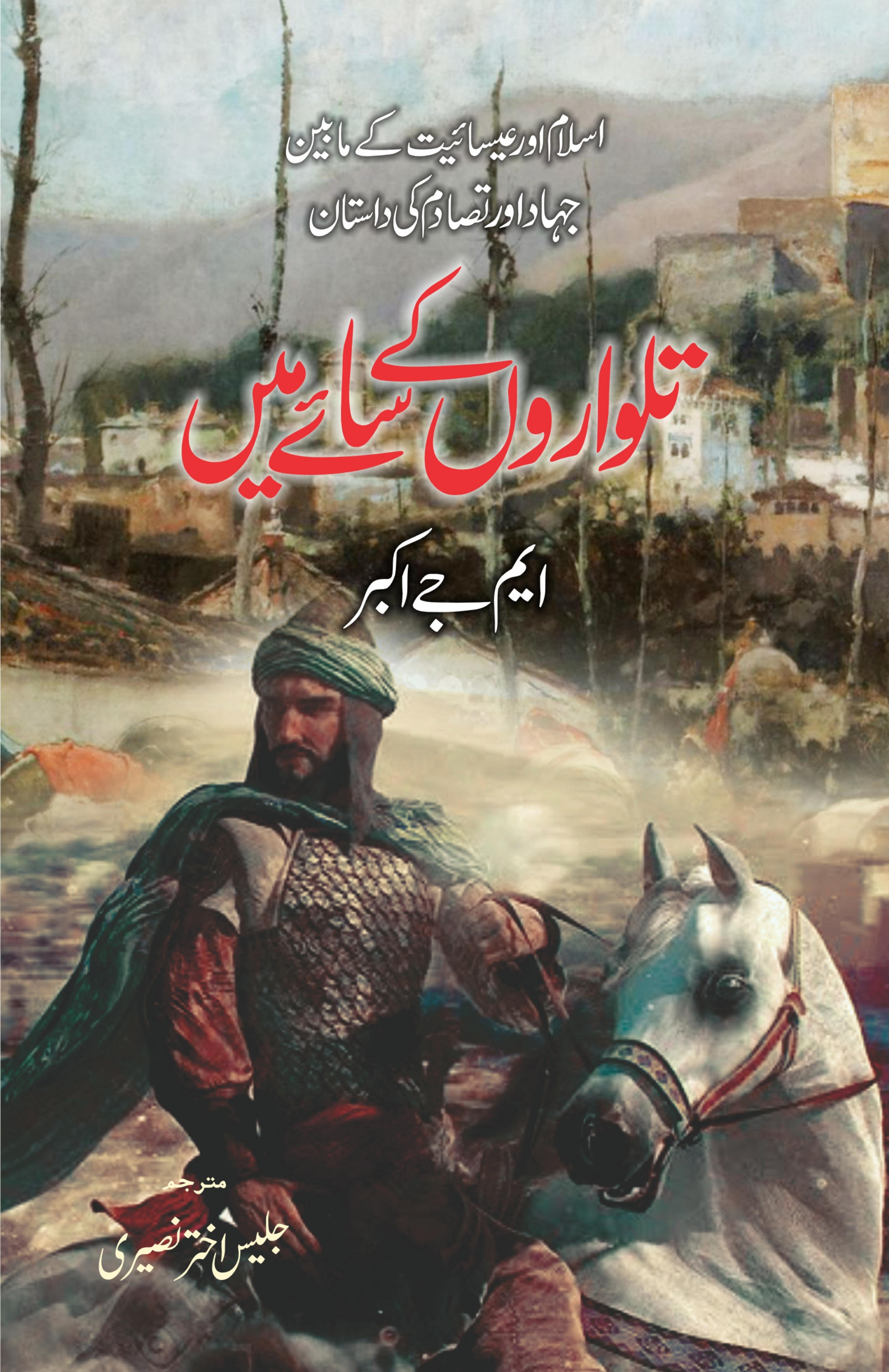
اسلام اور عیسائیت کے مابین
جہاد اور تصادم کی داستان
تلواروں کے سائے میں
ایم جے اکبر
مترجم
جلیس اختر نصیری

اسلام اور عیسائیت کے مابین
جہاد اور تصادم کی داستان

# تلواروں کے سائے میں

ایم جے اکبر

مترجم

جلیس اختر نصیری

KHUSRO FOUNDATION
www.khusrofoundation.org

پہلی اشاعت:

- یہ کتاب سب سے پہلے 2002 میں برطانیہ میں روٹلیج (Routledge) کے زیر اہتمام شائع ہوئی۔
پتہ: 11 نیو فیٹر لین، لندن EC4P 4EE
- اسی سال امریکہ اور کینیڈا میں بھی روٹلیج نے اسے اپنے نیو یارک کے دفتر سے شائع کیا۔
پتہ: 29 ویسٹ 35 ویں اسٹریٹ، نیو یارک، NY 10001
- جبکہ بھارت، پاکستان، سری لنکا اور بنگلہ دیش میں یہ اشاعت رولی بکس (Roli Books) کے زیر اہتمام منظر عام پر آئی۔ پتہ: ایم-75، گریٹر کیلاش II (مارکیٹ)، نئی دہلی: 110048، بھارت
- روٹلیج، ٹیلر اینڈ فرانسس گروپ کا ایک ذیلی ادارہ ہے۔
- اس ایڈیشن کا ٹیلر اینڈ فرانسس ای-لائبریری کے پلیٹ فارم پر 2002 میں اجرا کیا گیا۔

**©2002 ایم جے اکبر**

جملہ حقوق بحق مصنف محفوظ ہیں۔ اس کتاب کے کسی بھی حصے کو، خواہ وہ تحریری ہو یا تصویری، ناشر کی پیشگی تحریری اجازت کے بغیر نقل کرنا، دوبارہ شائع کرنا یا کسی بھی برقی، میکانیکی، صوتی، بصری یا دیگر ذرائع سے فی الحال یا آئندہ کے لیے محفوظ، منتقل یا نشر کرنا ممنوع ہے۔ اس میں فوٹو کاپی، ریکارڈنگ، یا کسی بھی قسم کے معلوماتی ذخیرہ و بازیابی کے نظام کے تحت استفادہ شامل ہے۔

برٹش لائبریری کیٹلاگنگ اِن پبلیکیشن ڈیٹا
اس کتاب کا کیٹلاگ ریکارڈ برٹش لائبریری میں دستیاب ہے۔

لائبریری آف کانگریس کیٹلاگنگ اِن پبلیکیشن ڈیٹا
اس کتاب کے لیے کیٹلاگ ریکارڈ کی درخواست دی گئی ہے۔

آئی ایس بی این: (ISBN)
ISBN 0-415-28470-8 (پرنٹ ایڈیشن)
ISBN 0-203-40210-3 (ماسٹر ای بک ایڈیشن)
ISBN 0-203-71034-7 (گلاس بک فارمیٹ)

امی جی اور ابا جی کی نذر

جو میری روح کی گہرائیوں میں

آج بھی موجود ہیں

*© All Rights Reserved to Khusro Foundation 2025*

**Talwaron ke Saye Mein**

**By: MJ Akbar**

Translated by :

Jalis Akhtar Nasiri

ISBN: 978-81-985023-1-5

Rs. 500/-

| | | |
|---|---|---|
| نامِ کتاب | : | تلواروں کے سایے میں |
| مصنف | : | ایم جے اکبر |
| مترجم | : | جلیس اختر نصیری |
| صفحات | : | 368 |
| اشاعت | : | 2025 |
| تعداد | : | 500 |
| قیمت | : | 500 روپے |
| ناشر | : | خسرو فاؤنڈیشن، ڈی 319، ڈیفنس کالونی، نئی دہلی |

***Printed by***

Creative Star Publications

Okhla, New Delhi

Email: creativestar1122@gmail.com

Call: 8851148278, 9958380431

# فہرست


| | |
|---|---|
| عرض ناشر | 07 |
| ہدیۂ تشکر | 09 |
| پیش لفظ | 15 |
| تعارف | 19 |
| 1 جہاد: قرآن وحدیث کی روشنی میں | 29 |
| 2 موت کے بدلے جنت: اللہ سے ایک سودا | 47 |
| 3 رات کی تاریکی میں بغاوت کی لہر | 69 |
| 4 عالم اسلام کا جغرافیہ | 91 |
| 5 گردابِ جہنم | 109 |
| 6 اللہ کے نام پر صلاح الدین کی جنگی تحریک | 131 |
| 7 یورپ کی سرحد پر اسلام کی دستک | 153 |
| 8 برصغیر میں جہاد: دہلی پر اسلامی ہلال | 173 |
| 9 بحر مقدس: کالی مرچ اور طاقت کی سیاست | 193 |
| 10 معاہدے کا تلخ انجام | 221 |
| 11 اقتدار کی دہلیز پر تفریق کی آہٹ | 241 |

| | |
|---|---|
| 12 تاریخ کا قہر، جہاد کا سکوت | 265 |
| 13 اسلام خطرے میں | 291 |
| 14 دورِ اسامہ میں احیاء جناح | 309 |
| فرہنگ اصطلاحات | 347 |
| مطالعے کے لیے تجویز کردہ کتابوں کی فہرست | 353 |
| کتابیات | 355 |
| خسرو فاؤنڈیشن-ایک نئی پہل | 366 |

# عرض ناشر

خسرو فاؤنڈیشن ایک ایسی کتاب کو اردو زبان میں پیش کر رہی ہے جو تاریخ، سیاست، مذہب اور طاقت کے باہم ٹکراؤ کو فکری انداز میں بیان کرتی ہے۔ فاضل مصنف جناب ایم جے اکبر کی تصنیف

Jihad and conflict between Islam and Christianity - The Shade of Swords

اسلام اور عیسائیت کے مابین جہاد اور تصادم کی داستان–تلواروں کے سائے میں )محض ایک کتاب نہیں بلکہ ایک سنجیدہ اور فکری مطالعہ ہے جو خلافت راشدہ سے لے کر عصر حاضر کی دہشت گردی تک اسلام اور مغرب کے درمیان جاری کشمکش کے مختلف پہلوؤں کو اجاگر کرتی ہے۔

ایم جے اکبر صاحب کا شمار برصغیر کے ان ممتاز مصنّفین، صحافیوں اور دانشوروں میں ہوتا ہے جو نہ صرف قومی و بین الاقوامی سیاست پر گہری نظر رکھتے ہیں بلکہ اپنی تحریروں کے ذریعے قارئین کو فکری بلندی اور مسائل کو تاریخی تناظر میں دیکھنے کا شعور عطا کرتے ہیں۔ وہ نصف صدی پر محیط صحافتی تجربے کے حامل اور کئی موقر روزناموں کے بانی و مدیر رہ چکے ہیں، جن میں دی ایشین ایج، سنڈے گارڈین اور ٹیلی گراف، خاص طور پر قابل ذکر ہیں۔ ان کی تحریریں نہ صرف ادبی معیار کی حامل ہیں بلکہ سیاسی شعور، تاریخی حوالوں اور فکری تجزیے سے بھرپور ہوتی ہیں۔ زیر نظر کتاب بھی فاضل مصنف کی اسی فکری بصیرت کا شاہکار ہے جس میں مصنف نے تاریخ اسلام، صلیبی جنگوں، خلافت و ملوکیت، استشراق، استعمار، اور دہشت گردی جیسے نازک موضوعات کو بے حد سنجیدگی، غیر جانب

داری اور تحقیقی معیار کے ساتھ پیش کیا ہے۔

'تلواروں کے سائے میں' ایک ایسی تحریر ہے جو ماضی کے اوراق سے لے کر حال کے حقائق کو واضح کرتی ہے۔اس میں سیرۃ ابن ہشام سے لے کر جدید سیاسی اور فکری مکالمات تک کے حوالہ جات موجود ہیں جو کتاب کو نہ صرف مستند بناتے ہیں بلکہ فکری اعتبار سے بھی گراں قدر بنا دیتے ہیں۔

اس اہم کتاب کے ترجمے کے فرائض عربی کے اسکالر وصحافی اور اردو، عربی اور انگریزی کے تجربہ کار مترجم ڈاکٹر جلیس اختر نصیری صاحب نے انجام دیے ہیں۔ڈاکٹر نصیری نے اس کتاب کے اصل موضوع، معنوی تہوں اور فکری نکات کو نہایت ایمانداری اور فنی مہارت کے ساتھ اردو قالب میں ڈھالا ہے۔

خسرو فاؤنڈیشن کی سابقہ علمی کاوشوں کی طرح یہ کتاب بھی ہماری اس فکری روایت کا تسلسل ہے جس کا مقصد اردو اور دیگر زبانوں، بالخصوص مسلم معاشرے میں مطالعہ کا ذوق رکھنے والے افراد کو ایسی کتب فراہم کرنا ہے جو ان کے اذہان کو وسعت دیں اور انہیں عالمی فکری دھاروں سے ہم آہنگ کریں۔ہمیں امید ہے کہ یہ کتاب اس مشن کا ایک روشن باب ثابت ہوگی جو علمی مکالمے، بین المذاہب تفہیم اور معاصر عالمی مسائل کے ادراک کو فروغ دینے میں بنیادی کردار ادا کرے گی۔

خسرو فاؤنڈیشن کتاب کے مصنف جناب ایم جے اکبر صاحب کی ممنون ہے کہ انہوں نے ایک ایسا علمی سرمایہ پیش کیا جسے اردو قارئین تک پہنچانے کا شرف ہمیں حاصل ہوا۔اور ساتھ ہی ساتھ کتاب کے مترجم ڈاکٹر جلیس اختر نصیری صاحب کے بھی شکر گزار ہیں جنہوں نے اس عظیم علمی خدمت کو نہایت خوش اسلوبی اور دیانت داری کے ساتھ انجام دیا۔

ہمیں یقین ہے کہ یہ کتاب اردو دنیا کے سرمایے میں ایک گراں قدر اضافہ ثابت ہوگی۔

**ڈاکٹر حفیظ الرحمٰن**

کنوینر، خسرو فاؤنڈیشن

# ہدیہ تشکر

تخلیق کار عام طور پر اس حقیقت کو تسلیم کرنا پسند نہیں کرتے کہ ان کی تخلیقات تصور اور مغالطہ دونوں کے زیر اثر وجود میں آتی ہیں۔ صرف وقت ہی ان دونوں کے درمیان امتیاز کی نشان دہی کرتا ہے۔ چونکہ یہ کتاب بہت ہی سخت اور دشوار گذار تخلیقی سفر کا ثمرہ ہے، اس لیے میں ان تمام لوگوں کا بہت ہی ممنون ہوں جن لوگوں نے میرے ساتھ تعاون کیا ہے۔ یقینی طور پر تعاون کرنے والوں کی فہرست بہت طویل ہے، لیکن کچھ شخصیات ایسی ہیں جن سے صرف نظر نہیں کیا جا سکتا۔

اسلامی دنیا کے بدلتے ہوئے مزاج پر میں نے اپنا پہلا مضمون اس وقت لکھا جب 1980 کی دہائی میں اپنے سفر کے دوران سوویت یونین کے ملبے سے اس کے زیر تسلط وسطی ایشیا کی قدیم مسلم ریاستوں میں اسلام کی اٹھتی ہوئی بلند و بالا لہریں دیکھیں۔ کمیونزم کی پسپائی سے پیدا ہونے والے خلا کو ایمان و عقیدہ نے بڑی تیزی سے پر کر دیا تھا۔

اس خطے کا میرا پہلا سفر ٹھیک اسی سال ہوا جس سال مارگریٹ تھیچر نے ماسکو کے ایک گرجا گھر میں میخائل گورباچوف کی آوردہ سحر نو کا استقبال ایک قندیل جلا کر کیا تھا۔ یہ ایک ناقابل فراموش منظر تھا۔ دوشنبے کے دورے کے دوران میں نے اپنے رہنما سے اصرار کیا کہ آنے والے جمعہ کو میں کسی مسجد میں نماز ادا کرنا چاہتا ہوں، کیونکہ مجھے اطلاع دی گئی تھی کہ کامریڈ میخائل نے مذہب کو مارکسی زنجیروں سے آزاد کر دیا ہے۔ اس بات کا علم صرف اللہ ہی کو ہے کہ میرے راہنما اور ماسکو میں اس کے اعلیٰ

افسران کے درمیان کتنے ٹیلیکس پیغامات کا تبادلہ ہوا تھا۔ (ٹیلیکس-آپ اپنے حافظے پر زور دیں۔ یہ کتاب اسی دور میں شروع ہوئی تھی جب ای میل کا رواج نہیں تھا۔اب یہی مناسب وقت ہے کہ ای میل کی برکتوں کا اعتراف کرلیا جائے کیوں کہ اگر ای میل کی سہولت نہ ہوتی تو یہ کتاب بروقت مکمل نہ ہو پاتی۔اس لیے بل گیٹس صاحب، یا (جو بھی اس کے پس پشت ہوں ان کا شکریہ)۔

جب جمعہ کا دن آیا تو وہ لوگ مجھے دو گھنٹے تک نہایت دلکش مناظر سے گزارتے ہوئے ایک ایسی مسجد میں لے گئے جو ایک صوفی بزرگ کے مزار سے متصل تھی۔شاید انہیں اس سے زیادہ قریب کوئی اور مسجد نہیں مل سکی تھی۔ حیرت زدہ ملاؤں نے میرا استقبال بہت ہی خاموشی اور مشکوک نگاہوں سے کیا۔ وہ اس خیال سے خوف زدہ تھے کہ ایک مارکسی ماسکو سے ایک مومن کو ان کی دہلیز تک کس لیے لایا ہے؟ انہوں نے میرے لیے دسترخوان بچھایا جس پر انتہائی لذیذ خربوزے، انار اور خشک میوے سجا دیے... شاید اس امید پر کہ میں یہ سب کھاؤں، پیوں اور چلتا بنوں۔ باہمی گفتگو نہایت دشوار تھی۔ان کی انگریزی کی معلومات اتنی ہی تھی جتنی مجھے ازبک زبان کی تھی... یعنی نہ کے برابر۔ جب باہمی بات چیت کی کوئی سبیل نہ نکل سکی، تو میں نے ایک بالکل ہی سادہ سا سوال کیا: ''اس مسجد کا نام کیا ہے؟'' جواب ملا: ''لینن مسجد۔'' میں نے اپنے کندھے اچکا دیے، اس خیال سے کہ شاید میرا سوال زبان کی بھول بھلیوں میں گم ہو گیا۔ میں نے دوبارہ اپنا سوال دہرایا۔لیکن جواب وہی تھا: ''لینن مسجد۔'' یہ سنتے ہی میرے دماغ میں ایک برقی لہر کوندی اور سوچنے لگا، بروز محشر اللہ تعالیٰ یقیناً میری تلون مزاجی اور گناہوں کی پردہ پوشی فرمائے گا۔ اللہ بہت ہی رحیم و کریم ہے، اور ہم جیسے گنہ گار مسلمان اسی امید کے سہارے جیتے ہیں کہ وہ اپنی رحمت سے کبھی بھی مایوس نہیں کرے گا۔ میں صوم وصلاۃ کا پابند نہیں ہوں، نیز اور بھی بہت سے واجبات کا تارک رہا ہوں۔لیکن اس موقعہ پر میرے دل کی گہرائیوں سے یہ آواز آئی کہ اللہ تعالیٰ بے شک غفور ورحیم ہے، وہ تمام گناہوں سے درگزر کر سکتا ہے، لیکن اگر اس مسجد میں جسے لینن کی مسجد کہا جاتا ہے اس کے حضور سجدہ ریز نہ ہوا تو شاید اس گناہ کے لیے وہ مجھے کبھی معاف نہ کرے گا۔ چنانچہ میں ان نصف درجن نمازیوں کی صف میں شامل ہو گیا جو امام کی اقتدا میں نماز جمعہ پڑھ رہے تھے۔

1992 میں وسطی ایشیا کے گذشتہ سفر کے دوران میں نے دیکھا کہ تاشقند، سمرقند اور بخارا جیسے قدیم مسلم شہروں میں مساجد اور مدارس کی عظمت رفتہ واپس لوٹ آئی تھی۔ گویا اسلام نے اپنے ان بلند وبالا میناروں کے ذریعہ اپنی ڈیڑھ سو سال کی شکست، غلامی اور تحقیر کا طوق اتار کے اپنے احیائے نو کا اعلان کر دیا تھا۔

اسلامی دنیا... بشمول گم گشتہ جنت ارضی اسپین اور پرتگال، فلک بوس پہاڑوں، ناقابل عبور صحراؤں، نیل کے مرغ زاروں اور پھر جنوب میں افریقہ کے قلب سے گزرتی ہوئی بحر احمر کو عبور کر کے سامی اقوام کی رزم گاہ میں داخل ہو کر عرب کی مقدس سرزمین، اور پھر وہاں سے یروشلم پہنچ جاتی ہے... وہ شہر جس کی تولیت کا دنیا کے تینوں عظیم مذاہب دعویٰ کرتے ہیں، اور ہر ایک کے پاس اس پر قبضہ کے لیے جنگ کرنے کا کافی جواز بھی موجود ہے۔ عراق، ترکی، ایران اور جنوب ایشیا کی قدیم تہذیبیں ایک محرابی شکل بناتی ہیں، جبکہ البانیا سے قفقاز اور وہاں سے گزرتی ہوئی وسطی ایشیا تک کی لکیریں اسلام کی شمالی سرحدوں کو تشکیل دیتی ہیں۔ ہندوستان کی خوشگوار گرم آب وہوا جنوب مشرقی ایشیا کی گھٹن بھری تپش کے لیے اپنا دروازہ وا کرتی ہے۔ مختلف براعظموں اور ملکوں میں پھیلی ہوئی سیکڑوں نسلیں، جن کی ثقافت، تہذیب وتمدن بے شک مختلف ہیں، مگر باہم ایک ایسے عقیدہ میں مربوط ہیں جو موجودہ دور کی مذہبی حد بندیوں اور امتیاز سے بالاتر ہیں۔

اسلام ایک عالم گیر مذہب ہے... اور بسا اوقات اس کی یہی خصوصیت دنیا کو حیران وششدر کر دیتی ہے۔ بنیادی مسائل پر یکساں موقف... چاہے وہ باکو کی مسجد ہو یا بالی کی... اس دنیا کو حیران کر دیتی ہیں جو ہر بات کو قومی شناختوں کے خانوں میں تقسیم دیکھنے کی عادی بن چکی ہے۔ یہ کتاب بھی انہی سرزمینوں سے متعلق ایک طویل سفرنامہ بن گئی ہے۔ بلکہ یوں کہنا زیادہ بہتر ہوگا کہ سفر کا آغاز کتاب سے پہلے ہوا، اور پھر کتاب نے مزید سفر کا تقاضا کیا۔ سالہا سال کی تحقیق وجستجو کی کڑیوں کو جوڑنے کا کام دوستوں نے انجام دیا ہے۔ ان میں سے صرف چند کا ذکر کرنے کے لیے میں معذرت خواہ ہوں، کیوں کہ سب کا ذکر ممکن نہیں۔ آغاز کہاں سے کروں؟ شاید درمیان سے... جب مشاہدہ اور مطالعہ ایک خیال بن گیا اور پھر وہ خیال اپنی مخصوص راہ پر گامزن ہو گیا۔ اس سفر کے

دوران مجھے بہت سے دانشور دوستوں اور صاحب فکر ساتھیوں کی مدد ملی، جن میں سب سے پیش پیش پیٹرک رائٹ رہے جنھوں نے میری فکر ونظر کو ایک مربوط زاویہ عطا کرنے میں کلیدی کردار ادا کیا۔ شاید کسی دن میں ان کا یہ قرض چکانے کا کوئی طریقہ ڈھونڈ نکالوں ... لیکن فی الحال تو ایسا کرنا ممکن نظر نہیں آرہا ہے۔

میں ایک لفظ ''میزبان'' کا استعمال کافی سوچ سمجھ کر کر رہا ہوں کہ ایک میزبان کی حیثیت سے کئی ہندوستانی سفیروں نے ان ممالک میں، جہاں نہ کوئی شناسا تھا، نہ زبان تھی اور نہ ہی کوئی رہنمائی تھی، غیر معمولی فیاضی کا مظاہرہ کیا۔ ایسے ہی ایک سفیر حامد انصاری تھے۔ بہت ہی خوش لباس، بے داغ اور انتہائی فیاض، انہوں نے ایران میں میرے پندرہ روزہ قیام کے دوران بھرپور میزبانی کی۔ میں نے وہاں قم کے مدرسے میں یادگار مباحثے کیے اور بہت سے تعلیمی ماہرین اور دانشوروں سے ملاقات کی، جو ابھرتے ہوئے مسلم ذہن کے فکر ونظر اور عمل دونوں سے شناسا تھے۔

مشرق وسطیٰ سے لے کر اسپین تک محیط اس عظیم کرہ ارض کا میں نے کم از کم درجن بھر بار دورہ کیا۔ یہاں تاریخ آج بھی زندہ وجاوید ہے، موت سے ہم کنار نہیں ہوئی ہے۔ ان کے بارے میں شاید یوں کہنا زیادہ موزوں ہوگا کہ وہاں کے فوت شدہ لوگ تاریخ کی نظروں سے اوجھل نہیں ہوئے ہیں۔ اپنے آخری دورے کے دوران میں نے مکہ مکرمہ میں عمرہ جسے چھوٹا حج بھی کہا جاتا ہے، کرنے کی سعادت بھی حاصل کی۔ سعودی عرب میں میرے دیرینہ دوست تلمیذ احمد سفیر تھے۔ انہوں نے میری بے لوث مدد کی اور ہر طرح کا تعاون کیا۔ اسپین میں دلیپ اور شوانا لہری نے ہمیشہ کی طرح میرے لئے اپنے دل کے دروازے کھول دیے۔ ہردیپ پوری ایک بہت ہی فعال اور متحرک سفارت کار ہیں۔ انہیں ایک چلتا پھرتا ڈپلومیٹ کہنا شاید تضاد بیانی نہ ہو؟ بہرکیف، انہوں نے ہر جگہ میری مدد کی، بسا اوقات بہت ہی پراسرار اور انوکھے انداز میں مدد کی، جو ان کی دیرینہ عادت ہے۔ پاکستان کا میرا دورہ 70ء کی دہائی کے اواخر میں شروع ہوا۔ منجو اور ایس کے سنگھ نے ایک بھارتی مہمان کے لیے اسلام آباد کو ایک دوست شہر بنا دیا۔ مجھے یہ بات کہنے دیں کہ اگر بھارت اور پاکستان کی حکومتیں ایک دوسرے سے وہی برتاؤ کرتیں جو دونوں ممالک کے عوام ایک دوسرے

سے ملتے ہوئے کرتے ہیں، تو اس خطے میں آنسو نہ بہتے، بلکہ قہقہے بلند ہوتے۔ میں یہ نہیں کہہ سکتا کہ پاکستان میں میرے لیے حمید ہارون کی دوستی کتنی قیمتی رہی ہے اور اب بھی ہے۔ ہم دونوں نے مل کر اس کے وطن پاکستان کو گاؤں گاؤں، قصبہ قصبہ، شہر شہر دیکھا اور پھر کتابوں اور باہمی مباحثات کے ذریعہ دریافت کیا۔

ان ہندوستانی دوستوں کی فہرست جنہوں نے میرے لیے اپنے خلوص اور اس سے بھی زیادہ اپنی وسعت قلبی کا مظاہرہ کیا، کبھی بھی پوری طرح ضبط تحریر میں نہیں لایا جا سکتا۔ فاطمہ اور رفیق زکریا کو اپنا استاذ کہنا زیادہ موزوں ہوگا۔ فاطمہ ہی کی بدولت مجھے 1971 میں نامور ادیب خوشونت سنگھ کی زیر ادارت شائع ہونے والے ''السٹریٹڈ ویکلی آف انڈیا'' میں پہلی ملازمت ملی تھی، اب تو ایسا لگتا ہے جیسے ان دونوں نے مجھے گود لے لیا ہو۔ یہ ایک بہت ہی خوش گوار احساس ہے۔

مختلف اسباب کی بنا پر گزشتہ دہائی میرے لیے بہت پریشان کن رہی، مگر اگر کوئی ایک دوست جو اس مشکل گھڑی میں مستقل طور پر میرے ساتھ کھڑا رہا تو وہ ٹی وینکٹ رام ریڈی ہیں۔ میں رام سے میڈیا کے اس موج تلاطم میں ملا جہاں رشتے ناطے بڑی آسانی سے شخصی مفاد کی بھینٹ چڑھ جاتے ہیں۔ مجھے خوش قسمتی سے ان کا پیار اور پرخلوص دوستی ملی جو آج تک قائم ہے۔ اس سے بھی بڑھ کر، ہم نے 1994 میں مل کر روزنامہ ''ایشین ایج'' کو لانچ کیا تھا، اس میں آج بھی ہم ایک دوسرے کے ساتھ ہیں۔ رام اس ادارے کے چیئرمین ہیں۔

اور اب اخیر میں میں ایشیا کے سب سے زیادہ فراخ دل گروپ کا تذکرہ کروں گا۔ ہمارا وہ گروپ جو ''ایشین ایج'' کے ساتھ وابستہ رہا ہے، خاص طور سے سیما مصطفیٰ، کوشک مِتر، سنیل سنہا، روپا سرکار، ٹکلی باسو، سرجو کول، ادیتی کھنہ، وینکٹیش کیسری، نذرین بھورا اور رچنا گروور۔ آپ سب لوگوں کا بہت بہت شکریہ، جنہوں نے اس کتاب کی تیاری کے دوران میری گوشہ نشینی کو خندہ پیشانی سے برداشت کیا۔ خاص طور سے رتھیکا سدھارتھ کا شکریہ جنہوں نے آخری مرحلے کے اعصاب شکن وقت میں میری بھرپور مدد کی۔

جب یہ مسودہ کتاب بننے کے مرحلے میں داخل ہوا، تو میری خوش نصیبی رہی کہ مجھے اپنے دوست پرمود کپور اور ان کی اہلیہ کرن کا ساتھ ملا، جو رولی بکس کو بہت نفاست سے چلاتے ہیں۔ انہی کے ذریعے میری ملاقات کرسٹوف چیشیر سے ہوئی، جو راؤٹ لیج میں تھے۔ کرسٹوف نے کتاب کے ہر پہلو پر قیمتی رہنمائی کی۔ خوشی کی بات یہ ہے کہ اس کتاب کی بدولت اب ہم ایک دوسرے کے دوست بن گئے ہیں۔ ویسے، اگر آپ اتفاق سے کسی کے زیر اثر رہنا چاہتے ہیں تو میں اس کے لیے ہریندر باویجا کا نام لوں گا، جو رولی میں غیر معمولی پیشہ ورانہ صلاحیت کے ساتھ نہایت دلکش مسکراہٹ بکھیرتی رہتی ہیں۔ پیشہ ورانہ صلاحیت اور خندہ پیشانی کا یہ امتزاج ایک خوب صورت تباہی کی دعوت دیتا ہے۔ بے چارے مصنفین سراپا نیاز بن کر سر تسلیم خم کر دیتے ہیں، آپ سب کا شکریہ۔

دوستوں اور خاندان کی محبت سے بڑھ کر کوئی اور سہارا نہیں ہوتا۔ جب دوست ایسے ہوں جیسے سنیل اور گیتا گجرال، پرابین، ارونا اور انیل لال، اور خاندان میں میری بہن غزالہ اور بہنوئی لوکیش شرما، اور شمع و مدھو جون، تو دوست اور رشتہ دار کا فرق ختم ہو جاتا ہے۔

میرے بچے، ملولیکا اور پریاگ نے گھر چھوڑنے کے بعد خاصی ترقی کی ہے۔ شاید اس میں کسی سبب و اثر کی کارفرمائی ہو! اب وہ اپنی نئی زندگی کی شروعات کرنے جا رہے ہیں، لیکن ان کا پیار، لگاؤ اور خیالات میرے لیے بے پناہ خوشی کا باعث ہیں۔

اپنی فیملی کی خوشیاں بٹورنا بہت بڑی خوش نصیبی ہے۔ زندگی اس شخصیت کے بغیر بے معنی ہوتی جو اس خاندان کے سکون کا مرکز ہے، یعنی میری شریکِ حیات ملیکا، ایک پرسکون مرکز جس کے گرد ہم سب گردش کرتے ہیں، اور جس کا وجود ہماری زندگی کا سب سے قیمتی جز ہے۔ ان کی محبت کے لیے میرا پہلا اور آخری ہدیہ تشکر۔

# پیش لفظ

2001 کے ہنگامہ خیز اختتام پر، ہفت روزہ دی اکنامسٹ نے اپنے روایتی سالانہ ''جائزہ شمارہ'' (View and Review) میں ایک کارٹون شائع کیا، جس میں ایک شکست خوردہ بوڑھا 'فادر ٹائم' دنیا کو ایک اُداس اور بے زبان 'چائلڈ ٹائم' کے سپرد کر رہا ہے۔ دنیا کے دو خطے آگ کی لپیٹ میں جلتے ہوئے دکھائے گئے: مشرق وسطیٰ اور جنوبی ایشیا۔ دوسری آگ کا مرکز وہ علاقہ تھا جو افغانستان، پاکستان، اور بھارت کے زیر انتظام کشمیر پر مشتمل ہے۔

اسرائیل اور اس کے عرب ہمسایوں کے مابین جنگیں برسوں سے کتابوں، صحافت اور افسانوی ادب کا موضوع رہی ہیں، مگر جنوبی ایشیا کی کشیدگی نہ اتنی جانی جاتی ہے اور نہ ہی پوری طرح سمجھی گئی ہے۔ لیکن پاکستان اور افغانستان وہ دو خطے ہیں جہاں امریکہ اور یورپ کی افواج ایک ایسے جہاد کے خلاف صف آرا ہوئیں، جس کا اصل ہدف مغربی عیسائی دنیا... خاص طور پر امریکہ ہے۔ یہ کوئی اتفاقی حادثہ نہیں بلکہ ایک طویل عمل کا منطقی نتیجہ ہے۔ امریکی افواج یہاں توقع سے کہیں زیادہ لمبی مدت تک موجود رہیں۔ کابل ہمیشہ سے بغیر کسی مزاحمت کے فتح ہوتا آیا ہے جیسا کہ 1838، 1879، 1978 اور 2001 میں ہوا، کابل میں داخل ہونا شروع ہی سے آسان رہا ہے مگر اس سے نکلنا ایک ٹیڑھی کھیر ثابت ہوا ہے۔

اس نظریہ کے بانی لیفٹیننٹ جنرل حمید گل کے الفاظ میں پاکستان کس طرح ''موجودہ دور کی پہلی بین

الاقوامی اسلامی بریگیڈ'' کا گہوارہ بن گیا؟ کس طرح اس ملک پر کلاشنکوف اور جہادی کلچر کی گرفت مضبوط ہوئی... اس گن کلچر کو ختم کرنے کے لیے اس اصطلاح کا استعمال صدر پرویز مشرف نے اپنے قومی نشریہ میں کیا؟ اس کلچر میں اسامہ بن لادن کو جائے پناہ اور موقع کیسے دستیاب ہوا؟ ان سوالوں کے جوابات غصہ اور تناؤ میں پوشیدہ ہیں کیونکہ یہ لڑائی ذہنی اپج اور مادی ذرائع دونوں سے لڑی جاتی ہے۔

عام طور پر ہم جنگ کو ملکوں، مفادات، اور فوجوں کے ٹکراؤ کی شکل میں دیکھتے ہیں۔لیکن یہ جہاد تو کسی اور کے لیے لڑا جا رہا ہے، بے حد پیچیدہ حکمت عملی اور بے قاعدہ فوج کے ذریعہ۔امریکہ کی مبینہ عالمی بالادستی کے خلاف اسلامی دنیا کے اس ردِعمل کی نوعیت کو سمجھنا بذات خود ایک انتہائی پیچیدہ امر ہے۔ گوکہ اسلامی دنیا میں اس کے اور بھی عوامل ہو سکتے ہیں، مگر جہاد کی یہ صلاحیت مسلم ہے کہ وہ تاریخ کے دھارے کو بدل سکتا ہے، جس کا مظاہرہ 11 ستمبر 2001 کو ہو گیا تھا۔اس کتاب میں اس جنگ اور میدان جنگ کی نوعیت اور اس کی ابتدا کو سمجھنے کی ایک سنجیدہ کوشش کی گئی ہے۔ایک ایسی جنگ جس نے امریکی و یورپی افواج کو جنوبی ایشیا میں لا اتارا اور جس نے اسلامی تاریخ اور اس خطے کی تاریخ کو ایک نئی جہت دے دی۔

کتاب کے ابتدائی آٹھ ابواب اسلام اور عیسائیت کے درمیان تصادم کی فکری اور تاریخی جڑوں کی وضاحت کرتے ہیں... (دو مذہب جو بظاہر مختلف ہونے کے باوجود ایک دوسرے سے جُڑے ہوئے ہیں)۔اس تصادم کا آغاز تقریباً نبی اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی حیاتِ مبارکہ ہی میں ہو چکا تھا، جس کا مقصد اس وقت کی معروف دنیا پر سیاسی غلبہ حاصل کرنا تھا۔ بعد میں اس تصادم کا زہر ادب اور خطابت میں بھی سرایت کر گیا، جس کا نتیجہ جنگ سے کہیں زیادہ بھیانک اور مہلک ثابت ہوا۔

1453 میں مسلمانوں کے ذریعہ عیسائی دنیا کے سب سے بڑے مرکز قسطنطنیہ کی تسخیر کے صرف دو سال بعد پاپائے روم نے کیتھولک پرتگال کو مشرق کی طرف پیش قدمی کرنے اور مقدس صلیبی جنگ شروع کرنے کی اجازت دے دی۔اس مہم کا مقصد ہندوستان کی دولت بٹورنا اور عثمانی ترکوں کے خلاف اتحادی تلاش کرنا تھا، جنہوں نے اسلامی قوت کی از سرِ نو شیرازہ بندی کی تھی۔لیکن پرتگال کو

جلد ہی اندازہ ہو گیا کہ مسلمانوں میں، جو بارہویں صدی سے جنوبی ایشیا کے کئی علاقوں پر حکومت کر رہے تھے، ابھی تک دم خم باقی ہے۔ گوا میں پرتگال کے قدم ابھی اچھی طرح جمے بھی نہیں تھے کہ ایک اور ترک منگول خاندان نے ہندوستان میں ایک عظیم سلطنت مغلیہ سلطنت کی بنیاد رکھ دی...

پھر یہ بات کیتھولک مخالف برطانیہ پر چھوڑ دی گئی کہ وہ دھیرے دھیرے مغل سلطنت کو بے دخل کرے اور خود اس کی جگہ لے لے۔ گو کہ برطانیہ نے اس کے لیے صلیبی جنگ کے بجائے تجارتی مقصد قرار دیا، مگر مسلم ردِعمل کی تحریک میں خواہ وہ خطابی ہو یا عسکری جہاد کا تصور ہمیشہ کارفرما رہا۔

پھر بعد کے ابواب اپنے قاری کو مشرقی دنیا کے گوں ناگوں اور متنوع تصادمات کی طرف لے جاتے ہیں... قفقاز سے ہوتا ہوا افغانستان تک، اور پھر ہندوستان میں وہ سیاسی محاذ آرائی جس کی کوکھ سے ایک ایسے ملک نے جنم لیا جس کا تصور بھی شاید ہی کسی نے کیا ہو: مسلمانوں کا ایک جدید وطن پاکستان۔ اس جدید وطن کی بنیاد ایک اعتدال پسند اور آزاد ذہن شخصیت نے رکھی تھی، لیکن جلد ہی یہ ملک اپنے بانی کے تصوراتی ڈھانچے سے پھسل کر ایسے بنیاد پرستوں کے ہاتھوں میں چلا گیا جو نہ صرف اپنی ہی جنت ارضی کے لیے خطرہ بن گئے بلکہ ان لوگوں اور ملکوں کے لیے بھی جن پر وہ اپنا تسلط جمانا چاہتے ہیں۔

یہ ایک وسیع اور شاخ در شاخ محور ہے جو زمانے، یادداشت، عقیدہ، فتح، شکست، تاریخ اور جغرافیہ کے ساتھ گردش کر رہا ہے۔ The Shade of Swords اس لکیر کی نشان دہی کرتی ہے جو صحرائے عرب سے گزرتی ہوئی دہشت گردی کے خلاف فیصلہ کن خونی جنگ کے میدان... پاکستان اور افغانستان... تک آ پہنچی ہے۔

# تعارف

'تلواروں کے سائے میں' قتل کرنے کی ترغیب نہیں بلکہ اپنی جان قربان کرنے کی دعوت دیتی ہے۔ جب مسلمان اپنے پیغمبر حضرت محمد ﷺ کا نام لیتے ہیں، تو ہمیشہ اس کے ساتھ ایک دعا بھی بڑھاتے ہیں: ''اے اللہ ان پر سلامتی نازل فرما۔''

اسلام کا بنیادی مقصد ''امن'' ہے اور خود لفظ ''اسلام'' کے معنی اطاعت وسپردگی کے ہیں۔ ''السلام''، یعنی ''امن وسلامتی'' اللہ تعالیٰ کے اسمائے حسنیٰ میں سے ایک ہے۔ تاہم، اسلام وقتاً فوقتاً مخصوص حالات میں اپنے دین ومذہب کے دفاع کے لیےلڑی جانے والی مقدس جنگ میں جان ومال کی قربانی مانگتا ہےاوراسی کا نام ''جہاد'' ہے۔

ایمان کے اقرار کو ''شہادت'' کہتے ہیں جس کا اظہار لا الٰہ الا اللہ محمد رسول اللہ (اللہ کے سوا کوئی معبود نہیں اور محمد اللہ کے رسول ہیں) کے اعلان کے ذریعہ ہوتا ہے۔ جو اللہ کی راہ میں اپنی جان قربان کر دیتے ہیں وہ ''شہید'' کہلاتے ہیں۔ شہید مسکراتے ہوئے موت کو گلے لگاتا ہے، اور یہی موت اس کے لیے جنت کے دروازے کھول دیتی ہے۔ مومن صرف اللہ کے سامنے سر جھکاتا ہے۔ وہ کبھی کبھی مغلوب ہو جاتا ہے، لیکن شکست اس کے جذبے کو سرد نہیں کرتی۔ 'شکست اس کے لیے ایک وقفہ ہے، ازسرنو تیار ہونے کا'۔ اہل ایمان شکست سے شکست خوردہ نہیں ہوتے، بلکہ انتظار کرتے ہیں، اللہ پر ایمان اور بھروسہ کے ساتھ، اور جہاد جاری رکھتے ہیں، یہاں تک کہ وہ فتح حاصل کر

لیں... وہ فتح، جس کا وعدہ اللہ نے قرآن میں مومنین کے ساتھ ان کی جان و مال کے بدلے میں کیا ہے۔ اسلام نے انسانی دنیا میں جنگ کی حقیقت کو تسلیم کیا ہے، اور اس حوالے سے اخلاقی اور سیاسی رہنما اصول بھی طے کیے ہیں۔ تاہم، یہ ضروری نہیں ہے کہ ان کی تعبیر ہمیشہ صحیح ہو ان کی غلط تعبیر بھی نکالی جا سکتی ہے۔ اس کتاب میں مستند نصوص اور تاریخ کے حوالہ سے اس فرق کی تہہ تک پہنچنے کی کوشش کی گئی ہے۔ موجودہ دور میں اپنے مفروضہ سیاسی تقاضوں کے مطابق نصوص و واقعات کی تعبیر نو کی خواہش ایک فریب ہے، جس سے بچنا ضروری ہے۔ مثال کے طور پر آج بہت سے مسلمان ''مقدس جنگ'' کو محض ایک مقدس غسل سمجھتے ہیں جس کا مقصد صرف تزکیہ باطن ہے، اس سے زیادہ اور کچھ نہیں۔

یقیناً یہ بات درست ہے کہ رسول اکرم ﷺ نے اس جہاد اکبر (بڑے جہاد) پر زور دیا جو انسان کی اندرونی صفائی کرتا ہے لیکن اس حقیقت سے بھی انکار نہیں کیا جا سکتا کہ جہاد اصغر (چھوٹے جہاد) نے مسلمانوں میں ایسا شوق جہاد پیدا کر دیا تھا جس کی بدولت ایک زمانے میں اسلامی فوجیں سب سے بڑی فاتح فوج بن گئیں۔ مسلمانوں کو اپنے مقدس مقامات کی حفاظت کے قابل بنا دیا، اسلامی دنیا کی بیشتر آبادی کو اسلامی اقتدار کے زیر سایہ رکھا، باوجود اس کے کہ زبردست مسیحی اتحاد ایک عالمی جنگ کی صورت میں ان کے مقابل تھا، جس کی ابتدا، درحقیقت آغاز اسلام ہی سے ہو چکی تھی۔

نامساعد حالات کے باوجود مسلم فوجوں نے خواہ وہ مشرق ہو یا مغرب بار ہا فتح حاصل کی، ایسا معلوم ہوتا تھا کہ کوئی خود کار معجزہ رونما ہو رہا ہو۔ ہر فتح کے بعد اللہ کے ساتھ کیے گئے جنت کے سودے نے ان کے ایمان کو اور پختہ کیا، خاص طور پر مسیحی افواج کے خلاف ان کی فتح، جنہوں نے بارہا نہ صرف مسلم سلطنتوں کو ختم کرنے کی کوشش کی بلکہ خود اسلام کو بھی... جسے وہ حضرت مسیح کے خلاف ایک کفر سمجھتے تھے...

جہاد اسلامی تاریخ کی ایک ہمیشہ گونجنے والی صدا ہے۔ اگر آج کے مسلم حکمرانوں کو اس صدا کی بازگشت سنائی نہیں دیتی، تو اس کی ایک بڑی وجہ یہ ہے کہ وہ ناکامی کے ممکنہ نتائج سے خائف ہیں۔ ہر سودے میں دو پہلو ہوتے ہیں۔ اللہ نے مومنوں سے فتح کا وعدہ کیا ہے، مگر اس شرط پر کہ وہ اللہ پر

پورا بھروسہ رکھیں۔ عام طور سے مسلمان شکست کا ٹھیکرا حکمرانوں کے سر پر پھوڑتے ہیں، یہ شکست ان کے لیے بڑی خطرناک بن جاتی ہے۔ مسلمانوں کی طویل تاریخ میں ایسا ہی ہوتا آیا ہے۔ جیسے کہ انہیں اس کا حکم دیا گیا ہے۔

آج کے بیشتر مسلم ممالک کی حکومتیں غیر نمائندہ، غیر جمہوری اور امت کی ضروریات و مطالبات سے صرف نظر کرنے والی ہیں۔ روایتی اسلامی نظام حکومت ختم ہو چکا ہے اور اس کی جگہ ایسے غیر جمہوری اشرافیہ نے لے لی ہے جو نہ تو عوامی نمائندہ ہیں اور نہ ہی ان کے سر پر کامیابی کا کوئی تاج ہے، جس کے سہارے وہ اقتدار پر قابض رہ سکیں۔ چنانچہ جہاد کی کمان اب ان طاقتوں نے سنبھال لی ہے جو سرکاری کنٹرول سے باہر ہیں۔

اسلامی دنیا میں موجود انتہا پسند تحریکیں اپنے ماضی سے تحریک پاتی ہیں اور ایمان ان کو غذا فراہم کرتا ہے۔ مسلم دنیا میں بادشاہ اور آمران تحریکوں کو ہمیشہ ناپسند نہیں کرتے۔ بسا اوقات یہ شدت پسند گروہ ان حکمرانوں کی ناکامیوں سے عوام کی توجہ ہٹا کر کسی بڑے، نام ونمود والے عالمی مقصد کی طرف مرکوز کر دیتے ہیں۔ ایسا ڈبل گیم بہت عام ہے، جب تک کہ اسکا پردہ فاش نہ ہو جائے یا الٹ کر خود انہی پر نہ جا گرے۔ کبھی کبھی حکمراں طبقہ جہاد کا فریضہ ایسی تنظیموں کے سپرد کر دیتا ہے جن کو ناکامی کی صورت میں قربانی کا بکرا بنا دیں، اور کامیاب ہونے پر انہیں اپنے حق میں استعمال کریں۔

1922 میں خلافت کے زوال اور 1924 میں مصطفیٰ کمال اتاترک کے ہاتھوں اس کے باضابطہ خاتمے کے بعد، اسلامی دنیا ابھی تک اس کا کوئی قابل قبول جدید بدل دریافت نہیں کر سکی ہے۔ خلافت، ایک غیر معمولی ادارہ، جس نے تقریباً تیرہ صدیوں تک امت اسلامیہ کی اس طرح آبیاری کی ہے کہ وہ اسلامی تاریخ کا ایک لازمی جز بن گیا۔ رسول اللہ ﷺ کی وفات کے بعد خلافت کی ذمہ داری حضرت ابوبکرؓ نے سنبھالی۔ چونکہ امت کا دائرہ بڑی تیزی سے پھیل رہا تھا، اس لئے یہ ممکن نہ رہا کہ ایک ہی خلیفہ تمام مسلمانوں کا واحد سربراہ رہے۔

مادی اور روحانی ذمہ داریوں کا امتزاج مسلم دنیا میں ایک نمایاں قوت بن کر ابھرا۔ ابتدا میں اس کا مرکز مدینہ رہا، پھر دمشق اور بغداد منتقل ہوا اور بالآخر قسطنطنیہ پہنچا، جہاں عثمانیوں نے خلافت کی

آخری کڑی کو جوڑے رکھا۔ اپنے تمام تر اختیارات اور غیر محدود طاقت کے باوجود خلیفہ، کبھی بھی مطلق العنان نہیں رہا۔ جب اس خلافت کو اپنے آخری جہاد (یعنی پہلی عالمی جنگ) میں شکست و ریخت کا سامنا کرنا پڑا، تب ہی سے امت اسلامیہ کوئی پائیدار اور نمائندہ حکومت قائم کرنے میں کامیاب نہیں ہوسکی ہے۔

آخری دو عظیم مسلم سلطنتیں عثمانی سلطنت اور برصغیر کی مغلیہ سلطنت تھیں۔ ان دونوں غیر مربوط سلطنتوں کی تشکیل نوقوم پرستی کے نام پر نہ ہوئی تھی، لیکن ان قدیم سلطنتوں کے بطن سے پیدا ہونے والے کسی بھی مسلم ملک نے ایمانداری کے ساتھ جمہوریت قائم کرنے اور اسے مستحکم کرنے کی کوشش نہیں کی۔ فی الحال وہ جہاں کہیں بھی قائم ہے جیسے بنگلہ دیش، وہاں بھی وہ دیرپا ثابت نہیں رہ سکی۔ یہاں تک کہ آزاد خیال ترکی میں بھی فوج کے بوٹوں کی دھمک ہمہ وقت سنائی دیتی رہتی ہے۔ طرفہ تماشہ یہ ہے کہ فوج ہی نے خود کو سیکولر ریاست کا محافظ قرار دے رکھا ہے، گویا بالغ رائے دہی کے ایسا کر سکنے پر اعتماد نہیں کیا جا سکتا۔

عرب ممالک آمرانہ طرز حکومت کی بیڑیاں پہن چکے ہیں۔ کچھ شاہی خاندانوں کے زیر اقتدار چلے گیے، جن کے ذریعہ شروع میں برطانوی سامراج نے چائے، بسکٹ یا شراب کے خمار کے ذریعہ اپنے مفادات کا تحفظ کیا۔ لیکن اب یہ استحصال پورا مغرب کر رہا ہے، کیونکہ مغرب ہر قیمت پر اپنے تیل کی سپلائی لائن کو جاری رکھنا چاہتا ہے۔ زیادہ امیر مملکتوں میں شاہی نظام نے خوشحالی کا طلسم دکھا کر اپنے حق میں ایک کمزور سی حمایت حاصل کر لی ہے، جبکہ دیگر شہریوں کو اطاعت کے بدلے کچھ مراعات دے دی گئی ہیں۔ ناقدین کہتے ہیں کہ ان ممالک میں نہ سیاسی آزادی ہے اور نہ ہی اظہارِ رائے کی آزادی۔

آج بھی جب بادشاہ، امیر، آمر اور چھوٹے مگر غیر مؤثر رئیس، اقتدار پر قابض نظر آتے ہیں، تو ایک سوال جنم لیتا ہے، جس کا جواب مسلم اشرافیہ کے پاس نہیں: اگر آپ عوام کی نمائندگی نہیں کرتے، تو پھر آخر کس کی نمائندگی کرتے ہیں؟

کچھ حکومتیں مسلمانوں کو یہ کہہ کر بے وقوف بنانے کی کوشش کرتی ہیں کہ وہ ان کے دین وایمان کی محافظ ہیں، مگر اسلامی بنیاد پرست جلد ہی ان کی اصلیت آشکار کر دیتے ہیں۔ وہ انہیں یا تو غیر ملکی طاقتوں کا پٹھو سمجھتے ہیں، یا ایک بدعنوان اور عیاش حاکم جو اسلامی اصولوں سے اتنا ہی دور ہے جتنا ایک کافر ومشرک۔

بنیاد پرستوں کی تنقید کا سب سے بڑا نشانہ وہ سرزمین ہے جہاں رسول اللہ ﷺ کی ولادت ہوئی تھی۔ آج اس مقدس زمین پر آل سعود حکمران ہیں۔ ان کے ناقدین کا یہ الزام ہے کہ انہوں نے رسول اللہ ﷺ کی اس سرزمین کو انگلو۔امریکن طاقتوں کی مدد سے ایک خاندانی جاگیر میں تبدیل کر دیا ہے۔ اب تو انہوں نے ملک کا نام ہی ''سعودی عرب'' رکھ دیا ہے تاکہ کوئی یہ نہ بھولے کہ یہ ایک خاندانی جاگیر ہے۔

کافروں کے خلاف جہاد جائز ہے، لیکن مرتد کے خلاف فرض ہے۔ ایک گروہ جس نے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو سب سے زیادہ پریشان کیا وہ منافقین تھے (اتفاق سے یہی لفظ حبشہ کے عیسائی کلیسا بھی استعمال کرتے تھے) یہ اہل مدینہ کی ایک جماعت تھی جو بظاہر مسلمان ہوگئی تھی، لیکن بباطن کافروں کی ایجنٹ تھی' قرآن میں کم از کم بیس بار ان کا ذکر کیا گیا ہے' ایک سے بڑھ کر ایک مذمت' دھوکے باز، فتنہ پرداز، احمق، مسخرے، بہرے، گونگے، اندھے، گھمنڈی، بزدل، بھیدی، جھوٹے اور مرتد' قرآن انہیں سخت عذاب، ظلمت اور جہنم کے سب سے نچلے طبقے میں ڈالنے کی وعید سناتا ہے۔ مرتد وہ شخص ہے جو ہدایت کے بعد راہ حق سے پھر جائے۔ قرآن کریم ایسے افراد کے بارے میں کہتا ہے: ''اللہ نے ان پر لعنت کی ہے، اور ان کے کانوں کو بہرا اور آنکھوں کو اندھا کر دیا ہے'' (سورۃ محمد، آیت 23)۔ ان کا انجام طے ہے: ''ان پر لعنت ہے، جہاں کہیں وہ پائے جائیں، پکڑے جائیں گے اور بے دریغ قتل کیے جائیں گے۔ یہ اللہ کی وہ سنت ہے جو پہلے لوگوں میں بھی جاری رہی، اور تم اللہ کی سنت میں کوئی تبدیلی نہ پاؤ گے۔''

مرتد ریاست کے خلاف بھی جہاد فرض ہے۔ بعض شدت پسند جماعتیں اس منطق کا اطلاق ان مسلم حکومتوں پر بھی کرتی ہیں جنہیں وہ دشمن کی ایجنٹ سمجھتی ہیں۔ دی اکانومسٹ کے 13 اکتوبر 2001

کے شمارے کی ایک رپورٹ میں کہا گیا کہ سعودی حکام نے ایک 80 سالہ نابینا عالم دین، شیخ حمود بن عقلہ الشعیبی کو طلب کیا، جو اس وقت نجد کے علاقے بریدہ میں مقیم تھے، جو وہابی مکتب فکر کا گڑھ سمجھا جاتا ہے۔ کبھی ملک کے چیف جسٹس تک کے بھی شرعی مشیر کے طور پر کام کر چکے شیخ حمود سے پوچھا گیا کہ کیا انہوں نے آل سعود کے خلاف فتویٰ دیا ہے۔ ان کا جواب مختصر اور دوٹوک تھا: ''جو شخص مسلمانوں کے خلاف کافروں کی مدد کرے وہ خود بھی کافر ہے۔'' یہاں شیخ حمود جس ''کافر'' کا ذکر کر رہے تھے، وہ مسیحی امریکہ تھا۔

ایک بہت بڑی ستم ظریفی یہ ہے کہ یہ ''مرتد ریاستیں'' جب کسی دلدل میں پھنس جاتی ہیں تو انہی انتہا پسند جماعتوں کی در پردہ حمایت حاصل کرتی ہیں۔ لیکن جلد ہی انہیں یہ احساس ہو گیا کہ کھانا کھلانے والے ہاتھ ہی کو ڈسا جا رہا ہے۔ اسامہ بن لادن ایک نیا امام بن کر ابھرا، جو بیک وقت عیسائی کافروں اور عرب دنیا میں ان کے مرتد ایجنٹوں دونوں سے برسرِ پیکار رہا۔ کچھ ملاؤں نے ان پاکستانی لیڈروں کو بھی مرتد قرار دیا ہے جنہوں نے طالبان اور القاعدہ کے خلاف امریکہ کی حمایت کی تھی۔

عہد حاضر کے اسلام اور عیسائی دنیا کے مابین مسلسل تصادم کے تناظر میں پاکستان کا تجربہ خاصی اہمیت رکھتا ہے۔ اگرچہ پانچ سو سال سے بھی زیادہ عرصہ تک اسلام کا سیاسی مرکز قسطنطنیہ تھا، لیکن جلد ہی اس کی آبادی کا مرکز جنوبی ایشیا، جسے 1947 سے قبل تک ہندوستان کے نام سے جانا جاتا تھا، منتقل ہو گیا۔ اس کتاب میں تاریخ کے کئی نشیب و فراز کا تذکرہ کیا گیا ہے۔ اسی نشیب و فراز کے نتیجے میں برطانوی سلطنت دنیا کی سب سے بڑی مسلم آبادی کا مرکز بن گئی اور پھر مسلم عیسائی تعلقات بالکل ہی دونئی جہت پر مڑ گئے۔ ایک طرف سلطنت عثمانیہ کی کوشش یہ تھی کہ وہ کسی طرح انیسویں صدی کی یورپی سیاست کی کھسکتی ہوئی ریت پر قائم اپنی سلطنت باقی رکھے، اسی دور میں مغرب عیسائی قسطنطنیہ کو دوبارہ فتح کرنے کا خواب دیکھ رہا تھا جس کا نام اب استنبول رکھ دیا گیا تھا۔ دوسری طرف مشرقی ایشیا کے مسلمانوں کا برطانوی سلطنت کے زیر سایہ ایک محکوم قوم بن کر رہنے پر مجبور ہونا تھا۔ بعد میں انیسویں صدی کے اس سلگتے ہوئے منظر نامے میں ایک تیسرا عنصر بھی شامل ہو گیا جب تعلیم یافتہ اور پیشہ ور ایک بڑے ہندو متوسط طبقے نے مسلم حکمرانوں کے خلاف ناراضگی کا

اظہار کرنا شروع کر دیا، جس کا سب سے بڑا مرکز برطانوی حکومت کا سابقہ دارالحکومت کلکتہ تھا۔ یہ وہی صدی تھی جس میں ہندوستانی مسلمانوں نے برطانوی راج کے خلاف کئی بار جہاد کا اعلان کیا، جس کے بعد انگریزوں کو مسلم ذہنیت کی ساخت کو سمجھنے پر مجبور ہونا پڑا، اور یہ پوچھا جانے لگا کہ کیا اسلام میں بغاوت ایک لازمی عنصر ہے؟

برطانوی استعمار نے اپنی سلطنت کا بھرپور تحفظ کیا۔ بے شک اس کا انہیں حق تھا۔لیکن انہوں نے اس مقصد کے لیے مسلمانوں کی بے چینی کو ہندوؤں کے غصے کے خلاف استعمال کیا۔ان کی یہ حکمت عملی بظاہر کامیاب رہی،لیکن اس کی بھاری قیمت خود ہندوستان کو ادا کرنی پڑی۔ذہنوں میں پروان چڑھنے والی یہ تقسیم، محمد علی جناح جیسے پرعزم رہنما کی احتجاجی سیاست کی بدولت ایک زمینی تقسیم میں بدل گئی۔ 1947 میں ہندوستان کے ساتھ ساتھ ایک پاکستانی مملکت بھی وجود میں آ گئی۔ایک ایسی مملکت جو نہ تو ماضی کی بادشاہتوں کے بوجھ تلے دبی تھی اور نہ ہی شکست و ریخت کے مرحلے سے گزری تھی۔ اس لیے اس نئے ملک پاکستان کو ایک مثالی اور جدید مسلم ملک بننا چاہیے تھا، لیکن آئین پر اتفاق نہ ہونے کے باعث پاکستان سیاسی انتشار کا شکار ہو گیا۔ اس انتشار کی کوکھ سے مارشل لا نے جنم لیا، پھر مارشل لا بھی فوجی ابتری کا شکار ہوا جس کے نتیجے میں پاکستان ایک بار پھر تقسیم ہو گیا۔ 1971 کے بعد جمہوریت کی ایک جھلک دکھی،لیکن اتنی آمریت کے ساتھ کہ عوام نے فوج کی واپسی کو ہی غنیمت جانا۔نوے کی دہائی میں آمریت اور جمہوریت دونوں ایک ہی جھولے میں پینگیں مار رہے تھے کہ ایک بار پھر فوج نے اقتدار سنبھال لیا۔

اگر فوجی جنرل عوام کی نمائندگی نہیں کرتے، تو پھر کس کی کرتے ہیں؟ فوجی وردی اور حب الوطنی کا چولی دامن کا ساتھ ہے۔حب الوطنی کسی عظیم مقصد کے لیے ایک مثبت جذبہ ہے جو قوموں کو ترقی کی راہ پر گامزن کرتا ہے۔لیکن تاریخ بارہا یہ دکھا چکی ہے کہ جب انتظامیہ استحکام اور جواب دہی سے عاری ہو تو کسی بھی مثبت شے کے پنپنے کا امکان معدوم ہو جاتا ہے۔غیر مستحکم حکمرانوں کو کسی سہارے کی اور مذہبی انتہا پسندی کو بڑھاوا دینے کی ضرورت پڑتی ہے، خاص طور سے کسی بیرونی خطرے کے وقت یہی سب سے محفوظ اور آسان تر راستہ ثابت ہوتا ہے۔

پاکستان نے جواسلام کے تحفظ کے نام پر وجود میں آیا تھا، بہت جلد جہاد کی سیاست کرنے لگا اور ان طاقتور طبقوں کے مفادات کا نگہبان بن گیا جنہوں نے اقتدار پر قبضہ کر رکھا تھا۔ ''کافر'' بھارت اس کا قریبی ہمسایہ تھا۔ عوامی جذبات کو بہ آسانی بھڑکایا جا سکتا تھا، خاص طور پر تقسیم کے وقت پیدا ہونے والی نفرتوں کے ماحول میں، جب کہ جنوبی ایشیا کی تاریخ کے سب سے بڑے احمقانہ اور سفاکانہ قتل عام میں دسیوں لاکھ لوگ لقمہ اجل بن گئے تھے۔ جب لوگ ایک دوسرے کو قتل کر رہے تھے تو فوج بے بسی سے اس کا نظارہ کر رہی تھی اور کبھی کبھی مدد بھی کر دیتی تھی۔ زہر کی سیاست اپنا حساب مانگ رہی تھی۔ ایسی ہی فضا میں انتہا پسند عناصر کو محفوظ ٹھکانہ اور پھلنے پھولنے کا موقعہ ملتا ہے۔ ٹھیک اسی وقت بھارت میں سیکولر قوتیں کمزوری اور مصالحت پسندی کی وجہ سے زوال کا شکار بن گئیں، جس سے ہندو انتہا پسند طاقتوں کو سر اٹھانے کا موقع ملا۔ اس طرح ایک انتہا پسندی نے دوسری انتہا پسندی کی آبیاری کی۔

سوویت یونین کی افغانستان میں مداخلت نے مغرب میں وقتی طور پر جہاد کو جائز بنا دیا، اور امریکہ کی خارجہ پالیسی نے بھی اس کا بھرپور سیاسی فائدہ اٹھایا، حالانکہ وہ اس حقیقت کو پوری طرح سمجھ نہیں سکا تھا۔ 11 ستمبر 2001 کے بعد اس کو کسی حد تک اس کا ادراک ضرور ہوا، لیکن اس حقیقت کو وہ اب بھی پوری طرح سمجھ نہیں سکا ہے کہ اسلامی انتہا پسندی تاریخ کے کس پس منظر میں پھلی پھولی ہے۔

پاکستان اور بھارت دونوں کے لیے باعثِ اطمینان بات یہ ہے کہ ان دونوں ممالک میں سیکولرزم، شعور اور جمہوریت کی ایک بلند و بالا لہر اب بھی موجود ہے، جو جنوبی ایشیائی روایات اور ثقافت کی دین ہے۔ اگر اس جذبہ کو دونوں ممالک میں سیاسی توازن مل جائے تو پھر عقل سلیم کی واپسی کی امید کی جا سکتی ہے۔ لیکن کیا عقلِ سلیم کی توقع ایک ایسے خطے میں کی جا سکتی ہے جہاں اسرائیل کے خلاف جہاد کی صدائیں اب بھی بلند ہو رہی ہیں؟

بہت سے لوگوں کے نزدیک فلسطینی ریاست کے قیام کا مطالبہ اتنا واضح بدیہی ہے کہ اسے دہرانے کی ضرورت بھی نہیں ہے۔ مگر اس کے حل میں لاپروائی اور تاخیر نے اسے ایک ناسور بنا دیا ہے۔ دوسری طرف، کئی غیر جمہوری عرب ملکوں نے فلسطین کے مسئلے کو محض لوگوں کی توجہ حاصل کرنے کا

ایک نعرہ بنادیا ہے جس کے ذریعے وہ اپنی حکومتوں پر ہونے والی تنقید سے توجہ ہٹاتے ہیں۔

شاید مغربی دنیا نے بھی خود فریبی میں مبتلا ہوکر یہ باور کرلیا کہ عرب ممالک، جن کی بقا مغربی سرپرستی کی مرہون منت ہے، 1973 میں اسرائیل کے خلاف اپنا آخری جہاد لڑ چکی ہیں۔ انہوں نے اسلامی امت میں شوق شہادت کا اندازہ غلط لگایا۔ وہ اس بچے کو پہچان نہ سکے، جو "تلواروں کے سائے میں" بھی پورے سکون واطمینان کے ساتھ چل پھر رہا ہو۔

# 1

# جہاد: قرآن وحدیث کی روشنی میں

عبداللہ بن ابی اوفیؓ سے روایت ہے کہ رسول اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا: ''جان لو کہ جنت تلواروں کے سائے میں ہے۔'' (صحیح بخاری، کتاب الجہاد)

آغاز ایک معجزے سے ہوا، اور وہ معجزہ ایک لفظ تھا: اقرأ... یعنی ''پڑھ''۔ اللہ کے فرشتے جبرئیل نے ایک ناخواندہ محمد صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے کہا ''پڑھ''، اور انہوں نے اللہ کا کلام دنیا کو سنانا شروع کیا، ایسی مسحور کن نثر میں جو بعد میں جمع ہو کر ''قرآن مجید'' کہلائی۔

اسلام کا جنم دوبارہوا۔ مسیحی کیلنڈر حضرت عیسیٰ کی پیدائش سے شروع ہوتا ہے، لیکن اسلامی کیلنڈر نہ تو پیغمبر کی پیدائش سے نہ وحی کے آغاز سے، بلکہ اس وقت سے جب دین کو بقائے دوام ملا: یعنی ہجرت سے۔ جب پیغمبرِ اسلامؐ اپنے عزیز دوست حضرت ابوبکرؓ کے ہمراہ مکہ سے مدینہ کی جانب روانہ ہوئے۔ یہی دوست بعد میں آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے خسر بھی بنے، جب آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ان کی صاحبزادی حضرت عائشہؓ سے نکاح کیا۔

جب آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے نبوت کا اعلان کیا تو آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے اپنے قبیلہ قریش نے آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو سخت اذیتیں پہنچائیں اور جب آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے یثرب (جو بعد میں مدینہ کے نام سے مشہور ہوا) میں پناہ لی تو قریش نے اپنے ہی بھائی بند کو جان سے مارنے کا تہیہ کیا۔ کیونکہ انہوں نے خانہ کعبہ سے بت پرستی کو ختم کرنے کا اعلان کیا تھا، جس سے ان کے حج سے حاصل ہونے والی آمدنی پر براہ راست زد

پڑتی تھی۔قریش نے نو سو سے ایک ہزار جوانوں پر مشتمل اپنے سب سے بہترین سرداراور مسلمانوں کے سب سے بڑے دشمن ابو جہل (مسلمانوں کا دیا ہوا خطاب جس کے معنی ہیں جہالت کا باپ) کی قیادت میں ایک فوج بھیجی، جس نے روانہ ہوتے وقت یہ اعلان کیا ''اسے تباہ و برباد کردو جس نے ہمارے رشتے ناطے توڑ ڈالے اور وہ چیز لایا ہے جو ہمارے لیے نا قابلِ قبول ہے''۔

تقریباً تین سو نفوس پر مشتمل مسلم فوج بدر کے کنویں کے بالکل سامنے اس طرح خیمہ زن ہوئی کہ پانی کی رسد قریش تک نہ پہنچ سکے۔ جنگ 17 رمضان کو شروع ہوئی، اور رسول اللہؐ کے اضطراب کا اندازہ آنسوؤں کے بیچ اس دعا سے لگایا جا سکتا ہے، جس میں آپ اپنے رب سے کہہ رہے تھے ''اے اللہ! اگر آج یہ قلیل جماعت ہلاک ہو گئی تو پھر روئے زمین پر تیرا نام لینے والا کوئی نہ ہوگا'' اس کے بعد آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم پر غنودگی طاری ہو گئی، اور جب بیدار ہوئے تو آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو مکمل اطمینان حاصل ہو چکا تھا، کیونکہ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے حضرت جبرائیل کو دیکھا تھا جو ایک گھوڑے کی لگام تھامے ہوئے تھے اور ان کے اگلے دانتوں پر گرد جمی ہوئی تھی۔ (بحوالہ دی لائف آف محمدؐ، ترجمہ سیرت ابن اسحاق، مدیر اے گلیوم، آکسفرڈ 1955)

فتح کے بعد مسلمانوں نے گواہی دی کہ سفید عماموں والے فرشتے ان کی مدد کو آئے تھے۔ یہ ایک ایسی جنگ تھی جس میں کفار کے مقابلے میں مسلمانوں کی تعداد بہت کم تھی۔ اس جنگ کا نتیجہ دیکھ مسلمانوں کو یہ یقین کامل ہو گیا کہ میدان جنگ میں اللہ ان کی مدد فرماتا ہے۔ بدر کے واقعات اسلامی امیدوں کا سب سے بڑا سر چشمہ ہے۔ اسلام میں جہاد کی روح بدر ہی سے داخل ہوئی ہے۔ ایک ایسی روح جو عقل و شعور سے بالا ایک مومن کے اندر جاں نثاری کا جذبہ، اور غیر مومن کے دلوں میں ہیبت پیدا کرتی ہے۔ ''جہاد'' کا ماخذ عربی لفظ ''جہد'' ہے، جس کا مطلب ہے کوشش یا جدوجہد۔ لیکن اس جدوجہد کی عظمت اس کے مقصد سے ہے: جہاد ایک مقدس جنگ ہے، حق کی خاطر جنگ، ظلم کے خلاف بغاوت۔ یہ ایک ایسا جذبہ ہے جو جنگ کے نتیجے سے بے نیاز ہوتا ہے، کیونکہ مجاہد ہر حال میں کامیاب رہتا ہے۔ اگر زندہ رہا تو فتح مقدر ہے، اور اگر شہید ہوا تو جنت اس کا انعام۔ یہ جدوجہد ساتھ ساتھ نفس کی پاکیزگی کا مطالبہ بھی کرتی ہے، کیونکہ شہادت کا درجہ صرف اس شخص کو ملتا ہے جس کا باطن بھی پاک ہو۔

جہاد کی دو قسمیں ہیں: بڑا جہاد (جہاد اکبر) جو انسان اپنے نفس، کمزوریوں اور گمراہی کے خلاف کرتا ہے، اور چھوٹا جہاد (جہاد اصغر) جو میدان جنگ میں ہوتا ہے۔ اسلام اپنے لفظی معنی کے عین مطابق تشدد کا قائل نہیں ہے، لیکن وہ بے بسی اور خودسپردگی کی بھی اجازت نہیں دیتا۔ کچھ مخصوص حالات میں مسلمانوں پر اپنے دین کا دفاع کرنا، فرض ہو جاتا ہے۔ ایسے حالات میں جنگ ایک فریضہ بن جاتی ہے، اور اس سے منہ موڑنے والوں کی قرآن مذمت کرتا ہے۔ اگرچہ یہ جہاد ''جہاد اصغر'' کہلاتا ہے، لیکن بارہ سو سالہ تاریخ میں صرف چند بار ہی غیر مسلم فوجیں اس سے اپنی عزت یا طاقت بچا کر نکلنے میں کامیاب ہو سکی ہیں۔

مسلمانوں کی فوجی فتوحات غیر معمولی رہی ہیں۔ اس کی ابتدا ہی بڑی حیرت انگیز تھی۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی وفات کے صرف دو برس بعد، جب مرتدین کی بغاوتوں سے بھی نبرد آزما ہونا پڑا تھا، اسلامی فوجیں نے اس دور کی دو عظیم عالمی طاقتوں کی تربیت یافتہ، منظم اور جدید اسلحہ سے لیس افواج سے نبرد آزما ہوئیں اور انہیں شکست دی۔ مشرق میں ساسانی سلطنت کو اور شمال ومغرب میں بازنطینی سلطنت کو۔

ابھی صرف دو نسلیں ہی گزری تھیں کہ جہاد کا نعرہ لگاتے ہوئے اسلامی فوجیں مدینہ سے یروشلم، دمشق، انطاکیہ، حلب اور اس سے بھی آگے بازنطینی سلطنت کے قلب میں داخل ہو چکی تھیں۔ مشرق کی جانب، وہ قادسیہ اور مدائن تک پہنچ گئیں جہاں ساسانیوں کے خزانے جمع تھے، اور وہاں سے نہاوند، ہمدان اور بحیرہ کیسپین تک کے علاقوں کو زیر کر لیا۔ پھر اپنا راستہ بدل کر اسلامی فوجیں بصرہ اور اصفہان کی جانب بڑھیں، وہاں سے نیشاپور اور وسط ایشیا کے دریائے آمو (اوکسس) ہوتی ہوئی، ایک جانب افغانستان کی طرف پیش قدمی کی، اور دوسری سمت وہ سندھ اور وادیِ سندھ میں داخل ہو گئیں۔

جنوب میں اسلامی فوج مصر کے شہر فسطاط اور اسکندریہ تک جا پہنچی، جہاں سے اس نے مغرب کا دروازہ کھولا اور تیزی سے پیش قدمی کرتے ہوئے بحرِ اوقیانوس کے کنارے واقع شہر اسیوط تک جا پہنچی۔ یہاں سے نئی زمینوں کی تلاش انہیں جبل الطارق (جبرالٹر) لے گئی، اور پھر وہ قرطبہ، طلیطلہ

اور سرقسطہ تک پہنچ گئی، جہاں انہوں نے ایک شاندار تہذیبی سلطنت قائم کی، جو سات سو قابل ذکر برسوں تک مشرق ومغرب کا سنگم بنی رہی۔

لیکن اس عظیم کامیابی کے جوش وخروش نے بہت سے مسلمانوں کے بنیادی اندازفکر میں ایک گراوٹ پیدا کردی۔ جہاد سلطنت سازی کے لیے نہیں کیا جاتا گو کہ جہاد کے نتیجے میں سلطنتیں وجود میں آجاتی ہیں۔ جہاد کی اصل قوت کا ظہور اس وقت نہیں ہوتا جب ہر طرف فتح ہی فتح ہو بلکہ اس وقت ہوتا ہے جب سب کچھ کھودینے کا ڈر ہو۔ جنگ بدر کی روح یہی ہے۔

مسلمانوں کا سیاسی شعور ایک عظیم الشان تاریخ کے ورثے سے کافی حد تک متاثر ہے۔ ایک ایسی امت جو مختلف جغرافیوں اور تہذیبوں میں بٹی ہو، اس سے کسی مسئلے پر یکساں ردِعمل کی توقع نہیں کی جاسکتی۔ لیکن کچھ مسائل پر یہ امتِ مسلمہ حیرت انگیز طور پر ایک مشترک پلیٹ فارم پر متحد ہوجاتی ہے۔ اس صورت حال کو ہم ''مدینہ سنڈروم'' کہہ سکتے ہیں۔ یعنی یہ یقین کہ اسلام، مسلمان طاقتور دشمنوں کے نرغے میں ہیں، اور اس کا واحد حل ایمان، اتحاد اور جہاد ہے۔

پہلے یہ دشمن قریش تھے، اب عیسائی مغرب ہے یہ تاثر ایک ہزار سال سے بھی زیادہ کشمکش کا نتیجہ ہے، جس کی بنیاد فلسطین میں ''فرنج''، یعنی عیسائیوں کی آمد سے پڑی۔ ''عیسائی'' کی تعبیر کو یکسر غلط کہہ کر مسترد نہیں کیا جاسکتا۔ 11 ستمبر 2001 کو ورلڈ ٹریڈ سینٹر اور پنٹاگون پر حملے کے بعد امریکی صدر جارج ڈبلیو بش نے اسامہ بن لادن کے خلاف ''صلیبی جنگ'' شروع کرنے کا اعلان کیا تھا، اسی طرح اٹلی کے وزیراعظم سلویو برلسکونی نے بھی اپنی تقریر میں عیسائیت کو اسلام سے ''زیادہ مہذب مذہب'' قرار دیا تھا۔ ایسے بیانات شک میں مبتلا لوگوں کو قائل کرنے کے لیے کافی ہیں۔ شکست کا احساس اور ان سبز جھنڈوں کی یاد، جو کبھی سیاسی اقتدار کی بلند چوٹیوں پر لہراتے تھے، اس کیفیت کو مزید دھاردار بناتی ہے۔

ہر سلطنت کا عروج ہوتا ہے، پھر زوال، لیکن مسلمان اس عمل کو تین مراحل میں دیکھتا ہے: عروج، زوال، اور احیاء۔ چونکہ سلطنت کا خالق انسان ہوتا ہے، اس لیے اس میں بگاڑ پیدا ہونا فطری ہے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم نے اسی حقیقت کو یوں بیان فرمایا ہے کہ سب سے بہترین مسلمان میرے زمانے

کے ہوں گے، اور پھر ہر آنے والی نسل میں بتدریج گراوٹ آئے گی۔ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو اقتدار کے بگاڑ کا بخوبی علم تھا، اسی لیے فرمایا تھا کہ ''جو جتنا حکومت کے قریب ہوگا، وہ اتنا ہی اللہ سے دور ہوگا۔''

ایک سلطنت فتح کرنے والا دبلا پتلا مجاہد وقت کے ساتھ ایک تحیم شحیم اور آسائش پسند حکمران بن گیا۔ یہ ایک قدرتی تبدیلی تھی۔ پانچویں خلیفہ، جس نے اسلام کی پہلی خانہ جنگی کے بعد اقتدار پر قبضہ کیا، ان جلیل القدر چار خلفائے راشدین (حضرت ابوبکر، حضرت عمر، حضرت عثمان اور حضرت علی رضی اللہ عنہم) کی صف میں شمار نہیں کیا جا سکتا۔ وہ اس قدر موٹاپے کا شکار ہو گیا تھا کہ 680 عیسوی میں اپنی وفات کے وقت نماز کے دوران منبر پر چڑھنے کے قابل بھی نہ رہا۔

اسلامی فکر کا یہ حل نہیں ہے کہ کسی غیر مسلم کے سامنے ہتھیار ڈال دیا جائے، بلکہ تسلسل کے ساتھ اخلاقی احیاء ہے۔ جس کے بطن سے ایک نئی سیاسی کامیابی کا جنم ہوگا۔ حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ایک حدیث میں ایک امام صادق، (امام مہدی) کے ظہور کی بشارت دی ہے۔ ایک روایت کے مطابق ہر صدی میں ایک مجدد پیدا ہوگا، جو ایمان کی پاکیزگی اور اسلام کے ابتدائی اصولوں کی طرف واپسی کے ذریعے امت کو اس کے کھوئے ہوئے مقام پر واپس لائے گا۔ وہی اصول جنہوں نے ایک ہی نسل کے اندر اسلام کو دنیا کی ایک بڑی طاقت بنا دیا تھا۔ آج کے اسلام کو سمجھنے کے لیے اس کے ابتدائی دور کو سمجھنا ضروری ہے۔

خواہ آپ اسے ایک شاعرانہ تخیل سمجھیں، مگر مسلم مؤرخین بیان کرتے ہیں کہ جس رات نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی ولادت ہوئی تھی، فارس کے بادشاہ خسرو کے محل کے چودہ کنگورے ایک جھٹکے کے ساتھ زمین بوس ہو گئے، زرتشتیوں کی آگ بجھ گئی، اور جھیل ساوہ خشک ہوگئی۔ یہ اشارے جلد ہی ایک حقیقت بن کر نمایاں ہوئے۔ فارس اسلام کے دائرے میں داخل ہوا اور زرتشتی اقلیت بن کر جلاوطن ہوگئی، جن میں سے اکثریت نے ہندوستان میں پناہ لی۔ گو کہ اس ملک کو بعد میں بہت سے نشیب وفراز سے گزرنا پڑا ہے۔

اسلامی روایت میں اللہ کی طرف سے بنائے گئے رشتے کو بہت مضبوط مانا گیا ہے۔ اس ضمن میں اگرچہ روایات میں اختلافات ہیں، تاہم ایک روایت اس مسئلے پر کافی حد تک روشنی ڈالتی ہے۔

روایت ہے کہ عبداللہ (رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے والد) اپنے والد عبدالمطلب بن ہاشم کے ہمراہ ورقہ بن نوفل کے گھر کے قریب سے گزر رہے تھے۔ ورقہ اس دور کے ان معدودے چند افراد میں سے تھے جنہیں حنیف کہا جاتا تھا، یعنی وہ لوگ جو توحید کے قائل تھے مگر نہ یہودی تھے اور نہ عیسائی۔ اس موقع پر ورقہ کی بہن قتیلہ نے عبداللہ کو نکاح کی پیشکش کی اور اس کے عوض سو اونٹ دینے کا وعدہ بھی کیا۔ لیکن عبداللہ نے اپنے والد کی اطاعت کو ترجیح دی اور ان کے ساتھ وہب بن عبدمناف کے گھر روانہ ہو گئے، جہاں ان کی بیٹی آمنہ کے ساتھ ان کا نکاح ہوا۔

عبداللہ نے اپنی نئی دلہن کے ساتھ تین دن گزارے۔ انہی ایام میں نبی آخرالزمان صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا پیکر عالم وجود میں آیا۔ واپسی کے راستے میں عبداللہ کی دوبارہ قتیلہ سے ملاقات ہوئی۔ عبداللہ نے پوچھا کہ کیا تمہاری پیشکش اب بھی برقرار ہے؟ قتیلہ کا جواب مختصر مگر فیصلہ کن تھا: ''نہیں۔ تین روز قبل تمہارے چہرے پر جو نور تھا، اسے اب کسی اور نے لے لیا ہے۔'' وہ اس بچے کی ماں بننا چاہتی تھی جو آگے چل کر پیغمبر بننے والا تھا۔

محمد صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو اپنے والدین کی محبت زیادہ عرصے تک نصیب نہ ہو سکی۔ آپ کے والد کا انتقال آپ کی ولادت سے دو ماہ قبل یثرب کے ایک سفر کے دوران ہوا۔ وہی شہر جو آگے چل کر آپ کا جائے پناہ بننے والا تھا۔ جب آپ کی عمر تقریباً چھ برس ہوئی تو آپ کی والدہ کا بھی انتقال ہو گیا۔ آپ کے دادا عبدالمطلب آپ سے بے پناہ محبت کرتے تھے، لیکن ظاہر ہے وہ ماں کی کمی کیسے پوری کرتے۔

اگرچہ آپ کا خاندان قریش کے معزز طبقے سے تعلق رکھتا تھا، مگر مالی طور پر بہت خوشحال نہ تھا۔ تاہم، حضور اکرمؐ کی فطری صلاحیتیں جلد ہی لوگوں کی توجہ کا مرکز بننے لگیں۔ آپ کی ذہانت، دیانت اور سچائی نے ابتدائی عمر ہی میں آپ کو ممتاز مقام دلا دیا۔ مثال کے طور پر، ایک نسبتاً کم عمری میں ہی آپ کو قبائل کے درمیان ایک ایسے جھگڑے میں ثالث مقرر کیا گیا، جو اگر شدت اختیار کرتا تو ہمیشہ برسرِ پیکار رہنے والے قبائل کے درمیان خونریزی کی ایک اور لہر کا باعث بن سکتا تھا۔

کعبہ اسلام کی سب سے عظیم علامت ہے۔ دنیا بھر کے مسلمان اسی مکعب نما عمارت کی جانب رُخ کر کے دن میں پانچ وقت یا اس سے زیادہ نماز ادا کرتے ہیں۔ روایات کے مطابق، حضرت آدم

علیہ السلام (قرآن نے حضرت آدم علیہ السلام اور حضرت داؤد علیہ السلام دونوں کو اللہ کا ''خلیفہ'' کہا ہے) نے کعبہ کو زمین پر ٹھیک اس جگہ تعمیر کیا جو آسمان میں موجود ''کعبۂ کامل'' (بیت معمور) کے عین نیچے ہے۔ نوح علیہ السلام کے طوفان میں جب کعبہ تباہ ہو گیا تو حضرت ابراہیم علیہ السلام نے اپنے بیٹے حضرت اسماعیل کے ساتھ مل کر اسے دوبارہ تعمیر کیا۔ تعمیر کے دوران پانچ پہاڑوں... طور سینا، الجودی، حرا، طور زیتا، اور لبنان ... سے پتھر لائے گئے۔ جب ایک مخصوص کونے کے لیے نشانِ سنگ کی تلاش ہوئی تو حضرت اسماعیل کو حضرت جبرائیل ملے، جنہوں نے انہیں وہ مشہور سیاہ پتھر عطا کیا جو آج بھی کعبہ میں نصب ہے۔ ایک روایت کے مطابق رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم نے فرمایا کہ جب یہ پتھر جنت سے آیا تو دودھ سے بھی زیادہ سفید تھا، لیکن گناہگاروں کے چھونے سے اب یہ سیاہ ہو چکا ہے۔

وقت گزرنے کے ساتھ کعبہ ان لوگوں کے قبضے میں چلا گیا جنہوں نے حضرت ابراہیم علیہ السلام کے رب کو ترک کر دیا تھا۔ روایت ہے کہ کعبہ میں بت پرستی کو سب سے پہلے جس شخص نے متعارف کرایا وہ عمرو بن لحی تھا، جو ہُبل نامی بُت کو بین النہرین (میسوپوٹیمیا) سے لا کر کعبہ میں نصب کر گیا۔ قریش اب کعبہ کے نگران اور اس سے حاصل ہونے والی آمدنی کے مالک بن چکے تھے۔ نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کے دادا عبدالمطلب بھی اس وقت کعبہ کے متولی تھے جب اس کی عمارت کو از سرِ نو بلند کرنے کا فیصلہ کیا گیا۔

جب حجرِ اسود کو اس کی اصل جگہ پر نصب کرنے کا وقت آیا تو ہر قبیلہ اس سعادت کو حاصل کرنے کے لیے تیار تھا، یہاں تک کہ خونریزی کا خدشہ پیدا ہو گیا۔ ایسے میں محمد صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم نے ایک چادر منگوائی، اسے زمین پر بچھایا، اس پر حجرِ اسود رکھا، اور چادر کے کنارے تمام قبائل کو تھما دیے تاکہ وہ سب مل کر اسے اپنی جگہ رکھیں۔ یوں ایک بڑا تنازعہ امن کے ساتھ ختم ہوا۔ اس حکمت اور امانت پر سب نے آپ کو ''الامین'' یعنی ''سب سے زیادہ قابل اعتماد'' کا لقب دیا۔ اس وقت آپ کی عمر تقریباً 35 برس تھی۔

نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کی دیانت داری اور نیک نامی سن کر قریش کے معزز خانوادے سے تعلق رکھنے والی

ایک مالدار، دو بار بیوہ ہونے والی خاتون، حضرت خدیجہ بنت خویلدؓ کی نظر آپ ﷺ پر پڑی۔ انہوں نے اپنے تجارتی قافلے کی نگرانی کے لیے آپ ﷺ کی خدمات طلب کیں، جو شام کے سفر پر جایا کرتے تھے۔ اس وقت آپ ﷺ کی عمر پچیس برس تھی اور خدیجہؓ چالیس برس کی تھیں۔ کچھ عرصے بعد خدیجہؓ نے نفیسہ بنت منیہ کے ذریعے آپ ﷺ کو نکاح کی پیشکش بھجوائی۔ آپ ﷺ نے رضامندی ظاہر کی، لیکن خدیجہؓ کے والد کو راضی کرنا آسان نہ تھا۔ تاہم، خدیجہؓ کی خواہش کو آخر کار سب پر فوقیت حاصل ہوئی۔

محمد ﷺ نے خدیجہؓ سے گہری محبت کی۔ آپ ﷺ انہیں ''تمام عورتوں میں سب سے بہتر'' کہا کرتے اور وعدہ فرمایا کہ وہ جنت میں آپ ﷺ کے ساتھ ایک ایسے گھر میں رہیں گی جو کھجور کے پتوں سے بنا ہوا ہوگا، جہاں سکون اور سلامتی ہوگی۔ نبی کریم ﷺ نے خدیجہؓ کے بعد دیگر نکاح ضرور کیے، مگر صرف اس وقت جب خدیجہؓ کا وصال ہو چکا تھا۔ قاسم، عبداللہ اور طاہر آپ ﷺ کے تین بیٹے ہوئے لیکن وہ سب بچپن میں ہی وفات پا گئے۔ زینب، رقیہ، فاطمہ اور ام کلثوم آپ ﷺ کی چار بیٹیاں بلوغت تک زندہ رہیں۔

عائشہؓ جو آپ ﷺ کی بعد کی زندگی میں سب سے محبوب بیوی تھیں، کبھی کبھی خدیجہؓ سے حسد کا اظہار کرتیں، جس پر نبی کریم ﷺ انہیں تنبیہ کرتے۔ آپ ﷺ فرمایا کرتے کہ خدیجہؓ کی محبت اور وفاداری ہی ان کی سب سے بڑی خوبی تھی: جب دنیا نے میری تصدیق نہ کی، اس نے یقین کیا۔ جب دوسرے خاموش تھے، وہ پہاڑ کی مانند کھڑی ہوگئی۔ وہ میری بہترین رفیقہ اور میرے بچوں کی ماں تھیں۔ آپ ﷺ اس آزمائش بھری دہائی کو کبھی نہ بھول سکے، جب اللہ کا پیغام آپ ﷺ کے سینے میں تھا، اور دنیا اس قلیل ایمان لانے والے گروہ کا مذاق اڑاتی اور ان پر ظلم ڈھاتی تھی۔

اللہ کا پیغام آپ ﷺ کو مکہ سے تقریباً تین میل کے فاصلے پر واقع غار حرا میں عطا ہوا۔ یہ وہ جگہ تھی جہاں آپ ﷺ اکثر خلوت نشینی اختیار کرتے اور معمولی زادِ راہ، جیسے کہ تیل میں پکا ہوا آٹا (کاک)، سے گزر بسر کرتے۔ رمضان کی ایک رات 611 عیسوی میں، فرشتہ جبرئیلؑ خواب میں

ظاہر ہوئے۔ ان کے ہاتھ میں ریشمی کپڑے کا ایک ٹکڑا تھا، جس پر کچھ حروف درج تھے۔ انہوں نے فرمایا: ''پڑھ!'' (یہی لفظ اقرأ ہے جو ''قرآن'' کا ماخذ ہے)۔ نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا: ''میں پڑھنا نہیں جانتا۔'' اس پر جبرائیلؑ نے آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو اس زور سے سینے سے بھینچا کہ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو جان نکلنے کا گمان ہوا۔ تین بار جبرئیلؑ نے فرمایا: ''پڑھ!'' آخر کار آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے کہا: ''میں کیا پڑھوں؟'' اس کے بعد قرآن کریم کی ابتدائی آیات نازل ہوئیں (سورۃ 96، آیات 1 تا 5):

> ''پڑھ! اپنے رب کے نام سے جس نے پیدا کیا۔ انسان کو خون کے لوتھڑے سے بنایا۔ پڑھ! اور تیرا رب سب سے زیادہ کریم ہے، جس نے قلم سے سکھایا، انسان کو وہ سکھایا جو وہ نہیں جانتا تھا۔''

ماکسیم رودینسن نے اپنی کتاب محمدؐ (پینگوئن، 1971) میں لکھا ہے:

> ''اس آواز نے عربی کے صرف تین الفاظ کہے، جس نے دنیا کو ہلا کر رکھ دیا: تم اللہ کے رسول ہو۔''

گھر واپس آتے ہو نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کانپ رہے تھے۔ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے خدیجہؓ کی گود میں اپنا چہرہ رکھ دیا اور سارا واقعہ بیان کیا۔ خدیجہؓ سمجھ گئیں کہ وعدہ موعود آ پہنچا ہے۔ انہوں نے آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو تسلی دی اور پھر ورقہ بن نوفل کے پاس گئیں۔ وہی عالم جن کی بہن نے کسی وقت نبیؐ کے والد عبداللہ سے شادی کی خواہش ظاہر کی تھی کیونکہ انہوں نے ان کی پیشانی پر ایک خاص نور دیکھا تھا۔ ورقہ جو کثرتِ مطالعہ کی وجہ سے نابینا ہو چکے تھے اور عمر رسیدہ و نحیف تھے، نے آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے گھر جا کر ملنے کی خواہش ظاہر کی۔ ایک خدشے کا اظہار کرتے ہوئے انہوں نے کہا:

> ''کاش میں اس وقت تک زندہ رہتا جب تمہاری قوم تمہیں یہاں سے نکال دے گی!''

جلاوطنی، شدید حالات اور پھر قتل کی سازش، اگلی دہائی میں ایک حقیقت بن کر ابھریں۔ اللہ کی طرف سے پیغام امن کے ساتھ اسلام کا آغاز ہوا، لیکن اس کی حفاظت کے لیے جنگ ناگزیر تھی۔

اللہ تعالیٰ نے اپنا پیغام نازل کر کے اپنے رسول کو حالات کا مقابلہ کرنے کے لیے تنہا نہیں چھوڑ دیا، وہ ایک فعال اور با اختیار اللہ تھا، اس نے ہر موقع پر، خواہ وہ ذاتی ہو، حکمت عملی ہو، روحانی یا مادی ہو اپنے رسول کی رہنمائی کرتا رہا۔ اسلام کی ابتدائی دہائی اس کی تاریخ کا تاریک ترین دور تھا، اور اس چھوٹی سی جماعت کے لیے ہمت و حوصلے کا واحد ذریعہ قرآنی آیات تھیں۔ جیسا کہ سورۃ الضحیٰ میں ارشاد فرمایا گیا:

''تمہارے رب نے نہ تمہیں چھوڑا ہے اور نہ وہ تم سے ناراض ہوا ہے۔''

اسلام کا وہ پہلا دور آج بھی زبردست اہمیت رکھتا ہے، کیونکہ آج کا مسلمان ایک بار پھر بحران اور مایوسی سے گزر رہا ہے۔

اسلام کے اولین پیروکاروں میں ایک بیوی، ایک چچا زاد بھائی، ایک قریبی دوست اور ایک آزاد کردہ غلام شامل تھے۔ سب سے پہلے ایمان لانے والی حضرت خدیجہؓ تھیں۔ دوسرے، دس برس کے حضرت علیؓ تھے، جو آگے چل کر اسلام کے عظیم مجاہد اور ''شیر خدا'' کے لقب سے مشہور ہوئے۔ تیسرے حضرت ابوبکرؓ تھے، جو حضرت علی کے بجائے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے جانشین ہوئے جنہیں نبی کریم ﷺ نے ان کی راست گوئی اور اخلاص پر ''صدیق'' کا لقب دیا، اور جو ہجرت کے موقع پر آپ ﷺ کے واحد ہم رکاب رہے۔ چوتھے حضرت زیدؓ تھے، جو ایک غلام تھے اور نبی ﷺ نے انہیں آزاد کر دیا تھا۔

ان چاروں افراد کا تعلق یا تو اہلِ خاندان سے تھا یا پھر وہ آپ ﷺ کے خاندان سے بہت قریب تھے۔ اسلام کی دعوت جب آگے بڑھی تو وہ ان نیک دل نوجوانوں اور معاشرتی طور پر دبے ہوئے طبقات کے دلوں تک پہنچی جو انصاف، عزت اور ایک نئی سماجی پہچان کے خواہاں تھے۔ انہی میں حضرت بلالؓ کا نام نمایاں ہے۔ حضرت بلال ایک حبشی غلام تھے جنہیں حضرت ابوبکرؓ نے خرید کر آزاد کیا تھا، اور جو بعد ازاں اسلام کی ایک مثالی علامت بن گئے۔

ابتدا میں اسلام کی دعوت سست روی سے پھیل رہی تھی، اور قریش کی مخالفت محض تمسخر اور استہزا تک

محدود تھی۔ نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے چچا ابو طالب، جو آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے بے پناہ محبت کرتے تھے، نہایت قیمتی تحفظ فراہم کرتے رہے، اگرچہ انہوں نے خود اسلام قبول نہیں کیا۔ اس کے برعکس آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا دوسرا چچا عبدالعزیٰ (جسے "ابولہب"، یعنی آگ کا باپ کہا جاتا ہے) اسلام کا شدید مخالف اور آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے بدترین دشمنوں میں سے تھا۔

صورتحال اس وقت نازک موڑ پر پہنچ گئی جب ابولہب نے قریش کے دیگر سرداروں کو اس بات پر آمادہ کرلیا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو قتل کر دینا چاہیے۔ اس منصوبے کی سب سے بڑی رکاوٹ یہ تھی کہ اگر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو قتل کیا گیا، تو آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا قبیلہ انتقام لے گا۔ اس اندیشے کو ختم کرنے کے لیے یہ چال چلی گئی کہ ہر قبیلے سے ایک ایک شخص کو سازش میں شریک کیا جائے، تاکہ قتل کی صورت میں قصور کسی ایک قبیلے پر نہ آئے اور انتقام لینا ممکن نہ رہے۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے اس سنگین صورتحال کے پیشِ نظر مختلف امکانات پر غور شروع کر دیا۔ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے طائف ہجرت کا ارادہ کیا، مگر وہاں بھی آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو سخت دشمنی کا سامنا کرنا پڑا۔ آخرکار آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے یثرب کی جانب ہجرت کا فیصلہ فرمایا، جو مکہ سے تقریباً دو سو میل کے فاصلے پر واقع تھا اور بعد میں "مدینہ"، یعنی "شہر نبی" کے نام سے مشہور ہوا۔

مدینہ میں اس وقت تین بڑے یہودی قبائل آباد تھے: بنوقریظہ، بنونضیر، اور بنوقینقاع۔ اس کے علاوہ دو بڑے عرب قبائل اوس اور خزرج بھی وہاں سکونت پذیر تھے۔ جب ان سے کیے گئے مذاکرات کامیاب ہو گئے تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے اپنے صحابہ کو ہدایت دی کہ وہ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے پہلے مدینہ ہجرت کر جائیں اور آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے وہاں پہنچنے کا انتظار کریں۔

نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی اپنی ہجرت بڑی سنسنی خیز تھی۔ ابوجہل آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے دروازے پر موجود تھا، تاک میں بیٹھا تھا کہ جیسے ہی آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم باہر آئیں، حملہ کر دے، لیکن اسے نیند آ گئی۔ رسول اللہؐ نے حضرت علیؓ کو اپنی جگہ سلا دیا اور ان کا چہرہ چادر سے ڈھانپ دیا، تاکہ دشمن کو دھوکہ کھا جائے اور کچھ مزید وقت مل جائے۔ جب قریش کو علم ہوا کہ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نکل چکے ہیں تو وہ سخت غضبناک ہو گئے اور اعلان کیا کہ جو بھی محمد صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اور ابوبکرؓ کو گرفتار کرے گا، اسے سو اونٹنیاں انعام میں دی جائیں گی۔

آپ ﷺ اور حضرت ابوبکرؓ زیادہ دور نہیں گئے تھے۔ وہ اپنے گائڈ کی رہنمائی میں جبل ثور کے ایک سنسان غار میں پناہ گزین ہو گئے۔ ابوجہل ان لوگوں کے ساتھ تھا جو آپ ﷺ کے قدموں کے نشانات کا پیچھا کرتے ہوئے اس غار تک پہنچ گئے تھے۔ لیکن جب وہ وہاں پہنچے تو دیکھا کہ غار کے دہانے پر ایک جھاڑی اگ آئی ہے، دو جنگلی کبوتروں نے گھونسلا بنا رکھا ہے اور مکڑی نے جالا تن دیا ہے۔ یہ سب دیکھ کر یہ لوگ واپس لوٹ گئے۔ رسول اللہ ﷺ نے پھر ساحل بحر احمر کی سمت سفر کیا اور وہاں سے یثرب (مدینہ) کی طرف جانے والی مرکزی شاہراہ سے کتراتے ہوئے شمال کی جانب روانہ ہوئے۔

ربیع الاول کی بارہویں تاریخ کو دوپہر کے وقت مدینہ کے قریب ایک یہودی نے آپ ﷺ کو ایک تنہا کھجور کے درخت کے نیچے دیکھا جو قبا کے نخلستان میں واقع تھا۔ جمعہ کے دن رسول اللہؐ مدینہ میں داخل ہوئے۔ ایک جگہ آپ ﷺ کی اونٹنی خود بخود رک گئی، اور وہی جگہ پہلی مسجد کی بنیاد بنی۔

مدینہ میں مسلمانوں نے ایک منظم جماعت کی شکل اختیار کی۔ یہیں پر ان اعمال وعبادات کی تصویر گری ہوئی جو ہمیشہ کے لیے دین اسلام کے شعائر بن گئے۔ مسلمانوں کا قبلہ بیت المقدس کے بجائے خانہ کعبہ کر دیا گیا۔ رسول اللہؐ پہلے ہر ماہ تین روزے رکھا کرتے تھے، لیکن اب پورے رمضان کے روزے فرض کر دیے گئے۔ قرآن میں یہ حکم دیا گیا کہ:

> ''اور کھاؤ پیو یہاں تک کہ سپیدہ سحر نمودار ہونے پر تم سفید دھاگہ اور سیاہ دھاگے میں امتیاز کر سکو، پھر رات ہونے تک اپنا روزہ مکمل کرو۔''

قرآن کریم سورۃ الحج (22)، آیت 39 میں اللہ فرماتا ہے:

> ''جن لوگوں سے جنگ کی جا رہی ہے، انہیں (جوابی) جنگ کی اجازت دی گئی، کیونکہ ان پر ظلم کیا گیا، اور بے شک اللہ ان کی مدد پر پوری قدرت رکھتا ہے۔''

مفہوم بالکل واضح ہے کہ جنگ کی اجازت ان لوگوں کو دی گئی ہے جو مظلوم ہیں، نہ کہ ان لوگوں کو جو خود ظلم کی ابتدا کریں۔ اگلی آیت میں بھی اسی بات پر زور دیا گیا ہے۔ قرآن میں بارہا حضرت داؤد

اور جالوت کی مثال دی گئی ہے، اور داؤد کی جنگ کو جہاد کہا گیا ہے۔

اگر مسلمانوں کو جالوت کے خلاف فتح کی شدید ضرورت تھی تو وہ موقعہ پہلی جنگ بدر میں پیش آیا، جب قریش مکہ اپنے اس منصوبہ کے ساتھ بدر کے کنوؤں پر پہنچے کہ رسول اللہ ﷺ اور مسلمانوں کا ہمیشہ کے لیے خاتمہ کر دیں۔

جنگ بدر جمعہ کے دن، رمضان کی سترہویں تاریخ، ہجرت کے دوسرے سال، مدینہ سے تقریباً پچاس میل جنوب مغرب میں واقع ایک نخلستان میں لڑی گئی۔ مسلمانوں کی بڑھتی ہوئی قوت سے خوف زدہ ہو کے قریش نے اپنے نو سو سے زائد بہترین جنگجوؤں پر مشتمل ایک فوج روانہ کی، جس میں سات سو اونٹ اور سو گھوڑے تھے۔ مسلم فوج صرف تین سو افراد پر مشتمل تھی جن کے پاس صرف چار گھوڑے تھے، اور اسلحہ بھی نہایت ناکافی تھا۔

شدید اضطراب میں رسول اللہ ﷺ نے صرف ایک ہی طرف رُجوع کیا، اللہ کی طرف۔ میدانِ بدر کے کنارے ایک چھوٹی سی جھونپڑی میں، جہاں آپ ﷺ حضرت ابوبکرؓ کے ہمراہ قیام پذیر تھے، آپ انتہائی عاجزی اور تضرع کے ساتھ دعا میں مشغول ہو گئے۔ آپ ﷺ بارگاہ الٰہی میں فریاد کرتے ہوئے کہہ رہے تھے کہ اگر آج مسلمانوں کو شکست ہو گئی، تو پھر اس سرزمین پر تیری عبادت کرنے والا کوئی نہ ہوگا۔ حضرت ابوبکرؓ نے آپ ﷺ کو تسلی دی اور عرض کیا: یا رسول اللہ، اب بس کیجیے، آپ ﷺ نے اپنے رب سے دعا کر لی ہے اور وہ یقیناً اپنے بندوں کو ضائع نہیں کرے گا۔ انہوں نے مزید کہا کہ حد سے زیادہ التجا کہیں اللہ کو ناگوار نہ گزرے۔ نبی کریم ﷺ اضطراب اور تھکن کی شدت سے نیم بے ہوش ہو گئے۔ لیکن جب آپ ﷺ نے آنکھیں کھولیں تو چہرے پر بشاشت اور اطمینان تھا۔ آپ کے پاس ایک خوشخبری تھی۔ آپ ﷺ نے بتایا کہ خواب میں حضرت جبرائیلؑ کو دیکھا جو مسلمانوں کی مدد کے لیے آ رہے تھے، اور ان کے گھوڑے کے سُموں سے مٹی کا طوفان اٹھ رہا تھا۔ آپ ﷺ نے صحابہ کرام کو بشارت دی کہ دشمن میدان چھوڑ کر بھاگ گے گا، اور پھر آپ ﷺ نے سورۃ قمر کی ابتدائی آیات تلاوت فرمائیں (آیات 4645):

''عنقریب ان کی جماعت شکست کھا جائے گی، اور وہ پیٹھ پھیر کر بھاگیں گے۔ بلکہ قیامت کی گھڑی ان کے لیے مقرر ہے، اور وہ گھڑی نہایت سخت اور کڑوی ہوگی۔''

آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے اہل یمان سے فرمایا:

''قسم ہے اس ذات کی جس کے قبضے میں محمدؐ کی جان ہے، جو شخص آج میدان میں ثابت قدمی کے ساتھ لڑے گا، پیچھے نہیں ہٹے گا، اللہ اسے جنت میں داخل کرے گا۔''

یہ سن کر حضرت عمیر بن ہمامؓ، جو اس وقت کھجوریں کھا رہے تھے، اُٹھے اور بولے: ''کیا میرے اور جنت کے درمیان صرف اتنا حائل ہے کہ میں ان دشمنوں کے ہاتھوں شہید ہو جاؤں؟'' یہ کہتے ہوئے انہوں نے کھجوریں پھینک دیں، تلوار سنبھالی اور دشمن کے بیچ جا گھسے، یہاں تک کہ شہید ہو گئے۔

جب نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے پوچھا گیا کہ اللہ اپنے بندے سے خوش ہو کر کب ہنستا ہے؟ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا:

''جب بندہ بغیر زرہ کے دشمن کے درمیان کود پڑتا ہے۔''

شہادت مومن کا فریضہ ہے، فتح اللہ کی ذمہ داری ہے۔ جو اللہ کی راہ میں شہید ہوتے ہیں، ان کے لیے جنت کی بشارت ہے۔ جنگ بدر کے فیصلہ کن لمحے میں ایک گرد آلود آندھی اٹھی جو قریش کے چہروں پر چھا گئی، اور اسی وقت حضرت جبرائیلؑ کا گھوڑا چھلانگیں بھر رہا تھا۔ دوپہر تک جنگ ختم ہو چکی تھی۔ قریش کی فوج شکست کھا کر بھاگ چکی تھی۔ مقتولین میں ابوجہل بھی شامل تھا۔

فرشتے مومنوں کے دوست اور محافظ ہیں، خاص طور پر ان کے جو اپنی زندگی کو سچائی اور اللہ کے حکم کے مطابق گزارتے ہیں۔ ان کے لیے جنت کی خوشخبری ہے، جیسا کہ قرآن مجید کی سورۃ حٰم السجدہ (آیت 30) میں فرمایا گیا:

''بے شک جن لوگوں نے کہا: ہمارا رب اللہ ہے، پھر اس پر ثابت قدم رہے، ان پر

فرشتے (وقتاً فوقتاً) نازل ہوتے ہیں اور کہتے ہیں: خوف نہ کرو، غم نہ کرو، بلکہ اس جنت کی خوشخبری لو جس کا تم سے وعدہ کیا گیا ہے۔"

اسلامی کردار کے اعلیٰ نمونے انہی جذبات سے سرشار تھے جن کے نام آج بھی مسلمانوں کے دلوں میں گونجتے ہیں۔ یہی وہ جذبہ تھا جس سے مخمور ہو کر حضرت علیؓ نے خلیفہ دوم حضرت عمرؓ کے ساتھ 642ء میں فارسیوں کے خلاف جنگ نہاوند کے لیے درکار اسلامی فوج کی تعداد پر بات کرتے وقت یہ کہا تھا:

"اے امیر المؤمنین! فتح و شکست کا انحصار تعداد کی کمی یا زیادتی پر نہیں ہوتا۔ یہ اللہ کا دین ہے، جسے اس نے سربلند کیا ہے، اور یہ اس کی وہ فوج ہے جسے اس نے عزت دی ہے اور سرفراز کیا ہے، یہاں تک کہ وہ اس مقام تک پہنچ گیے ہیں۔ اللہ نے ہم سے فتح و نصرت کا وعدہ کیا ہے، اور اللہ اپنے وعدے کو ضرور پورا کرتا ہے۔"

نہاوند کی جنگ میں یقین و ایمان نے عددی برتری کو شکست دی۔ اس جنگ نے ساسانی سلطنت کی کمر توڑ دی۔ اسے اسلامی تاریخ میں "فتح الفتوح" کے نام سے یاد کیا جاتا ہے۔ بلاشبہ بڑی جنگیں بہترین عسکری حکمت عملی کے بغیر جیتی نہیں جاتیں، اور جنگ نہاوند خود اس کی بہترین مثال تھی۔ لیکن جہاد کی اصل روح اللہ پر ایمان کامل ہے، تدبیر اور حکمت عملی کا مقام ثانوی ہے۔

جب حضرت خالد بن ولیدؓ نے ہزاروں میل کا صحرائی سفر طے کر کے بازنطینیوں کو شکست دی اور بیت المقدس کی فتح میں کلیدی کردار ادا کیا، تو ان سے ایک عیسائی عرب نے پوچھا کہ دشمن کی تعداد کیا ہے اور آپ کے ساتھ کتنے عرب سپاہی ہیں، تو حضرت خالدؓ نے جواب دیا:

"افسوس ہے تجھ پر! کیا تو مجھے رومیوں سے ڈرانا چاہتا ہے؟" انہوں نے کہا کہ جیسے ہی میرے گھوڑوں اور اونٹوں کے زخم بھر جائیں گے، میں دوبارہ ان پر حملہ کروں گا، خواہ ان کی تعداد دگنی ہی کیوں نہ ہو جائے۔

اسی طرح، جب سعد بن ابی وقاصؓ نے ٹھاٹھیں مارتے ہوئے دریائے دجلہ میں اپنے گھوڑے ڈال

دیے، تو حیران و پریشان ایرانیوں نے شور مچایا، صرف اتنا کہہ سکے: ''دیوانے! دیوانے! دیوانے! (دیواں آمدند، دیواں آمدند۔ دیو آگیے دیو آگیے) ہم انسانوں سے نہیں، جنون سے لڑ رہے ہیں!''

جان بیگوٹ گلب اپنی کتاب The Great Arab Conquests (پرنٹس ہال انکارپوریشن، انگلےووڈ کلف، نیو جرسی، 1963) میں عرب مجاہدین کو اپنے مخصوص انگریزوں والے انداز میں خراج تحسین پیش کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

> ''انہوں نے اپنے عسکری جذبے اور ذاتی شجاعت پر زیادہ انحصار کیا، جنگی حکمت عملی پر نہیں۔ یہ روایت آج بھی زندہ ہے، اور بسا اوقات مسلمانوں کو اس کا خمیازہ ان دشمنوں کے مقابلے میں بھگتنا پڑا ہے جو پیشہ ور قاتلوں کی طرح جنگ صرف جیتنے کے لیے لڑتے ہیں۔ مسلمان بچہ اپنے رسولؐ کی سیرت اور عرب فتوحات کی داستانوں کے سائے میں پرورش پاتا ہے، اور جنگی مہارت کو پس پشت ڈال کر ذاتی شجاعت کی یہ روایت... آج تک قائم ہے...''

گلب مزید لکھتے ہیں: ''اسلام بنیادی طور پر ایک سپاہی کا مذہب ہے۔''

احادیث کی روایات قرآن مجید کے پیغام کا تکملہ ہیں۔ رسول اللہ ﷺ کی صحبت سے فیض یافتہ صحابۂ کرام سے مروی حضور ﷺ کے اقوال و افعال کو کئی مجموعوں میں محفوظ کیا گیا ہے جنہیں ''حدیث'' یا ''سنت'' کہا جاتا ہے۔ امام احمد بن حنبل (780-885ء) کے متعلق کہا جاتا ہے کہ انہیں دس لاکھ احادیث یاد تھیں۔ احادیث کا سب سے معروف اور معتبر مجموعہ ان کے شاگرد امام محمد بن اسماعیل بخاری نے مرتب کیا، جو 810ء میں وسطی ایشیا کے شہر بخارا میں پیدا ہوئے۔ انہوں نے چھ لاکھ احادیث میں سے تقریباً سات ہزار کو منتخب کیا اور انہیں اپنی الجامع الصحیح للامام البخاری میں درج کیا۔

امام بخاری روایت کرتے ہیں کہ ایک بار حضرت عمرؓ نے رسول اللہ ﷺ سے دریافت کیا کہ کیا یہ بات درست ہے کہ جو مسلمان اللہ کی راہ میں جان دیتا ہے وہ جنت میں جائے گا، اور جو مشرک ہے وہ جہنم میں؟ رسول اللہؐ نے جواب دیا:

''ہاں، اور جان لو کہ جنت تلواروں کے سائے تلے ہے (الجنۃ تحت ظلال السیوف)''

آپ ﷺ نے فرمایا کہ اللہ کے راستے میں جہاد کا ایک لمحہ دنیا اور اس کی تمام نعمتوں سے بہتر ہے، اور جنت میں کمان کے برابر ایک جگہ دنیا اور جو کچھ اس میں ہے، اس سب سے زیادہ قیمتی ہے۔ آپ ﷺ نے یہ بھی ارشاد فرمایا کہ اگر جنت میں کوئی شخص دنیا میں واپس آنے کی خواہش کرے گا، تو صرف اس لیے کہ دوبارہ شہید ہو۔ دنیا میں کوئی عمل ایسا نہیں جو شہادت کے بعد ملنے والے اجر کے برابر ہو۔

رسول اللہ ﷺ نے صحابہ کو فردوس کی دعا کرنے کی تلقین فرمائی، جو جنت کا سب سے اعلیٰ وارفع مقام ہے، اور براہِ راست اللہ کے عرش کے نیچے واقع ہے۔ آپ ﷺ نے فرمایا کہ اللہ نے جنت کے سو درجات صرف شہداء کے لیے مخصوص فرمائے ہیں۔ قیامت کے دن ان کے جسم سے بہنے والا خون مشک کی مانند خوشبو دے گا، اور اللہ کے اجر دینے میں کوئی بھی چیز حائل نہیں ہوگی

اسلام کے بنیادی اصول بالکل واضح ہیں:
لَآ إِكْرَاهَ فِي الدِّينِ (دین میں کوئی جبر نہیں)۔
لَكُمْ دِينُكُمْ وَلِيَ دِين (تمہارا دین تمہارے لیے اور میرا دین میرے لیے)۔

تاہم، جب مسلمان مدینہ میں ایک منظم جماعت بن گئے تو انہوں نے ظالموں کے سامنے اپنا دوسرا گال پیش کرنے کی روایت ترک کر دی۔ اب موت ان کے لیے بڑی چیز نہ رہی بلکہ شہادت کا ذریعہ بن گئی۔ یہی ہے اسلام کی خوبی اور اس کے امیان کی حقیقت۔ یہی ہے وہ ایمان جو ایک ماں اپنے بیٹے کے کان میں پھونکتی ہے۔ اللہ تعالیٰ نے مومنوں سے ایک سودا کیا ہے۔ جہاد کا سودا، جو مدینہ میں ہوا تھا۔

2

# موت کے بدلے جنت: اللہ سے ایک سودا

قرآن مجید اہل ایمان سے کہتا ہے:

> ''تم بہترین امت ہو جو لوگوں کے فائدے کے لیے بھیجی گئی ہے، جو نیکی کا حکم دیتی ہے اور برائی سے روکتی ہے، اور اللہ پر ایمان رکھتی ہے۔''

(سورۃ آلِ عمران، آیت 110)

اور سورۃ توبہ، آیت 111 میں اعلان ہوتا ہے:

> ''یقیناً اللہ نے مؤمنوں سے ان کی جان اور مال خرید لیے ہیں، ان کے لیے جنت کے بدلے۔ وہ اللہ کے راستے میں لڑتے ہیں، قتل کرتے ہیں اور قتل کیے جاتے ہیں... یہ ایک سچا وعدہ ہے، جو اللہ نے تورات، انجیل اور قرآن میں کیا ہے۔ اور اللہ سے بڑھ کر اپنے وعدے کو پورا کرنے والا کون ہے؟ تو خوش ہو جاؤ اس سودے پر جو تم نے اللہ سے کیا، یہی سب سے بڑی کامیابی ہے۔''

صحرا میں سورج یوں غروب ہوتا ہے جیسے اس کو گہن لگ گیا ہو، اس کے بالائی حصے پر ہیرے کی انگوٹھی جیسا ہالہ یوں چمکتا ہے جیسے کسی پتھر کو آگ پر پگھلایا جا رہا ہو۔ سطحِ افق پر روشنی یوں پھیلتی ہے جیسے کسی جگمگاتے ہوئے ہیرے کے دونوں طرف روشنی کی لہر اٹھ رہی ہو، ایسی روشنی جو جانا نہیں چاہتی۔ بائیں جانب شام کے دھندلکے میں ایک باریک سا چاند نمودار ہو چکا ہے۔ ابھی ستاروں کا طلوع ہونا باقی ہے۔ جیسے ہی ہمارا طیارہ مدینہ میں نیچے اترنے لگا، مجھے نیچے مسجدِ نبویؐ کے چھ مینار جھلملاتے

ہوئے نظر آئے، جیسے اس دنیا کے اندر ایک اور دنیا کی پہرہ داری کر رہے ہوں۔ دنیا میں چھ میناروں والی دوسری واحد مسجد 1609ء میں سلطان احمد نے قسطنطنیہ (استنبول) میں تعمیر کروائی تھی۔

مدینہ میں مسجد نبوی کی پہلی اینٹ خود رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے اپنے دست مبارک سے رکھی تھی۔ مدینہ ہی میں رسول اللہؐ پر وحی نازل ہونے لگی یہیں پر ہجرت کے سترہویں مہینے میں اللہ تعالیٰ نے بیت المقدس سے مکہ کی طرف تحویل قبلہ کا حکم نازل فرمایا۔ یہیں لوگوں نے آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے بیعت کی، اور یہیں آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے امت کو منظم کیا، قانون دیا، تربیت فرمائی، اور پھر بکھری ہوئی جماعت کو ایک متحد اُمّت میں بدل دیا۔ یہی وہ مسجد ہے جہاں آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا وصال ہوا اور جہاں آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم مدفون ہیں۔ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے پہلو میں دو جلیل القدر خلفائے راشدین حضرت ابوبکر صدیقؓ اور حضرت عمر فاروقؓ کی قبریں بھی واقع ہیں۔

ایک نہایت سادہ آغاز سے بننے والی یہ مسجد، آج چودہ سو سال کی عقیدت و محبت کی بدولت ایک عظیم الشان مسجد بن گئی ہے۔ لیکن عجیب بات یہ ہے کہ اس شان و شوکت کے باوجود، اس کی اصل سادگی، اس کی روحانی کیفیت، آج بھی پوری طرح موجود ہے۔

پہلی اذان فجر کی نماز سے تقریباً ایک گھنٹہ قبل صبح کی ٹھنڈی فضاؤں میں گونجتی ہے۔ یہ اذان ان لوگوں کے لیے ہے جو فرض نماز کے مقررہ وقت سے پہلے ہی اللہ کی عبادت میں مصروف ہو جاتے ہیں۔ مدینہ اوبرائے ہوٹل کے میرے کمرے سے ایک بہت ہی خوش نما منظر دکھائی دیتا ہے: مسجد نبویؐ کا مربع صحن، جہاں سال کے ہر دن، دنیا کے ہر براعظم سے آئے ہوئے مسلمان موجود ہوتے ہیں۔ مرد و خواتین، جو پورے اطمینان اور سکون کے ساتھ اپنے رب کی عبادت کے لیے اس مبارک مسجد میں آتے ہیں۔

میناروں کے پیچھے سے جاگتا ہوا آسمان تاریک پہاڑوں پر جیسے کوئی نقش کھینچ رہا ہو۔ مرد حضرات سادہ کاٹن کے ٹخنوں تک کے ڈھیلے ڈھالے پائجامے یا چوغے پہنے ہوتے ہیں، جب کہ عورتیں سر سے پاؤں تک پردے میں ملبوس ہوتی ہیں۔ یہاں عورتیں اپنا چہرہ نہیں چھپاتی ہیں۔ بعض خواتین کے بلند و باوقار چہرے سیاہ چادروں کی اوٹ سے یوں جھانکتے ہیں جیسے وہ چیلنج کر رہے ہوں کہ ہمیں کم تر سمجھنے کی جسارت نہ کرنا۔

ہم فجر کی نماز کے لیے باب جبرئیلؑ میں داخل ہوتے ہیں۔ حضرت جبرئیلؑ کو روح القدس کہا جاتا ہے۔ تقریباً سات لاکھ سے زائد مؤمنین ایک امام کے پیچھے اللہ کے حضور سجدہ ریز ہونے کے لیے صف بستہ ہو جاتے ہیں۔ عورتوں کے لیے ایک وسیع جگہ مختص کر دی گئی ہے۔ نماز کے بعد عقیدت مندوں کی توجہ کا مرکز رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا روضہِ مبارک ہو جاتا ہے۔ آہستہ آہستہ سرکتی قطار میں کھڑے زیارت کے مشتاق اور فرطِ محبت سے لبریز زائرین دیدار کے لیے آگے بڑھ رہے ہیں۔ حالانکہ یہ شعبان کا مہینہ ہے، جب نسبتاً بھیڑ کم ہوتی ہے۔ اگلا مہینہ رمضان کا مقدس مہینہ ہے جس میں زائرین کی تعداد کئی گنا بڑھ جاتی ہے۔ تیس دن کا یہ مقدس مہینہ دنیا بھر کے مسلمانوں کو کسی روحانی مقناطیس کے ذریعہ مکہ اور مدینہ کی طرف کھینچ لاتا ہے۔ حج کے ایام میں یہ اجتماع اپنے نقطۂ عروج پر ہوتا ہے۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے شہر مدینہ کی زیارت عموماً مسلمان اس وقت کرتے ہیں جب وہ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی جائے ولادت مکہ مکرمہ میں خانہ کعبہ کی حاضری دے چکے ہوتے ہیں۔ لیکن میں اس وقت حج پر نہیں ہوں۔ کیونکہ حج صرف قمری کیلنڈر کے بارہویں مہینے، ذوالحجہ کی آٹھویں، نویں اور دسویں تاریخوں کو ہی ادا کیا جا سکتا ہے۔ میں عمرہ پر ہوں۔ جسے چھوٹا حج کہا جاتا ہے، جو سال کے کسی بھی وقت ادا کیا جا سکتا ہے۔ اگرچہ عمرہ باعث اجر ہے، مگر یہ نہ تو حج کے برابر ہے اور نہ ہی اس کا متبادل۔ حج ہر اس مسلمان پر فرض ہے جو مالی اور جسمانی طور پر اس کی استطاعت رکھتا ہو۔

ایک مسلمان کے لیے خانہ کعبہ کے پہلے دیدار جیسا کوئی جذباتی لمحہ نہیں ہوتا، اور نہ ہی اس احساس کے برابر کوئی کیفیت ہے جب وہ اپنی پیشانی زمین پر رکھ کر اللہ کے سامنے سربسجود ہوتا ہے۔ نماز کے اس جسمانی عمل میں ایمان کی قوت، خودسپردگی کی طاقت اور زندگی کی وقعت اور بے وقعتی دونوں سمٹ آتی ہیں۔

کعبہ کی طرف روانگی سے قبل حاجی غسل کرتا ہے، دو رکعت نفل پڑھتا ہے، اور پھر احرام باندھتا ہے: سفید، بغیر سلی ہوئی، دو چادریں، جو ایک درویش کی دنیا سے آزادی کا جامہ بن جاتی ہیں۔ اس کے بعد نیت کی دعا پڑھی جاتی ہے، جس میں اللہ سے اس عبادت کو قبول کرنے کی التجا کی جاتی ہے، پھر وہ

لمحہ آتا ہے جب لبیک کی روح جاگتی ہے، اور اللہ واحد کی حمد و ثنا کے ترانے گونجتے ہیں۔

اسلامی دنیا بغیر کسی توقف کے خانہ کعبہ کے گرد طواف میں گھومنے لگتی ہے۔ رمضان میں، خاص طور سے ایام حج میں، لوگوں کا ہجوم اس قدر بڑھ جاتا ہے کہ کیمرہ بھی برادرانہ ہجوم میں سے کسی فرد واحد کو شناخت کرنے سے عاجز ہو جاتا ہے۔ صرف ڈیوٹی پر مامور محافظوں کے چہروں پر تھکن کے آثار نظر آتے ہیں، لیکن نماز کے لیے جیسے ہی اذان کی صدا بلند ہوتی ہے، وہ بھی یک لخت بدل جاتے ہیں۔ لوگ بغیر کسی محنت و مشقت کے فوراً ہی صف بستہ ہو جاتے ہیں۔ ایک دوسرے کے پہلو میں، پھر پیچھے۔ یہاں کوئی کسی کا آقا نہیں سوائے اللہ کے۔ باقی سب برابر ہیں۔

وہ خود کو بڑا خوش نصیب سمجھتے ہیں جو اس گھر کی ان دیواروں کو چھو پاتے ہیں جس میں حضرت ابراہیم علیہ السلام نے حجر اسود نصب کیا ہے۔ مسلمانوں کے عقیدے کے مطابق انسانوں کے لیے قائم کیا گیا یہ پہلا مقام عبادت ہے- خانہ کعبہ کے باہر ہی، اب شیشے میں محفوظ، وہ مقام ابراہیم بھی ہے جو تینوں مذاہب (اسلام، عیسائیت اور یہودیت) کے جد امجد، حضرت ابراہیمؑ کے قدموں کا نشان ہے۔ وہاں سے چند قدم کے فاصلے پر صفا اور مروہ کی پہاڑیاں ہیں، جن کے درمیان حضرت ہاجرہؓ نے اپنے بیٹے اسماعیلؑ کے لیے پانی کی تلاش میں دوڑ لگائی تھی، یہاں تک کہ حضرت جبرائیلؑ نے انہیں زمزم کے چشمے کو دکھا دیا۔ مسلمان حضرت ہاجرہ کی اسی بے قراری کی دوڑ کو یاد کرتے ہوئے ان دونوں پہاڑیوں کے درمیان سات چکر لگاتے ہیں، اور اسی آب زمزم سے اپنی پیاس بجھاتے ہیں، وہ چشمہ زمزم جو اب کبھی خشک نہیں ہوگا۔

مقدس مقامات سے آگے مکہ اور مدینہ کا منظر کچھ اور ہی ہے، جہاں پہلی دنیا (فرسٹ ورلڈ) کے سامان، اعلیٰ درجے کے کھانے، اور تیسری دنیا (تھرڈ ورلڈ) جیسا ماحول آپس میں گھل مل جاتے ہیں۔ مدینہ کی گلیاں اب دکانوں کا ایک جال بن چکی ہیں، جو زائرین کی خریداری سے اچھا خاصہ منافع کما رہی ہیں۔ مسجد نبویؐ کے اطراف میں سونے کے زیورات سے سجی دکانیں ہیں، جہاں دکاندار کریڈٹ کارڈ کی جگہ نقد رقم کو ترجیح دیتے ہیں، اور ڈالر کو ہر کرنسی پر فوقیت دیتے ہیں۔ مصروف مہینوں میں مسجد کے ہر دروازے پر انسانی بھیڑ ہوتی ہے۔ گلیوں میں برقع پوش عورتیں رنگ برنگی،

چمکدار عربی چادریں بیچتی دکھائی دیتی ہیں۔ کہیں کہیں موٹے شیشوں والی عینک لگائے مرد کپڑے کی گٹھڑیاں اور مولینو برانڈ کے بکھرے برتنوں کے بیچ بیٹھے ہوئے گپ شپ میں مصروف، اپنی عورتوں کا انتظار کر رہے ہوتے ہیں جو اپنے پہلے اور شاید آخری غیر ملکی سفر سے تحفے اور ضرورت دونوں کا سامان لیے واپس لوٹیں گی۔

یہاں ہر بجٹ کے مطابق کھانے پینے کے سامان اور ہوٹل موجود ہیں۔ میکڈونلڈ کے برگرز کی مسکراہٹ دونوں شہروں میں تلاش کرنا مشکل نہیں، اور مسجد قبا کے داخلی دروازے پر کوک کے ساتھ ساتھ دینی کیسٹیں بھی فروخت ہوتی ہیں۔

قُبا وہ مقام ہے جہاں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے مدینہ جاتے وقت اس شہر کے مضافات میں کچھ دنوں کے لیے قیام فرمایا تھا۔ آج یہ جگہ اس بڑے شہر کا حصہ بن چکی ہے جو غالباً پچھلے تیس برسوں میں اتنا بدل چکا ہے جتنا وہ پچھلے تین سو سال میں نہیں بدلا تھا۔

سب سے پہلے آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو دیکھنے والا شخص ایک یہودی تھا، جس نے یہ خوشخبری ان مسلمانوں کو دی جو آپ سے قبل مدینہ پہنچ چکے تھے اور بے چینی سے آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی آمد کا انتظار کر رہے تھے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم پیر کے دن، بارہ ربیع الاول کو، دوپہر کے وقت مدینہ پہنچے۔ میزبان بننے کے لیے شور وشوق کا ایک فطری ہجوم تھا۔ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے اپنی اونٹنی، جس کا نام ابن الردا تھا، کی لگام چھوڑ دی اور اسے آزاد چھوڑا کہ وہ جہاں رکنا چاہے رک جائے۔ آخر کار وہ ایک ایسی جگہ آ کر بیٹھ گئی جو دو یتیم بچوں کی ملکیت تھی، اور عام طور پر وہاں کھجوریں سکھائی جاتی تھیں۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے وہ جگہ قیمت دے کر خریدی اور وہاں مسجد تعمیر کرنے کا حکم دیا۔

آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے بذات خود مہاجرین اور انصار کے ساتھ مسجد کی تعمیر میں حصہ لیا، تعمیر کرتے وقت انصار و مہاجرین یہ شعر پڑھ رہے تھے:

لئن قعدنا والنبی یعمل

لذاك منا العمل المضلل

ترجمہ:

اگر ہم بیٹھے رہیں اور نبی کام کر رہے ہوں
تو یہ ہماری طرف سے گمراہ کن عمل ہو گا

آج اسی مقام پر جہاں اونٹنی بیٹھی تھی، ایک بڑی سی قندیل آویزاں ہے، اس کے سامنے منبر ہے، اور اس کے پیچھے عظیم الشان مسجد قُبا ہے۔ رسول اللہ ﷺ کو یہ مسجد اس قدر عزیز تھی کہ آپ ﷺ گاہے بگاہے یہاں سواری پر اور کبھی پیدل تشریف لاتے۔ آپ ﷺ نے فرمایا کہ یہاں دو رکعت نماز ادا کرنا ایک عمرے کے برابر ہے۔

مدینہ آنے والا کوئی زائر اس میدان اُحد کی زیارت کیے بغیر نہیں جاتا جہاں ایک فیصلہ کن جنگ لڑی گئی تھی۔ ہماری گاڑی درجنوں بے ترتیب کھڑی سیاحتی بسوں کے بیچ، تیراندازوں کے ٹیلے کے قریب جا کر رک گئی۔ یہی وہ مقام تھا جہاں رسول اللہ ﷺ نے ایک بلند ٹیلے پر پچاس تیرانداز متعین فرمائے تھے تاکہ وہ عقب سے فوج کی حفاظت کریں، جبکہ میدان جنگ پہاڑی اور ٹیلے کے دمیان کی ہموار زمین پر تھا۔

بہت سارے مسلمان یہ دیکھ کر محو حیرت ہو جاتے ہیں کہ میدانِ اُحد کا بیشتر حصہ اب ایک رہائشی کالونی میں تبدیل ہو چکا ہے۔ کالونی بسانے کا یہ فیصلہ ایک دانستہ فیصلہ تھا۔ یہ کوئی کچی بستی نہیں ہے جو ناجائز قبضہ کر کے بنا دی گئی ہو، بلکہ اصلاح پسند سعودی حکومت کی ایک دانستہ پالیسی ہے، جس کا مقصد ان مقامات کی تعظیم کو کم کرنا ہے جن کا تعلق رسول اللہ ﷺ کی حیات مبارکہ سے رہا ہو۔

اس کی وضاحت یوں کی جاتی ہے کہ عبادت صرف اللہ کی ہونی چاہیے، نہ کہ محمد ﷺ کی، نہ اس کے رسولؐ کی اور نہ کسی انسان کی۔ ایک وقت وہ بھی تھا جب مدینہ کی مسجد میں، محمد ﷺ کے روضہ مبارک پر زیادہ دیر تک بیٹھنے والوں کو وہاں کے محافظ کوڑے مار کر ہٹایا کرتے تھے۔ اگرچہ اب یہ سختی نسبتاً کم ہو چکی ہے، لیکن یہ یقینی بنایا جاتا ہے کہ زائرین کی قطار تیز رفتاری سے آگے بڑھے، اور وہاں کوئی ایسا انداز تعظیم یا عقیدت نہ ہو جو عام طور پر دیگر مسلم تہذیبوں میں دیکھنے کو ملتا ہے۔

یہی وجہ ہے کہ اُحد کے بڑے حصہ میں رہائشی کالونیاں بن چکی ہیں۔ البتہ 65 شہداء کی قبروں کو جوں کا توں برقرار رکھا گیا ہے، ان قبروں کے گرد ایک دیوار کھڑی کردی گئی ہے جو زائرین کی دست برد سے اس کی حفاظت کے لیے بنائی گئی ہے۔ دیوار پر لگے ہوئے بنگلہ، اردو اور انگریزی زبانوں میں لکھے نوٹس اس بات کی وضاحت کرتے ہیں کہ اسلام آپ کو آپ کے اکابر اور شہداء کی قبور کی زیارت کی اجازت دیتا ہے کیونکہ یہ آخرت کی یاد دلاتی ہیں، لیکن دعا صرف اللہ سے کی جاسکتی ہے، کسی ولی، شہید یا نبی سے نہیں، حتیٰ کہ ان سے اللہ کے حضور سفارش کی درخواست بھی نہیں کی جاسکتی۔

ان شہداء کی قبریں اسلامی تاریخ کی سب سے زیادہ طاقتور داستان بیان کرتی ہیں۔

قریش غزوۂ بدر میں اپنی شکست کو کبھی دل سے تسلیم نہ کرسکے۔ وہ اسے محض ایک تکا لگ جانا سمجھتے رہے۔ جنگ بدر میں ابوجہل جیسے بڑے سردار کے مارے جانے کے بعد، ابوسفیان قریش کا نیا سردار بن کر ابھرا۔ اس کی تیز طرار بیوی ہندہ، بھی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم سے نفرت کرتی تھی، اور بدر میں اپنے والد اور دو بیٹوں کی ہلاکت نے اس کی دشمنی کو مزید بڑھا دیا تھا۔ اس نے اس وقت تک اپنے شوہر کے ساتھ سونے سے انکار کردیا تھا جب تک بدر کا بدلہ نہ لیا جائے۔ چنانچہ ابوسفیان نے پوری احتیاط کے ساتھ جنگ کی منصوبہ بندی شروع کردی۔

ادھر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم نے جلد ہی اپنے نئے وطن مدینہ کی باگ ڈور اپنے ہاتھوں میں لے لی۔ آپ صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم نے مدینہ میں آباد یہودیوں، بت پرستوں اور مسلمانوں کے درمیان ایک معاہدہ یا میثاق کے ذریعہ اتحاد پیدا کیا، جس میں باہمی مساوات، اور کسی بھی قوم پر حملے کی صورت میں مشترکہ دفاع کی ضمانت دی گئی تھی۔ اس معاہدے کے مطابق، کسی بھی اختلاف کی صورت میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کو حکم بنایا جانا تھا۔ لیکن یہ میثاق عملی کسوٹی پر پورا نہ اتر سکا۔ اس کی کئی وجوہات تھیں۔ سب سے چھوٹی وجہ حسد اور سب سے بڑی وجہ غداری تھی۔ ابوسفیان نے مدینہ پر حملے سے قبل کم از کم ایک یہودی قبیلہ بنونضیر سے خفیہ روابط استوار کیے۔ قبیلے کے سردار سلام بن مشکم نے اس کی بڑی آؤ بھگت کی۔ ابوسفیان چاہتا تھا کہ قریش کو مدینہ میں ایک متحد محاذ کا سامنا نہ کرنا پڑے، اسے پورا بھروسہ تھا کہ کچھ ایسا ہی ہوگا۔

اس کے اعتماد کی ایک وجہ یہ بھی تھی کہ مسلمانوں کا بدترین دشمن کعب بن اشرف اسی قبیلے کا ایک فرد تھا۔ وہ ایک شاعر تھا، جو اپنے پرجوش اشعار کے ذریعے قریش میں انتقام کی آگ بھڑکاتا تھا۔ قریش نے ایک سال تک جنگ کی تیاری کی، اور ایک تجارتی قافلے کی پوری دولت اس مقصد کے لیے مختص کر دی گئی۔ مدینہ کی طرف پیش قدمی کرنے والے لشکر کی تعداد تین ہزار تھی، جن کے ساتھ تین ہزار اونٹ اور تقریباً دو سو گھوڑے تھے۔ وہ فتح کے لیے اس قدر پر اعتماد تھے کہ عورتوں کو بھی ساتھ لے گئے۔ ان عورتوں میں ہندہ بھی تھی، جو سب سے بڑھ چڑھ کے قریشی فوجیوں کو جوش دلا رہی تھی۔ اس نے قسم کھا رکھی تھی کہ وہ اسلام کے عظیم سپاہی اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے چچا حضرت حمزہ کا جگر چبا کر کھائے گی۔

جب قریش مدینہ کے قریب پہنچے تو مسلمانوں کو ان کی آمد کی خبر ہوئی۔ قریش کا مقابلہ کس طرح کیا جائے، اس کے بارے میں مسلمانوں میں اختلاف پیدا ہوا۔ جوشیلے صحابہ چاہتے تھے کہ بدر کی طرح اس بار بھی مدینہ سے باہر نکل کر جنگ کی جائے، خواہ ان کی تعداد کم ہو یا اسلحہ ناکافی، جب کہ دیگر صحابہ اسے خودکشی قرار دے رہے تھے۔ اس کے برعکس قریش کا موقف بالکل واضح تھا۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا قتل اور اسلام کی مکمل بیخ کنی۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے بالآخر چھ شوال کو جمعہ کے دن زرہ زیب تن فرمائی اور فیصلہ کیا کہ اگلے دن قریش کا مقابلہ احد کے مقام پر کریں گے، احد مدینہ سے تین میل شمال میں واقع ہے۔ شام تک تذبذب برقرار رہا، مگر جیسا کہ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا: لَا يَنْبَغِي لِنَبِيٍّ إِذَا لَبِسَ لَأْمَتَهُ أَنْ يَضَعَهَا حَتَّى يُقَاتِلَ (نبی جب ایک بار زرہ پہن لے تو پھر اسے نہیں اتارتا)۔

یہود نے میثاق مدینہ کی پاسداری نہیں کی۔ انہوں نے یہ عذر پیش کیا کہ وہ ہفتے کے دن (یعنی سنیچر کو) جنگ نہیں لڑیں گے۔ صورتحال مزید سنگین ہوگئی۔ رسول اللہؐ کے زیر کمان صرف ایک ہزار مجاہدین تھے۔ ان میں سے تین سو منافقین نے اپنے لیڈر عبداللہ بن اُبی کے کہنے پر جنگ کی صبح ہی میدان چھوڑ دیا، عبداللہ بن اُبی اس خام خیالی میں مبتلا تھا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی شکست کے بعد وہ مدینہ کا بے تاج بادشاہ ہو جائے گا۔ یہ گروہ تاریخ میں ''منافقین'' کے نام سے معروف ہوا، اور یہ غداری اس

سے زیادہ خراب وقت میں نہیں ہو سکتی تھی۔

قریش کی فوج کی قیادت ابو سفیان کر رہا تھا، اس کے دائیں جانب خالد بن ولید تھے اور بائیں طرف ابو جہل کا بیٹا عکرمہ تھا۔ جنگ شروع ہونے سے پہلے، ابو سفیان نے مسلمانوں کے اتحادی اوس اور خزرج کے قبائل سے کہا کہ وہ میدان چھوڑ دیں کیونکہ قریش کا ان سے کوئی لینا دینا نہیں ہے۔ ان قبائل نے اسے اس کا بہت سخت جواب دیا۔

قریش کا حوصلہ بلند تھا، اور اسے مزید تقویت ہندہ کی موجودگی سے ملی، جو دف کے ساتھ گاتے ہوئے کہہ رہی تھی:

نَحْنُ بَنَاتُ طَارِقِ
نَمْشِي عَلَى النَّمَارِقِ
إِنْ تُقْبِلُوا نُعَانِقِ
أَوْ تُدْبِرُوا نُفَارِقِ

(اگر تم آگے بڑھو گے تو ہم تمہیں گلے لگائیں گے اور تمہارے لیے نرم قالین بچھائیں گے، اگر تم پیچھے ہٹو گے تو ہم تمہیں چھوڑ دیں گے اور اپنی محبت سے محروم کر دیں گے)۔

واقعی ہندہ نے پچھلے ایک سال سے اپنے شوہر ابو سفیان سے منہ موڑا ہوا تھا۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے پچاس تیر اندازوں کو عقب میں ایک پہاڑی ٹیلے پر متعین کیا اور سختی سے حکم دیا کہ میدان جنگ میں جو کچھ بھی پیش آئے وہ کسی بھی حال میں اس ٹیلے سے نہیں ہٹیں گے۔ باقی لشکر بدر کی ترتیب پر دشمن کے سامنے صف آراء ہو گیا۔

مسلمانوں نے جنگ کے ابتدائی مرحلے میں زبردست برتری حاصل کر لی، اور یہی ان کی کمزوری بن گئی۔ جب تیر اندازوں نے سمجھا کہ فتح ہو چکی ہے، تو انہوں نے نبیؐ کے حکم کی خلاف ورزی کرتے ہوئے مال غنیمت کے شوق میں اپنی جگہ چھوڑ دی۔ خالد بن ولید نے موقع کو غنیمت جانا اور اپنے گھڑ سواروں کے ساتھ ایک زبردست حملہ کیا، جس نے جنگ کا پانسہ پلٹ دیا، گرچہ آخر میں دست

بدست لڑائی بھی لڑی گئی۔

جب مسلمان پسپا ہو گئے تو کسی نے یہ صدا بلند کر دی کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم شہید ہو گئے ہیں۔لیکن یہ خبر غلط تھی ... آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم صرف زخمی ہوئے تھے اور آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا ایک دندان مبارک شہید ہو گیا تھا۔اسی موقع پر یہ مشہور آیت نازل ہوئی:

وَ مَا مُحَمَّدٌ اِلَّا رَسُوۡلٌ ۚ قَدۡ خَلَتۡ مِنۡ قَبۡلِهِ الرُّسُلُ ؕ اَفَا۟ئِنۡ مَّاتَ اَوۡ قُتِلَ انۡقَلَبۡتُمۡ عَلٰۤى اَعۡقَابِكُمۡ ؕ۔
محمد تو ایک رسول ہی ہیں، ان سے پہلے بھی بہت سے رسول گزر چکے ہیں۔اگر وہ وفات پا جائیں یا قتل کر دیے جائیں تو کیا تم الٹے پاؤں پھر جاؤ گے؟ (سورۃ آل عمران، آیت 144) رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے مسلمانوں کو از سر نو منظم کیا، اور شکست کو مکمل تباہی سے بچا لیا۔

ابوسفیان خود رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے جلو میں موجود مسلمانوں کے قریب اس نیت سے گیا کہ وہ اس بات کی تصدیق کر سکے کہ کیا ابن قمیہ کی یہ بات صحیح ہے کہ قریش نے واقعی نبی اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو شہید کر دیا ہے؟ عمرؓ نے جواب دیا: ''خدا کی قسم، ایسا نہیں ہوا۔ وہ (نبی اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) تمہاری باتیں اس وقت سن رہے ہیں۔'' ابوسفیان نے مسلمانوں کی لاشوں کی بے حرمتی پر افسوس کا اظہار کیا، مگر مکہ کی طرف واپس ہوتے ہوئے یہ بھی کہہ گیا: اگلے برس بدر میں دوبارہ ملاقات ہوگی۔قریش نہ وہ مقصد حاصل کر سکے جس کے لیے وہ نکلے تھے، اور ان کی ساکھ بھی بری طرح داغدار ہو گئی تھی۔

لاشوں کی بے حرمتی پر ابوسفیان کی معذرت کی ایک وجہ بھی تھی، کیونکہ اس کی اہلیہ اس بے حرمتی کی براہِ راست ذمہ دار تھی، اسے تو حضرت حمزہؓ کا جگر چبانے کا کیا گیا اپنا عہد پورا کرنا تھا۔ایک حبشی غلام، وحشی، جو نیزہ پھینکنے کا ماہر تھا، اس کی خدمات اس وعدہ پر حاصل کی گئیں کہ اگر وہ حمزہؓ کو قتل کر دے گا تو اس کا آقا جبیر اسے آزاد کر دے گا۔جب اس نے اپنا کام کر لیا، تو فوراً میدان جنگ سے ہٹ گیا۔اس کا مشن پورا ہو چکا تھا۔قریش کی عورتوں نے جس وحشیانہ طریقے سے لاشوں کی بے حرمتی کی، اس پر خود قریش کے لوگوں نے شرمندگی ظاہر کی۔ ہندہ نے تو حد ہی کر دی، اس نے حضرت حمزہؓ کا جگر چاک کیا اور اسے چبا گئی۔

غزوۂ بدر کو فرقان کہا جاتا ہے، یعنی سچائی اور برائی کا پہلا فیصلہ کن امتحان۔ مگر غزوۂ احد سے بھی بہت کچھ سبق سیکھے جا سکتے ہیں... ایک آزمائش کا، امتحان کا دن، ایک جہاد جس کا نتیجہ پسپائی میں نکلا، قرآن کی تیسری سورۃ آل عمران کی وہ آیات جن میں مسلمانوں کے لیے بہت سے سبق موجود ہیں اور جن کی غیر معمولی معنویت آج بھی اسی طرح برقرار ہے، خاص طور پر اس وقت جب مسلمان خود کو فاتح کے بجائے مظلوم سمجھنے لگیں۔

قرآن کہتا ہے کہ کامیابی اور ناکامی دونوں اللہ کی طرف سے آتی ہیں، اور دونوں کے کچھ اسباب ہوتے ہیں۔ کامیابی پر اترانا اور ناکامی پر مایوس ہونا دونوں بے معنی ہیں، کیونکہ دونوں اللہ کے منصوبے کا ایک حصہ ہیں۔ ایک مومن کا اصل امتحان تو مصیبت کے وقت ہی ہوتا ہے، جب بندہ صبر کرے، جد و جہد کرے اور ایمان پر قائم رہے۔ گناہوں کی تطہیر بھی اسی مجاہدے سے ہوتی ہے اور ویسے بھی شہادت سے بڑھ کر کوئی اور چیز نہیں۔ کبھی کبھی کافر کی وقتی جیت خود اس کے گلے کا پھندہ بن جاتا ہے جس سے وہ خود کو لٹکا دیتا ہے۔ قریش نے اُحد کی جنگ میں لاشوں کو مسخ کر کے اپنے ہاتھوں اپنی ہی عزت خاک میں ملا دی، اپنے لوگوں کو بدظن کیا، اور جو انجام کار اسلام کی فتح کا پیش خیمہ بن گئی۔

قرآن کہتا ہے (آلِ عمران 3:139): ''تم ہمت نہ ہارو، اور نہ غم کرو، تم ہی غالب ہو گے اگر تم ایمان والے ہو۔''

یعنی غلبہ اور احیاء تو تمہارا مقدر ہیں اگر تم سچے ایمان والے ہو۔ ''اللہ کا مقصد بھی یہی ہے کہ اہلِ ایمان کو پاک کرے، اور منکروں کو محروم کرے۔ کیا تم یہ سمجھتے ہو کہ جنت میں یوں ہی داخل ہو جاؤ گے، جب تک اللہ ان لوگوں کو جانچ نہ لے جو اس کی راہ میں جہاد کرتے ہیں اور صبر کے ساتھ ڈٹے رہتے ہیں؟'' (آیات 142-141)

نبی اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے اُحد کے زخموں کو پیچھے چھوڑا، اور پھر اسلام نے کبھی پیچھے مڑ کر نہیں دیکھا۔

مسلمانوں کو اس جنگ میں شکست کیوں ہوئی؟ کیوں کہ وہ دنیا کے مال و متاع اور مالِ غنیمت کی حرص میں مبتلا ہو گئے۔ ''اللہ نے بے شک تم سے کیا گیا وعدہ پورا کر دکھایا، جب تم اس کے حکم سے

دشمنوں کو زیر وزبر کر رہے تھے، یہاں تک کہ تم نے کمزوری دکھائی، اور فرمان نبوی کے بارے میں آپس میں اختلاف کیا، اور نافرمانی کی، اس کے بعد کہ اس چیز کو تم نے دیکھ لیا جس کی تمہیں خواہش تھی (یعنی مال غنیمت)۔ تم میں کچھ لوگ دنیا کے خواہش مند تھے اور کچھ آخرت کے طلب گار۔ پھر اس نے تمہیں دشمنوں سے پھیر دیا تاکہ وہ تمہیں آزمائے، اور اس نے تمہیں معاف کر دیا۔ بے شک اللہ ایمان والوں پر بڑا مہربان ہے'' (سورۃ آل عمران، آیت 152)۔ پھر آیت 166 میں فرمایا:

''جو کچھ تم پر گزرا اس دن جب دونوں لشکر آپس میں ٹکرائے، وہ اللہ کے حکم سے تھا تاکہ وہ ایمان والوں کو آزمائے۔''

اور شہداء کے بارے میں فرمایا: ''جو لوگ اللہ کی راہ میں قتل کیے گئے، انہیں مردہ نہ سمجھو۔ وہ زندہ ہیں، اپنے رب سے رزق حاصل کر رہے ہیں۔''

اور جو زندہ بچے، ان کے لیے اس شکست کا مطلب جنت کا مؤخر ہونا ہے، بشرطیکہ وہ ایمان پر ثابت قدم رہیں۔ فتح کے بعد ایمان پر قائم رہنا آسان ہے، لیکن شکست کے بعد بھی ثابت قدم رہنا ایمان کی مضبوطی کی علامت ہے۔ یہی ایمان حیات نو کا معجزہ بن جاتا ہے، اور نئی کامیابی کا مژدہ سناتا ہے۔

جنگ احد کے بعد یہی سب ہوا۔ رسول اللہ ﷺ زخمی ہوئے، صحابہ کرام بھی زخمی ہوئے، لیکن انہوں نے اپنی قوت کو دوبارہ جمع کیا، اس اعتماد کے ساتھ کہ نہ تو ان کی کم تعداد اور نہ ہی ابتدائی ناکامیاں ان کی فتح کی راہ میں حائل ہو سکتی ہیں۔ مکہ والے واپس لوٹ گئے۔ ابوسفیان کی لاف گزاف بے وزن ثابت ہوئی۔ اگلے سال مسلمان وعدے کے مطابق بدر پہنچے، لیکن قریش نہ آئے۔ احد نے، قرآن کے الفاظ میں، ''شیطان کے داغ کو دھو دیا'' (سورۃ الانفال، آیت 11)۔ احد میں کامیابی ملی باطنی صفائی کے ذریعہ، اسی لیے اسے جہاد اکبر کہا گیا ہے۔

قرآن کی سب سے طویل سورہ، سورۃ البقرہ، میں 286 آیات ہیں، جن میں اسلام کے اخلاقی اصولوں کی وضاحت کی گئی ہے، جیسے سورۃ الفاتحہ کی سات آیات قرآن کے بنیادی پیغام کو سمیٹے ہوئے ہیں۔ (آیت الکرسی، جو اللہ کی صفات حسنیٰ کو بیان کرتی ہے، اسی سورۃ بقرہ کی آیت 255 ہے)۔

جہاد کے مرکزی کردار سے صرف مسلمانوں کو ہی نہیں بلکہ یہودیوں اور عیسائیوں کو بھی اچھی طرح واقف ہونا چاہیے۔ داؤد اور جالوت کی جنگ میں جہاد کی یہی روح کارفرما تھی۔

قرآن کہتا ہے کہ مختلف انبیاء کو مختلف مشن دیے گئے۔ اللہ نے حضرت موسیٰؑ سے براہ راست کلام کیا، انہوں نے اپنی قوم کی پورے چالیس برس تک اس وقت رہنمائی فرمائی جب وہ صحرا میں بھٹک رہے تھے اور اپنی ہی قوم کی نافرمانی سے نبرد آزما رہے۔ حضرت عیسیٰؑ کو ''روح القدس سے تقویت دی گئی'' (آیت 253) اور انہوں نے بغیر ہتھیار کے جدوجہد کی۔ حضرت داؤدؑ کو جو ایک غریب چرواہے تھے اللہ نے انہیں اس زمانے کے سب سے بڑے جنگجو (جالوت) سے مقابلہ کرنے اور اسے قتل کرنے کے لیے چنا۔ حضرت داؤدؑ نے جو ایک چرواہے، موسیقار، شاعر، مجاہد، بادشاہ اور نبی تھے، انہوں نے ساؤل کی زرہ اور تلوار لینے سے انکار کر دیا اور صرف اپنے غلیل اور ایمان پر بھروسہ کیا۔

جب طالوت (ساؤل) اپنی فوج کے ساتھ روانہ ہوئے تو انہوں نے کہا: ''اللہ تمہیں ایک نہر کے ذریعے آزمانے والا ہے۔ جو اس کا پانی پیے گا، وہ میرے ساتھ نہیں چلے گا، اور جو اس سے کچھ نہ چکھے، وہی میرے ساتھ ہوگا۔ ہاں، صرف ایک چلو بھر پانی پینے والے کو معاف کیا جائے گا۔'' لیکن ان میں سے تقریباً سبھی نے وہ پانی پی لیا، صرف چند ہی لوگ باز رہے۔ جب طالوت اور ان کے ساتھ ایمان والوں نے دریا عبور کر لیا تو بہتوں نے کہا: ''آج ہم جالوت اور اس کے لشکر کا مقابلہ نہیں کر سکتے۔'' لیکن جنہیں اللہ سے ملاقات کا یقین تھا، انہوں نے کہا: ''بارہا ایسا ہوا ہے کہ تھوڑی تعداد نے، اللہ کے حکم سے، بڑی جماعت پر فتح حاصل کی ہے، اور اللہ صبر کرنے والوں کے ساتھ ہے۔''

جب وہ جالوت اور اس کے لشکر کے مقابلے کے لیے میدان میں اترے تو انہوں نے دعا کی: ''اے ہمارے رب! ہمیں صبر عطا فرما، ہمیں ثابت قدم رکھ، اور ہمیں کافروں پر فتح عطا کر۔''

پھر اللہ کے حکم سے انہوں نے دشمن کو شکست دی، اور داؤد نے جالوت کو قتل کیا۔ پھر اللہ نے داؤد کو سلطنت، حکمت اور جو کچھ چاہا وہ علم عطا فرمایا۔ اگر اللہ لوگوں کو ایک دوسرے کے ذریعے نہ روکتا تو زمین فساد سے بھر جاتی۔ لیکن اللہ تعالیٰ تمام جہانوں پر مہربان ہے۔

یہی اصل جہاد تھا۔اس کے اسباق زندہ جاوید اسلام کا حصہ ہیں،جنہیں عبداللہ یوسف علی نے یوں ترتیب دیا ہے:

1 تعداد کی نہیں، بلکہ ایمان،عزم اور اللہ کی نصرت کی اہمیت ہے۔
2 تعداد اور طاقت کی سچائی، جرأت اور حکمت عملی کے سامنے کچھ نہیں چلتی۔
3 سچا مجاہد وہی ہتھیار استعمال کرتا ہے جو اس کے پاس موجود ہوں، چاہے لوگ اس پر ہنسیں۔
4 جب اللہ ساتھ ہو تو دشمن کا ہتھیار خود اس کی ہلاکت کا ذریعہ بن سکتا ہے۔
5 پر اثر شخصیت ہر خطرے پر غالب آتی ہے اور اپنے متزلزل ساتھیوں میں بھی حوصلہ پیدا کر دیتی ہے۔
6 خالص ایمان سے اللہ کا انعام حاصل ہوتا ہے، جو مختلف شکلوں میں ظاہر ہوتا ہے۔داؤد کو اللہ نے طاقت،حکمت اور دیگر انعامات سے نوازا۔

اکیسویں صدی کے حالات میں ان حقائق کی مثالیں تلاش کرنا مشکل نہیں ہے۔

مدینہ میں نازل ہونے والی پہلی وحی نے مسلمانوں کو جنگ کی اجازت اس وقت دی جب ان پر ظلم کیا گیا۔دوسری وحی کا لہجہ نسبتاً سخت ہے،اور چونکہ اس کے اقتباسات بہت عام ہیں،اس لیے سورۃ البقرہ کی آیات 190 تا 193 پر خاص توجہ ضروری ہے۔

ان آیات میں سب سے پہلی آیت دہشت گردی کو واضح طور پر رد کرتی ہے۔فرمایا گیا:''جو لوگ تم سے لڑتے ہیں،تم بھی اللہ کی راہ میں ان سے لڑو،لیکن حد سے تجاوز نہ کرو، یقیناً اللہ حد سے بڑھنے والوں کو پسند نہیں کرتا۔''

یہ ''حد سے تجاوز'' کیا ہے؟ عبداللہ یوسف علی اس کی تشریح میں لکھتے ہیں:''جنگ صرف اپنے دفاع میں اور مخصوص حدود کے اندر جائز ہے۔ جب جنگ کی جائے تو اسے بھرپور عزم کے ساتھ لڑا جائے،لیکن انتقام کے جذبے سے نہیں، بلکہ صرف اس لیے کہ امن قائم ہو اور اللہ کی عبادت کی آزادی محفوظ رہے۔کسی صورت میں بھی مقررہ حدود کو عبور نہ کیا جائے: عورتوں، بچوں، بوڑھوں اور کمزوروں کو نقصان نہ پہنچایا جائے،درختوں کو نہ کاٹا جائے،فصلوں کو تباہ نہ کیا جائے،اور اگر دشمن صلح

کی طرف مائل ہوتو صلح کورد نہ کیا جائے۔"

البتہ اگر مسلمان مظالم کا شکار ہوں، تو ایسے دشمنوں کے خلاف جنگ میں نرم دلی کی اجازت نہیں۔ ایسی صورت میں تھپڑ کے لیے دوسرا گال پیش کرنے کے بجائے تلوار اٹھانے کا حکم ہے۔ جیسا کہ قرآن کہتا ہے: "انہیں جہاں پاؤ قتل کرو، اور جہاں سے انہوں نے تمہیں نکالا، تم بھی انہیں وہاں سے نکالو، کیونکہ فتنہ اور ظلم قتل سے بھی بدتر ہیں۔ لیکن مسجدِ حرام کے قریب ان سے نہ لڑو جب تک وہ تم سے وہاں جنگ نہ کریں، اور اگر وہ تم سے جنگ کریں تو تم بھی انہیں قتل کرو۔ یہی سزا ہے ان لوگوں کی جو ایمان کو دبانے کی کوشش کرتے ہیں۔" (سورۃ البقرہ، آیت 191)

مذکورہ بالا سختی کا مداوا اس کی اگلی آیت میں اس طرح کیا گیا ہے: "پھر اگر وہ باز آ جائیں تو بے شک اللہ بخشنے والا، مہربان ہے" (آیت 192)۔ اور آیت 193 میں فرمایا گیا: "اور ان سے لڑو یہاں تک کہ فتنہ باقی نہ رہے اور دین صرف اللہ ہی کا ہو جائے۔ پھر اگر وہ باز آ جائیں تو کسی پر زیادتی نہ کرو، سوائے ان کے جو ظلم کرتے ہوں۔"

قرآن ان مسلمانوں کی سرزنش کرتا ہے جو ایک منصفانہ جنگ میں شریک نہیں ہوتے۔ سورۃ البقرہ کی آیت 216 میں کہا گیا ہے: "تم پر قتال فرض کیا گیا ہے، حالانکہ تم اسے پسند نہیں کرتے۔ ممکن ہے تم کسی چیز کو ناپسند کرو اور وہ تمہارے حق میں بہتر ہو، اور کسی چیز کو پسند کرو جو تمہارے لیے نقصان دہ ہو۔ اور اللہ جانتا ہے، تم نہیں جانتے۔" یہاں اس بات کی وضاحت کر دی گئی ہے کہ قتال کا مقصد ذاتی مفاد یا جارحیت نہیں بلکہ ظلم کے خلاف کھڑا ہونا ہے۔ قرآن نے ان لوگوں کی شدید مذمت کی ہے جو دوسروں پر ظلم کرتے ہیں یا طاقت کا ناجائز استعمال کرتے ہیں۔ اس کے برعکس، جہاد میں اپنی جان قربان کر دینا، اللہ کی راہ میں سب سے بڑی قربانی ہے۔ سورۃ التوبہ کی آیت 38، جو اس وقت نازل ہوئی جب کچھ مسلمانوں نے نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کے ساتھ تبوک کے غزوے میں شریک ہونے سے گریز کیا (جو رومی عیسائیوں کے خلاف تھا)، یہ کہتی ہے: "اے ایمان والو! تمہیں کیا ہو گیا ہے کہ جب تم سے کہا جاتا ہے کہ اللہ کی راہ میں نکلو تو تم زمین سے چمٹ کر بیٹھ جاتے ہو؟ کیا تم نے دنیا کی زندگی کو آخرت پر ترجیح دے دی؟" جب کچھ لوگوں نے گرمی کو بہانہ بنایا تو قرآن نے

سورۃ التوبہ کی آیت 81 میں ان کی یہ کہہ کر تنبیہ کی: ''جہنم کی آگ اس سے کہیں زیادہ شدید ہے۔''

یہ تمام آیات اس امر پر دلالت کرتی ہیں کہ اسلام میں جنگ کا مقصد نہ تو دہشت گردی ہے، نہ ہی طاقت کا بے جا استعمال، بلکہ مظلوموں کا دفاع، عدل کا قیام اور ظلم کا خاتمہ ہے۔

جو مسلمان جہاد کے معرکے میں پیٹھ پھیرتا ہے، اس کا انجام صرف ایک ہے: جہنم۔ سورۃ الانفال کی آیات 15، 16 اور 17 میں کہا گیا ہے:

> ''اے ایمان والو! جب تم کافروں سے جنگ کرو تو ان سے پیٹھ نہ پھیرو۔ اور جو اس دن ان سے پیٹھ پھیرے گا، سوائے اس کے کہ جنگی چال کے طور پر ہو یا اپنے کسی دستے سے ملنے کے لیے، تو وہ اللہ کے غضب کا شکار ہوگا، اور اس کا ٹھکانہ جہنم ہوگا، اور وہ کیا ہی برا ٹھکانہ ہے!''

الانفال کا مطلب ہے: مالِ غنیمت۔ اور یہ غنیمت اہلِ ایمان کے لیے یقینی ہے، چاہے دشمن کتنا ہی طاقتور کیوں نہ ہو۔ جیسا کہ اس وقت رومی سلطنت (بازنطینی سلطنت) تھی، جو عیسائیوں کی سب سے بڑی قوت مانی جاتی تھی۔ لیکن بارہا دیکھا گیا کہ تعداد میں برتری کامیابی کی ضمانت نہیں ہوتی۔ فتح صبر، استقامت اور ایمان کی ہوتی ہے۔

سورۃ الانفال کی آیات 65 اور 66 میں فرمایا گیا ہے:

> ''اے نبی! اہلِ ایمان کو جنگ پر آمادہ کرو۔ اگر تم میں بیس صابر ہوں، تو وہ دو سو پر غالب آئیں گے، اور اگر سو ہوں تو وہ ایک ہزار کافروں کو شکست دیں گے، کیونکہ وہ (کافر) سمجھ بوجھ نہیں رکھتے۔''

موت دراصل ایک آزمائش ہے، خوف کی چیز نہیں۔ سورۃ آلِ عمران، آیت 157 میں فرمایا گیا:

> ''اور اگر تم اللہ کی راہ میں قتل ہو جاؤ یا مر جاؤ، تو اللہ کی مغفرت اور رحمت ان چیزوں سے کہیں بہتر ہے جو یہ (لوگ) جمع کرتے ہیں۔''

صحیح البخاری (جس میں امام بخاریؒ نے سولہ برس کی محنت کے بعد چھ لاکھ احادیث میں سے چن کر

سات ہزار احادیث جمع کیں ) کا ترجمہ ڈاکٹر محمد محسن خان نے مدینہ کی اسلامک یونیورسٹی میں کیا، جو 1987 میں کتاب بھون، نئی دہلی سے شائع ہوا تھا۔ اس ترجمے میں شیخ عبداللہ بن محمد بن حمید کا ایک خطبہ بھی شامل ہے جو انہوں نے مسجد الحرام ( مکہ ) میں دیا تھا۔ اس میں انہوں نے جہاد کی تاریخ کو واضح کیا ہے کہ ابتدا میں یہ اختیاری تھا اور بعد میں اللہ کے راستے میں، منصفانہ جنگ کی صورت میں اسے فرض قرار دے دیا گیا۔

جہاد کے بارے میں سورۃ توبہ دوسری بڑی سورۃ ہے (اگرچہ نزولی ترتیب میں سورۃ انفال اور سورۃ توبہ کے درمیان تقریباً سات سال کا فاصلہ ہے )۔ سورۃ توبہ قرآن کی وہ واحد سورۃ ہے جو بغیر ''بسم اللہ'' کے شروع ہوتی ہے، اور یہی اس کے جلالی انداز کی علامت ہے۔ اس سورۃ میں جہاد کو فرض قرار دیا گیا، اسی لیے اس کی آیات کی روشنی میں یہ دلیل دی جاتی ہے کہ ہر مسلمان پر جہاد کے لیے لبیک کہنا فرض ہے۔

تاہم، ان آیات میں چند واضح شرائط بھی بیان کی گئی ہیں: اگر دشمن معاہدے کی خلاف ورزی کرے یا کسی معاہدے کو توڑ دے، تو جنگ سے قبل چار مہینے کا نوٹس دینا ضروری ہے۔ توبہ کا دروازہ کھلا رکھنا فرض ہے، اور اگر وہ اس موقع سے فائدہ نہ اٹھائیں تو پھر جنگ کی جاسکتی ہے، پوری قوت کے ساتھ۔

سورۃ توبہ کی آیت 39 میں بہت ہی واضح تنبیہ کی گئی ہے کہ:

> ''اگر تم نہ نکلو گے ( جہاد کے لیے )، تو اللہ تمہیں سخت عذاب دے گا، اور تمہاری جگہ کسی اور قوم کو لے آئے گا۔''

مسلمان حکمت عملی کے تحت جہاد کو وقتی طور پر مؤخر کر سکتے ہیں، لیکن اسے ترک نہیں کر سکتے۔ یہ تمام احکامات قرآن کی اس متوازن، منصفانہ اور جنگی اخلاقیات کی عکاسی کرتے ہیں جس میں ظلم، انتقام یا جارحیت کی کوئی گنجائش نہیں، صرف اللہ کے دین، عدل وانصاف، اور مظلوموں کے دفاع کے لیے جہاد فرض کیا گیا ہے۔

مذکورہ بالا خطبے میں شہادت کے انعامات کی جزئیات پر تفصیل سے روشنی ڈالی گئی ہے: شہداء کی ارواح جنت میں جہاں چاہیں رہ سکتی ہیں، ان کے تمام گناہ معاف کر دیے جاتے ہیں، اور شہید کو یہ اختیار حاصل ہوتا ہے کہ وہ اپنے ستر رشتہ داروں کے حق میں اللہ سے شفاعت کرے۔

شیخ عبداللہ کا اصل پیغام کیا تھا؟ یہ کہ اگر ایمان والے صحیح معنوں میں ایمان لائیں گے تو اللہ بدر کے فرشتے دوبارہ بھیجے گا، اور فتح یقینی ہوگی۔ مگر فتح سے پہلے ایمان شرط ہے۔ جدید دور کا مسلمان ایسی زندگی گزار رہا ہے گویا وہ نہ رسول ﷺ کو پہچانتا ہے اور نہ ہی اللہ کے پیغام کو سمجھتا ہے۔ مسلمان خود ان مشرک جیسے بن چکے ہیں جن کے لیے وہ کبھی حق لے کر آئے تھے۔ اگر کامیابی چاہتے ہو، تو پہلے اپنے آپ کو باطنی طور پر پاک کرو۔

اللہ تعالیٰ ایک سودا پیش کرتا ہے، اور قرآن میں یہی لفظ استعمال ہوا ہے۔ سورۃ توبہ کی آیت 111 میں فرمایا گیا:

> ’’یقیناً اللہ نے اہل ایمان سے ان کی جانیں اور ان کے مال جنت کے بدلے خرید لیے ہیں۔ وہ اللہ کی راہ میں لڑتے ہیں، قتل کرتے ہیں اور قتل کیے جاتے ہیں۔ یہ اللہ کا سچا وعدہ ہے، جو تورات، انجیل اور قرآن میں درج ہے۔ اور اللہ سے بڑھ کر اپنے وعدے کو پورا کرنے والا کون ہوسکتا ہے؟ تو خوش ہو جاؤ اس سودے پر جو تم نے اللہ سے کیا ہے۔ یہی عظیم کامیابی ہے۔‘‘

یہ یقیناً تاریخ کا سب سے عظیم سودا تھا، کیونکہ کسی بھی اور معاہدے نے اتنا جذبۂ جہاد اور دنیاوی زندگی سے بے رغبتی پیدا نہیں کی۔ سورۃ آلِ عمران کی آیات 169 اور 170 میں فرمایا گیا:

> ’’جو لوگ اللہ کی راہ میں قتل ہوئے، انہیں مردہ نہ سمجھو۔ بلکہ وہ زندہ ہیں، اپنے رب کے پاس رزق پا رہے ہیں۔ وہ اللہ کے انعامات پر خوشیاں مناتے ہیں اور اپنے ان بھائیوں کے لیے خوش ہوتے ہیں جو ابھی ان سے نہیں ملے، کہ ان پر نہ کوئی خوف ہوگا اور نہ وہ غمگین ہوں گے۔‘‘

تو پھر متقین کے لیے جنت کیسی ہوگی؟ سورۃ محمد کی آیت 15 میں اس کا بیان یوں ہے:

> ''اس جنت کی مثال، جس کا وعدہ متقیوں سے کیا گیا ہے وہ یہ ہے: وہاں ایسے پانی کی نہریں ہوں گی جو آلودہ نہ ہوں گی، دودھ کی نہریں ہوں گی جس کا ذائقہ نہ بدلے گا، شراب کی نہریں ہوں گی جو پینے والوں کے لیے لذت بخش ہوں گی، اور صاف وشفاف شہد کی نہریں ہوں گی۔ وہاں ان کے لیے ہر قسم کے پھل ہوں گے اور ان کے رب کی طرف سے مغفرت ہوگی۔''

جنت کی نعمتوں کی جھلک قرآن میں جگہ جگہ بکھری ہوئی ہے۔ سورۃ الزخرف کی آیات 70 اور 71 میں فرمایا گیا:

> ''جاؤ جنت میں، تم اور تمہاری بیویاں خوش وخرم۔ ان کے ارد گرد سونے کے برتن اور جام گردش کریں گے، وہاں وہ سب کچھ ہوگا جو دل چاہے اور آنکھوں کو بھائے، اور تم ہمیشہ وہیں رہو گے۔''

یہی وہ وعدے، بشارتیں اور ایمانی محرکات ہیں جنہوں نے مسلمانوں کو دنیاوی بندھنوں سے آزاد کیا اور انہیں حق وانصاف کے قیام کے لیے ہر قسم کی قربانی کے لیے آمادہ کیا۔

سورۃ الدہر (سورۃ 76) میں، ان لوگوں کے لیے جو اللہ کے دین کو جھٹلاتے ہیں، ''زنجیریں، طوق اور دہکتی ہوئی آگ'' کا وعدہ کیا گیا ہے۔ لیکن جو نیکوکار رہوں گے، ان کے لیے فیصلے (محشر) کے فوراً بعد ایک خوشبودار شراب کا جام ہوگا، جو کافور سے ملی ہوئی ہوگی۔ وہ جنت میں ریشم اور سنہری دھاریوں والے لباس پہنیں گے، زیورات سے آراستہ ہوں گے، یہ سب کچھ ان کی دنیاوی مفلسی اور تقویٰ کا انعام ہوگا۔ اس کے بعد انہیں ایک اور پاکیزہ شراب کا جام پیش کیا جائے گا، جو زنجبیل سے آمیزہ شدہ ہوگی، اور ''سلسبیل'' نامی ایک چشمے سے نکلی ہوگی۔ پھر جلیل القدر رب انہیں ''پاک وصاف شراب'' پلائے گا (سورۃ الدہر، آیت 21) ایسا جام جو براہ راست رب کریم کی طرف سے ضیافت ہوگی۔

سورۃ المطففین (آیات 22 تا 36) میں جنت کی خوشیاں ان لوگوں کے لیے بیان کی گئی ہیں جنہیں

دنیا میں ایمان کی پاداش میں مذاق کا نشانہ بنایا گیا۔ فرمایا: ''یقیناً نیک لوگ نعمتوں میں ہوں گے۔ وہ عزت والے تختوں پر بیٹھے ہوں گے اور سب کچھ دیکھ رہے ہوں گے۔ تم ان کے چہروں پر نعمت کی رونق پہچان لو گے۔ انہیں مہر بند خالص شراب پلائی جائے گی، جس کی مہر کستوری ہوگی۔ اور اسی پر ان کو رشک کرنا چاہیے جنہیں رشک کی طلب ہو۔ یہ شراب چشمۂ تسنیم سے بنی ہوگی، جو ان لوگوں کے لیے مخصوص ہے جو اللہ کے مقرب ہیں۔''

تسنیم بلندی، عظمت اور پاکیزگی کا استعارہ ہے، اور یہاں اس سے مراد وہ پاکیزہ شراب ہے جو سب سے اعلیٰ اور صاف ترین ہے۔

سورۃ الطور (آیت 20) میں فرمایا گیا:

> ''وہ عزت والے قطار در قطار مسندوں پر تکیہ لگائے بیٹھے ہوں گے، اور ہم ان کو بڑی آنکھوں والی، پاکیزہ حسین وجمیل بیویاں عطا کریں گے۔''

جنت کی حوروں کے ساحرانہ تصور سے ہٹ کر، عبداللہ یوسف علی نے جنت کے ساتھیوں کا نقشہ کچھ اس طرح کھینچا ہے:

> ''جنت کے ساتھی، جنت کے منظر ہی کی طرح، ان کے لباس، میوے اور فضا، سب نہایت خوبصورت ہوں گی۔ زندگی تو ہوگی، لیکن دنیاوی آلودگیوں سے پاک۔ جنت کی یہ مسرتیں مرد و زن دونوں کے لیے ہوں گی، جنہوں نے اس دنیا میں ایمان وعمل کے ساتھ زندگی گذاری۔''

سورۃ الصافات (آیات 45 تا 49) میں فرمایا گیا ہے:

> ''ان کے گرد ایک چشمے سے تیار کیے گیے شراب کے جام گردش کریں گے، جو چمکدار اور شفاف ہوں گے، جن کا ذائقہ نہایت لذیذ ہوگا، اور نہ وہ اس سے مدہوش ہوں گے، نہ ہی وہ حواس باختہ ہوں گے۔ ان کے پاس باحیا، نظریں جھکائے رکھنے والی، بڑی آنکھوں والی عورتیں ہوں گی، گویا سفید انڈے جو احتیاط سے رکھے گئے ہوں۔''

جہنم کا تصور بھی قرآن میں بڑی وضاحت اور بڑے ہولناک انداز میں پیش کیا گیا ہے۔ سورۃ النساء، آیت 56 میں فرمایا گیا ہے:

''جنہوں نے ہماری آیتوں کا انکار کیا، ہم انہیں جلد ہی آگ میں جھونکیں گے۔ جب ان کی کھالیں جل جائیں گی تو ہم ان کی جگہ نئی کھالیں بنا دیں گے تا کہ وہ عذاب کو بار بار محسوس کریں۔ بے شک اللہ غالب اور حکمت والا ہے۔''

سورۃ ابراہیم، آیات 16 اور 17 میں سرکش منکر کے انجام کا نقشہ یوں کھینچا گیا ہے:

''اس کے سامنے جہنم ہوگی، اور اسے پیپ جیسا کھولتا ہوا پانی پلایا جائے گا، جو وہ گھونٹ گھونٹ پیے گا مگر نگل نہ سکے گا۔ موت ہر طرف سے اسے گھیرے گی مگر وہ مرے گا نہیں، اور اس کے سامنے اور بھی سخت عذاب ہوگا۔''

اسی سورۃ کی آیات 49 اور 50 میں فرمایا گیا ہے:

''تم اس دن مجرموں کو زنجیروں میں جکڑا ہوا دیکھو گے، ان کے لباس قطران کے ہوں گے اور ان کے چہروں کو آگ ڈھانپ رہی ہوگی۔''

جنگ اُحد کے اختتام پر، جب ابوسفیان ایک پہاڑ کی چوٹی پر چڑھ کر اپنے بت ''ہُبل'' کو پکار کر فخر سے بولا:

''جنگ کا پلڑا کبھی ایک طرف جھکتا ہے تو کبھی دوسری طرف۔ آج بدر کا بدلہ ہو گیا! اے ہُبل، اپنی عظمت و جلال کا مظاہرہ کرو!''

جب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے یہ کلمات سنے تو حضرت عمرؓ سے فرمایا کہ جواب دو۔ حضرت عمرؓ نے پوری قوت سے نعرہ لگایا:

''اللہ سب سے بڑا اور سب سے عظیم ہے! ہم تم جیسے نہیں۔ ہمارے شہداء جنت میں ہیں، اور تمہارے مقتول جہنم میں۔''

یہی ایمان کی سچائی اور روحانی بصیرت ہے جو اہل یقین کو ہر میدان میں ثابت قدم رکھتی ہے، چاہے وہ جنگ کا محاذ ہو یا زندگی کی کوئی بھی آزمائش۔ یہ فتح صرف میدان کارزار میں نہیں، روح کی پاکیزگی اور اللہ سے سچے تعلق سے بھی حاصل ہوتی ہے۔

یہی تو طرہ امتیاز ہے ایک سچے مومن کا۔

اگر اسلام کی کوئی علامتی تلوار ہے تو وہ وہی ہے جو رسولِ اکرم ﷺ نے اپنے داماد حضرت علیؓ کو عطا فرمائی تھی، جسے "ذوالفقار" کہا جاتا ہے۔ علیؓ، جو "شیرِ خدا" کہلائے، اسلام کے بے مثال ہیرو تھے۔ یہ تلوار انہیں بدر کی فتح کے موقع پر نہیں، بلکہ احد کی کٹھن گھڑی میں تجدید عزم کے وقت عطا کی گئی تھی۔

اور جہاں تک احد کے 'فاتحین' کا تعلق ہے، تو انہی ابوسفیان کے بیٹے حضرت معاویہؓ نے رسول اللہ ﷺ کے نواسے حضرت حسنؓ کے وصال کے بعد عظیم اموی سلطنت کی بنیاد رکھی، جو 661ء سے 749ء تک دنیا پر حکمرانی کرتی رہی۔

اسی معرکے میں جس نے مسلمانوں کو وقتی پسپائی پر مجبور کیا تھا ایک نوجوان، جری اور غیر معمولی عسکری صلاحیت رکھنے والے سپہ سالار خالد بن ولیدؓ بھی جلد ہی دائرہ اسلام میں داخل ہو گئے۔ پھر وہ نہ صرف یہ کہ مکہ کی فتح کے وقت مسلم فوج کی صف اوّل میں رہے بلکہ ان کی زیر کمان اسلامی فوجوں نے بیت المقدس، شام اور عراق سے لے کر دریائے فرات تک کا علاقہ فتح کر لیا۔ اس طرح ان کی موجودگی فتح اور کامیابی کی ضمانت بن گئی۔

اور آخر میں، جیسا کہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا:

وہی بہترین تدبیر کرنے والا ہے۔ اور اس کا منصوبہ سب پر غالب آتا ہے۔

3

# رات کی تاریکی میں بغاوت کی لہر

نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی آخری وصیت یہ تھی:

''جزیرۂ نماعرب میں دو دین جمع نہیں ہو سکتے۔''

(آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا وصال 12 ربیع الاول کو ٹھیک اسی دن ہوا جس دن وہ مدینہ ہجرت کر کے تشریف لائے تھے، یعنی ہجرت کو پورے بارہ سال مکمل ہو چکے تھے)۔ نبی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے وصال کے بعد مسلمان شدید صدمے میں مبتلا ہو گئے۔ روایت ہے کہ حضرت عائشہؓ فرمایا کرتی تھیں:

> ''جب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا انتقال ہوا تو عربوں میں ارتداد پھیل گیا، عیسائیت اور یہودیت نے دوبارہ سر اٹھانا شروع کیا اور بےچینی اور بداعتمادی عام ہوگئی۔ مسلمان ایسے ہو گئے جیسے سرد رات میں بارش سے بھیگی ہوئی بکریاں ہوں جو چرواہے کے بغیر کھلے میدان میں بے یار و مددگار کھڑی ہوں۔ یہاں تک کہ اللہ تعالیٰ نے ان کی صفوں کو حضرت ابوبکرؓ کے ہاتھوں دوبارہ یکجا کر دیا۔''

(یہ اقتباس سیرت ابن اسحاق سے ہے، جو مدینہ میں 85 ہجری کے قریب پیدا ہوئے اور 151 ہجری میں بغداد میں وفات پائی۔)

فتحِ مکہ کے دن ایک منظر تاریخ میں ہمیشہ کے لیے نقش ہو گیا۔ ہندہ جس نے احد کے معرکے میں حضرت حمزہؓ کا جگر چبایا تھا، اس دن بیعت کے لیے آنے والوں کی قطار میں سخت اضطراب اور خوف

کے عالم میں کھڑی تھی۔ اس کا شوہر ابوسفیان قریش کا سردار جو پہلے ہی اسلام قبول کر چکا تھا۔ اس نے نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا استقبال کیا، جو یمنی سرخ عمامہ باندھے رمضان المبارک کی بیسویں تاریخ 630ء کو، دس ہزار مسلح مہاجرین وانصار کے لشکر کی قیادت کرتے ہوئے مکہ میں فاتحانہ داخل ہوئے تھے۔

ہندہ آخر تک مزاحمت پر قائم رہی۔ غصے سے بھری ہوئی وہ ابوسفیان کے پاس پہنچی، اس کی مونچھیں پکڑ کر چیخی: ''اس موٹے چکنے چربی سے بھرے شخص کو قتل کر دو! یہ کیسا نکما محافظ ہے تم سب کا!''

ابوسفیان نے قریش سے کہا:

''اس عورت کی باتوں میں نہ آنا، اور مسلمانوں کی فتح کو تسلیم کر لو۔''

نبی اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اونٹنی پر سوار سیدھے خانہ کعبہ پہنچے۔ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے سات بار طواف کیا، حجر اسود کو ہاتھ میں موجود عصا سے چھوا، پھر کعبہ کی کنجی عثمان بن طلحہ سے لی اور اندر داخل ہوئے۔ وہاں آپ کو لکڑی کا ایک کبوتر نظر آیا، جسے آپ نے تین ٹکڑوں میں توڑ دیا۔ اس وقت خانہ کعبہ میں تین سو ساٹھ بت رکھے ہوئے تھے۔ نبی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے قرآن کی سورۃ بنی اسرائیل (81:17) کی یہ آیت تلاوت فرمائی:

''حق آ گیا اور باطل مٹ گیا، بے شک باطل مٹنے ہی والا ہے۔''

ظہر کی نماز کے بعد تمام بت توڑ دیے گئے اور جلا دیے گئے۔ تمام تصویریں مٹا دی گئیں، سوائے دو کے... حضرت عیسیٰؑ اور حضرت مریمؑ کی تصویریں باقی رہنے دی گئیں۔

پھر نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم صفا پہاڑی کی طرف تشریف لے گئے تاکہ افراد سے بیعت لیں۔ پہلے مرد آئے، پھر عورتیں۔ چونکہ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کسی غیر محرم عورت سے مصافحہ نہ کرتے تھے، اس لیے ایک برتن میں پانی رکھا گیا تاکہ بیعت کے اظہار کے طور پر آپ کے بعد وہ عورتیں اس میں اپنی انگلیاں ڈبو سکیں۔

ہندہ جو شکست تو کھا چکی تھی مگر مکمل طور پر پست نہ ہوئی تھی، نقاب اوڑھے اپنی شناخت چھپائے قطار میں آ کھڑی ہوئی، لیکن اپنی طبیعت کو چھپانا اس کے لیے ممکن نہ تھا۔ شرائط کا اعلان کیا گیا۔ اللہ کی بندگی اور رسول کی اطاعت کے بعد پہلی شرط یہ تھی: ''تم چوری نہیں کرو گی۔''

ہندہ نے جواب دیا: ''خدا کی قسم، میں تو ابوسفیان کے مال میں سے کچھ لیا کرتی تھی، اب نہیں جانتی کہ وہ حلال تھا یا نہیں۔'' اس کا شوہر، شاید ایک قسم کی بے بسی کے ساتھ، بولا: ''پہلے جو کچھ تھا وہ جائز تھا۔''

نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے مداخلت کرتے ہوئے پوچھا: ''تو تم ہندہ ہو؟''

اس نے کہا: ''ہاں، میں ہی ہوں۔ جو کچھ ہو چکا ہے اسے معاف فرما دیجیے، اللہ آپ کو معاف کرے۔''

پھر نبی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے دوسری شرط بیان کی: ''تم زنا نہیں کرو گی۔''

ہندہ نے کہا: ''اللہ کے رسول، کیا آزاد عورت زنا کرتی ہے؟''

اس کے بعد فرمایا: ''تم اپنی اولاد کو قتل نہیں کرو گی۔''

ہندہ نے تیکھے انداز میں جواب دیا: ''جب وہ چھوٹے تھے تو میں نے ہی انہیں پالا تھا، اور جب بڑے ہوئے تو آپ نے بدر کے دن انہیں قتل کر دیا، آپ کو ہی ان کا حال بہتر معلوم ہے۔''

حضرت عمرؓ، جو نبی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے پاس بیٹھے تھے، یہ سن کر زور سے ہنس پڑے۔

نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے اگلی شرط رکھی: ''تم جھوٹے بہتان نہیں باندھو گی۔''

ہندہ بولی: ''خدا کی قسم، بہتان گڑھنا واقعی شرمناک بات ہے، لیکن کبھی کبھی اسے نظرانداز کرنا بہتر ہوتا ہے۔''

آخری شرط یہ رکھی گئی: ''تم بھلائی کے کاموں میں میری نافرمانی نہیں کرو گی۔''

ہندہ نے جواب دیا: ''اگر ہم نافرمانی کرنا چاہتے تو یہاں بیٹھے کیوں ہوتے؟''

یہ عظیم الشان مکالمہ اسلام کی روح کی عکاسی کرتا ہے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم بلاشرکت غیرے قائد تھے، جن سے سب لوگوں نے اطاعت کی بیعت کی تھی۔ ان پر اللہ کی وحی نازل ہوتی تھی، مگر اس پورے منظر میں کہیں بھی بڑائی یا خودنمائی کی کوئی جھلک نہیں تھی۔ اس جماعت میں سب برابر تھے، جنہیں اللہ کی بندگی نے اتحاد کے رشتے میں جوڑ رکھا تھا۔

اس کا مطلب یہ ہرگز نہیں کہ اہل ایمان کے درمیان اختلافات نہ تھے یا اختلافات نہیں ہو سکتے تھے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی وفات کے فوراً بعد ہی خلافت کے سوال پر اختلافات پیدا ہوئے، جو

بعد میں خانہ جنگی اور ایک بڑے تصادم کی صورت اختیار کر گئے، ہندہ کے پوتے یزید اور نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے نواسے حسینؓ کے درمیان کربلا کا معرکہ پیش آیا۔

شاید مسلمانوں کو کبھی بھی ایک صحیح قیادت کی اتنی ضرورت نہیں پڑی تھی جتنی اس دن جب نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا وصال ہوا تھا۔

حضرت ابوبکرؓ، جو نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے سب سے قریبی دوست اور رفیق تھے، بارہ ربیع الاول (مطابق 632 عیسوی) کی صبح مسجد نبوی میں نماز فجر کی امامت کر رہے تھے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم مسجد میں داخل ہوئے۔ مجمع میں ہلچل مچ گئی اور حضرت ابوبکرؓ پیچھے ہٹنے لگے تا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نماز پڑھائیں، مگر آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا:

''نماز تم ہی پڑھاؤ''،

اور خود ان کے دائیں جانب بیٹھ کر نماز ادا کی۔
نماز کے بعد نبی اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے بلند آواز سے مجمع سے خطاب فرمایا:

> ''اے لوگو! آگ بھڑک چکی ہے، اور فتنے رات کی تاریکی کی طرح اُمڈ رہے ہیں۔ خدا کی قسم! تم مجھ پر کوئی الزام نہیں رکھ سکتے۔ میں صرف وہی چیز حلال کرتا ہوں جسے قرآن نے حلال قرار دیا ہے، اور صرف اسی کو حرام قرار دیتا ہوں جسے قرآن نے حرام کہا ہے۔''

اس کے بعد آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اپنی زوجہ حضرت عائشہؓ کے گھر تشریف لے گئے جو حضرت ابوبکرؓ کی بیٹی تھیں، اور اسی دن ان کی گود میں وصال فرمایا۔ حضرت عائشہؓ نے آپ کا سر تکیے پر رکھا اور غم کے عالم میں سینہ کوبی کرنے لگیں اور چہرے پر طمانچے مارے۔

حضرت عمرؓ نے اس وقت کسی کو بھی نبی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی وفات تسلیم کرنے کی اجازت نہ دی اور اعلان کیا کہ جو کوئی کہے گا کہ محمد صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم وفات پا گئے ہیں، وہ اس کے ہاتھ پاؤں کاٹ دیں گے۔ حضرت عمرؓ کا کہنا تھا:

''محمد صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اپنے رب سے ملاقات کے لیے گئے ہیں، جیسے حضرت موسیٰؑ چالیس دنوں کے لیے گئے تھے۔''

اس موقع پر حضرت ابوبکرؓ کھڑے ہوئے اور ایک تاریخی خطاب فرمایا، جو ایمان کا سنگ میل بن گیا۔

انہوں نے فرمایا:

''اے لوگو! جو محمد صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی عطاعت کرتا تھا، وہ جان لے کہ محمد صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم وفات پا چکے ہیں، اور جو اللہ کی عبادت کرتا ہے، تو اللہ زندہ ہے، ہمیشہ باقی رہنے والا۔''

پھر حضرت ابوبکرؓ نے سورۃ آلِ عمران کی وہ آیت تلاوت فرمائی جو آٹھ برس پہلے غزوۂ احد کے دوران نبی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی شہادت کی افواہ کے موقع پر نازل ہوئی تھی:

''محمد تو ایک رسول ہیں، ان سے پہلے بھی کئی رسول گزر چکے ہیں۔ تو کیا اگر وہ وفات پا جائیں یا شہید ہو جائیں، تم الٹے پاؤں پلٹ جاؤ گے؟'' (آلِ عمران 144:3)

نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے وصال کے فوراً بعد مسلمانوں میں تین نمایاں گروہ سامنے آئے۔ پہلا گروہ مدینہ کے اصل باشندے انصار کا تھا... دوسرا گروہ مہاجرین کا تھا... وہ بہتر افراد جو مکہ سے ہجرت کر کے نبی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے ہمراہ مدینہ آئے تھے۔ تیسرا گروہ وہ تھا جو یہ سمجھتا تھا کہ خلافت کا حق صرف نبی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے خاندان یعنی بنو ہاشم کو ہے۔ اس مؤقف کی نمائندگی حضرت حضرت فاطمہؓ اور حضرت علیؓ کر رہے تھے۔ ایک چوتھا گروہ ان اشرافیہ کا تھا جس کی قیادت ابوسفیان کر رہے تھے۔ یہ تازہ ایمان لایا ہوا طبقہ تھا اور اس وقت خاموشی اختیار کیے ہوئے تھا۔

انصار نے اپنی خلافت کی دعوے داری کے لیے بنو ساعدہ کے صحن میں اجتماع کیا۔ حضرت ابوبکرؓ اور حضرت عمرؓ وہاں پہنچے اور بحث و مشورے کے بعد اتفاق حضرت ابوبکرؓ پر ہو گیا۔ انہوں نے اس نازک اور نازک ترین لمحے میں امت کی قیادت سنبھالی۔ حضرت ابوبکر نے ''خلیفۃ رسول اللہ''... یعنی اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے جانشین کا لقب اختیار کیا۔ اس منصب کی اس سے بہتر تعریف ممکن

نہیں جوانہوں نے خود مسلمانوں کے مجمع میں کی۔ انہوں نے بنوساعدہ کے صحن میں جمع مسلمانوں سے خطاب کرتے ہوئے فرمایا:

''مجھے تم پر حاکم مقرر کیا گیا ہے، حالانکہ میں تم میں سب سے بہتر نہیں ہوں۔ اگر میں بھلائی کروں تو میری مدد کرو اور اگر برائی کروں تو میری اصلاح کرو۔ سچائی امانت داری میں ہے اور جھوٹ خیانت میں۔ تم میں جو کمزور ہے وہ میرے نزدیک اس وقت تک طاقتور ہے جب تک کہ میں اس کا حق دلوانہ دوں، اگر اللہ نے چاہا۔ اور تم میں جو طاقتور ہے وہ میرے نزدیک اس وقت تک کمزور ہے جب تک کہ میں اس سے دوسروں کا حق نہ لے لوں۔ اگر کوئی قوم اللہ کے راستے میں جہاد چھوڑ دے تو اللہ اسے ذلت کے ساتھ ہلاک کر دیتا ہے۔ جب کسی قوم میں برائی عام ہو جائے تو اللہ ان پر اجتماعی عذاب نازل کرتا ہے۔''

پھر انہوں نے فیصلہ کن بات کہی:

''میری اطاعت صرف اسی وقت تک لازم ہے جب تک میں اللہ اور اس کے رسول کی اطاعت کرتا رہوں، اور اگر میں ان کی نافرمانی کروں تو تم پر میری اطاعت لازم نہیں۔'' یہ انتہائی اصولی الفاظ اس خلافت کی بنیاد تھے جسے برنارڈ لیوس نے اپنی کتاب The Political Language of Islam (یونیورسٹی آف شکاگو پریس، 1988) میں ''اسلامی تاریخ کی سب سے عظیم اور اہم ترین حکومتی روایت'' قرار دیا ہے۔ مگر اسی مثالی تصور میں ایک مسلسل چیلنج کا امکان بھی پوشیدہ تھا، کیونکہ اللہ کے راستے اور انسانوں کی کمزوریوں کے درمیان ہمیشہ ایک فاصلہ موجود رہا ہے۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم واحد ہستی تھے جو اللہ کے راستے پر مکمل طور پر چلنے والے تھے، اس لیے ان کے بعد جو لوگ اقتدار میں آئے، ان سے تقابل، شکایت اور بعض اوقات بغاوت کا امکان ہمیشہ موجود رہا۔ خود ابو بکرؓ نے کہا کہ ان کی اطاعت صرف اسی وقت تک واجب ہے جب تک وہ اللہ اور اس کے رسول کی اطاعت کرتے رہیں، ورنہ نہیں۔ اگر مسلمان ابو بکرؓ جیسے خلیفہ میں بھی خامی تلاش کر سکتے تھے، جو خلفائے راشدین میں سب سے کم اختلافی شخصیت تھے، تو بعد کے حکمرانوں سے

خاموش اطاعت کی توقع عبث تھی۔

اسلام میں جہاد اکبر یعنی اپنی اصلاح اصل جہاد ہے، اور تاریخ اسلام میں یہ کئی بار ہوا کہ جب مسلمانوں کو لگا کہ حکمران اسلام کے اصولوں یا مسلمانوں کے مفاد سے انحراف کر رہے ہیں تو ان کے خلاف جہاد کو جائز سمجھا گیا۔

محض ڈھائی سالہ خلافت میں ابو بکرؓ نے نبی کریم ﷺ کی آخری وصیت پر عمل کیا۔ ارتداد کی جنگوں میں تمام مرتدین کو شکست دی گئی اور پورا جزیرہ نما عرب اسلام کے زیر نگیں آ گیا۔ تاہم مدینہ میں انہیں مخالفت کا سامنا ہوا، اور وہ بھی کسی عام فرد کی جانب سے نہیں بلکہ خود ایک عظیم المرتبت شخصیت حضرت علیؓ کی طرف سے۔ حضرت علیؓ اس بات پر ناراض تھے کہ خلافت کے فیصلے میں ان سے مشورہ نہیں لیا گیا۔ جب حضرت ابو بکرؓ نے خلافت کے لیے حضرت عمرؓ کو نامزد کیا تو یہ ناراضی مزید تلخی میں بدل گئی۔

ایک موقع پر حضرت عمرؓ اس قدر غضبناک ہوئے کہ انہوں نے حضرت فاطمہؓ کو دھمکی دی کہ اگر وہ اپنے گھر کو اختلاف کا مرکز بنائے رکھیں گی تو وہ اس گھر کو آگ لگا دیں گے۔ بعض صحابہ کا خیال تھا کہ حضرت عمرؓ بہت سخت مزاج تھے، لیکن یہ بھی سچ ہے کہ وہ تدبیر میں دانشمند اور جنگ میں بے مثال جرأت کے مالک تھے۔ ان کے دس سالہ دور خلافت میں مدینہ کی مختصر سی شہری ریاست ایک عظیم سلطنت میں تبدیل ہو گئی تھی، جس میں فلسطین، مصر، ایران کا بیشتر حصہ، اور شمال کی جانب آذربائیجان وارمینیا شامل ہو گئے۔

قابل ذکر بات یہ ہے کہ جب ایک ایرانی غلام کے ہاتھوں حضرت عمرؓ زخمی ہوئے اور بستر مرگ پر تھے، تو انہوں نے اکابر صحابہ سے وعدہ لیا کہ ان کے بیٹے عبداللہ کو ان کا جانشین نہ بنایا جائے، بلکہ ان کی وفات کے تین دن کے اندر چھ نامزد افراد میں سے کسی ایک کو خلیفہ منتخب کیا جائے۔ ان چھ میں حضرت علیؓ بھی شامل تھے، اور حضرت عمرؓ نے حتمی فیصلہ دیگر صحابہ پر چھوڑ دیا۔

بزرگ صحابہ نے خلافت کے لیے فیصلہ دو افراد تک محدود کر دیا: حضرت عثمانؓ جو بنو امیہ سے تعلق رکھتے تھے، اور حضرت علیؓ۔ لیکن ایک بار پھر خلافت حضرت علیؓ کو نہ مل سکی۔ حضرت عثمانؓ اس

وقت ستر برس سے زائد عمر کے تھے، مگر انہوں نے بارہ سال خلافت کی۔ ان کا دور شدید اختلافات اور تنازعات سے بھرا رہا۔ جب مفتوحہ علاقوں سے دولت مدینہ میں آنے لگی تو حضرت عمرؓ کے دور کا سخت مالی نظم وضبط آہستہ آہستہ نرم پڑ گیا، اور اس کے ساتھ ہی بدعنوانی کے الزامات بھی سامنے آنے لگے۔ جنہیں فائدہ پہنچا، وہ حضرت عثمانؓ کو سخی قرار دیتے تھے، جبکہ ناقدین نے اسے اقربا پروری کا نام دیا۔ جب حضرت عثمانؓ نے صرف اپنے دور میں ترتیب کردہ قرآنی نسخے کے علاوہ سبھی نسخوں کو نذرِ آتش کرنے کا حکم دیا، تو بعض مخالفین نے اسے بے ادبی سے تعبیر کیا۔ حضرت عثمانؓ شکوہ کرتے رہے کہ جن لوگوں نے حضرت عمرؓ کے کوڑے برداشت کیے، وہی اب ان کی دریا دلی پر بغاوت کر رہے ہیں۔ لیکن وہ اصل نکتہ نظر انداز کر بیٹھے تھے۔ زہد وقناعت، اسلامی اخلاقیات کا بنیادی ستون تھے، جیسا کہ خود نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی سیرت سے ظاہر تھا۔ مخالفین کا کہنا تھا کہ حضرت عثمانؓ اللہ کے مقرر کردہ راستے سے ہٹ چکے ہیں۔

656ء میں حضرت عثمانؓ کو بے دردی سے شہید کر دیا گیا۔ ان کے قتل میں وہ لوگ بھی شامل تھے جن میں بعض نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے صحابہ اور ان کی محبوب اہلیہ حضرت عائشہؓ کے رشتہ دار شامل تھے۔ حضرت عائشہؓ کے بھائی، جن کا نام بھی محمد تھا، قاتلوں میں شامل تھے۔ ان کی شہادت نے ایسی ہولناک خانہ جنگی کو جنم دیا جس میں ہر گروہ خود کو دین کا محافظ سمجھ رہا تھا۔ حالات اس قدر بگڑ گئے کہ بزرگ صحابہ نے، جو اب تک خلافت کے معاملے میں خاموش تھے، حضرت علیؓ سے درخواست کی کہ وہ خلافت سنبھالیں۔ لیکن حضرت علیؓ کے دور میں خانہ جنگی مزید شدید ہوگئی۔ ایک طرف انہیں حضرت عثمانؓ کے رشتہ داروں، یعنی بنوامیہ کی مخالفت کا سامنا تھا۔ شام کے گورنر حضرت معاویہؓ، جو ہندہ کے بیٹے تھے، نے حضرت علیؓ پر حضرت عثمانؓ کے قتل کی سازش میں ملوث ہونے کا الزام لگایا۔ حضرت علیؓ نے اس خطرے سے نمٹنے کے لیے مدینہ سے دارالحکومت کوفہ منتقل کیا۔ لیکن وہاں انہیں ایک ایسی مسلمان فوج کا سامنا پڑا جس کی قیادت حضرت عائشہؓ کر رہی تھیں۔ مسلمان مؤرخین جنگ جمل میں شہید ہونے والے ہزاروں مسلمانوں کے ذکر پر آج بھی اشکبار ہو جاتے ہیں۔ 657ء میں حضرت علیؓ کا مقابلہ حضرت معاویہؓ کی افواج سے صفین، شام کے مقام پر ہوا۔ حضرت علیؓ کا کہنا تھا کہ وہ حضرت معاویہؓ سے نمٹ سکتے تھے، لیکن انہیں حضرت عائشہؓ کی جانب

سے بغاوت کا ڈر تھا، کیونکہ وہ ان کے اہلِ خانہ میں سے تھیں۔

حضرت معاویہؓ نے خانہ جنگی کے خاتمے کے لیے ایک سمجھوتے کی تجویز دی کہ فیصلہ قرآن کی بنیاد پر ثالثی کے ذریعہ کیا جائے۔ حضرت علیؓ نے اس پر رضامندی ظاہر کی، لیکن انہی کے ایک پیروکار نے، جو بعد میں خوارج کہلائے، انہیں قتل کر دیا۔ ان کا مؤقف تھا کہ حضرت علیؓ نے سمجھوتہ قبول کر کے دین سے غداری کی ہے۔ حضرت علیؓ جیسے جلیل القدر خلیفہ کو بھی خوارج نے صحیح معنوں میں مومن ماننے سے انکار کر دیا۔

حضرت علیؓ کے صاحبزادے حضرت حسنؓ نے اپنے والد کا منصب سنبھالا، اور یوں اسلام میں پہلی بار خلافت وراثتی بنیادوں پر منتقل ہوئی۔ لیکن حضرت معاویہؓ کی جانب سے چیلنج ختم نہیں ہوا تھا۔ انہوں نے حضرت حسنؓ سے مذاکرات کا آغاز کیا اور یہ موقف اختیار کیا کہ خلیفہ وہی ہونا چاہیے جو ایمان کے ساتھ ساتھ حکومت کرنے کی اہلیت بھی رکھتا ہو۔ انہوں نے یاد دلایا کہ خود مسلمانوں نے حضرت ابوبکرؓ کو حضرت علیؓ پر ترجیح دی تھی۔ حضرت حسنؓ کو لکھے گئے خط میں حضرت معاویہؓ نے لکھا: ''اگر میں یہ سمجھتا کہ آپ رعایا کو مجھ سے زیادہ سمجھتے ہیں، مسلمانوں کی جان و مال کی حفاظت بہتر انداز میں کر سکتے ہیں اور دشمن کے مقابلے میں زیادہ مدبرانہ طریقے سے پیش آ سکتے ہیں، تو میں وہی کرتا جو آپ نے کہا۔ لیکن مجھے حکومت کرنے کا طویل تجربہ ہے، میں سیاست کو بہتر سمجھتا ہوں اور عمر میں بھی تم سے بڑا ہوں۔'' حضرت حسنؓ نے یہ موقف تسلیم کر لیا اور حضرت معاویہؓ خلافت پر فائز ہو گئے۔ اقتدار کی یہ پُرامن منتقلی کشیدگی کے خاتمے کی ضمانت نہ بن سکی۔ جب حضرت حسنؓ کا اچانک انتقال ہوا تو ان کے بعض پیروکاروں نے الزام لگایا کہ انہیں زہر دے کر شہید کیا گیا، اور اس کے پیچھے حضرت معاویہؓ کا ہاتھ تھا۔

حضرت معاویہؓ واقعی ویسے ہی منتظم ثابت ہوئے جیسا انہوں نے دعویٰ کیا تھا۔ ان کے دور میں بیس برس تک داخلی امن اور سرحدوں پر پیش قدمی قائم رہی۔ انہوں نے عظیم بازنطینی سلطنت کو ایک بار پھر چیلنج کیا، مگر ان کے دورِ حکومت میں عیسائیوں کے خلاف کوئی تعصب نہ تھا۔ انہوں نے انتظامیہ میں اہلیت کی بنیاد پر تقرریاں کیں اور عیسائیوں اور یہودیوں کو بھی ریاستی مناصب پر فائز کیا۔ ان

کے چیف سیکریٹری کا تعلق شام کے ایک عیسائی خاندان سے تھا۔ تاہم مسلمانوں کے اختلاف کو وہ زیادہ نرمی سے برداشت نہ کر سکے۔ جب بصرہ میں فتنہ اٹھا تو انہوں نے زیاد کو گورنر مقرر کیا، جس نے برسراقتدار لوگوں کو خبردار کرتے ہوئے کہا:

''میں بہت سے سر جھکتے ہوئے دیکھ رہا ہوں، ہر شخص یہ دیکھ لے کہ اس کا سر اس کے کاندھے پر سلامت رہے!''

حضرت معاویہؓ کے دور میں خلافت، ملوکیت میں تبدیل ہو گئی۔ اب خلیفہ ''ملک یعنی بادشاہ'' بن چکا تھا۔ حضرت عمرؓ اگر یہ تبدیلی دیکھتے تو شاید آبدیدہ ہو جاتے۔ خلافت کا کردار اب ایک وسیع ہوتی ہوئی سلطنت کی سیاسی ضرورتوں سے ہم آہنگ ہو چکا تھا۔ جب حضرت معاویہؓ کا انتقال ہوا تو اسلامی سلطنت ہندوستان کے سندھ سے لے کر مغرب میں مراکش اور شمال میں بخارا تک پھیل چکی تھی۔ ان کی کامیابی نے ان کے طریقہ حکمرانی پر مؤثر تنقید کو تقریباً ناممکن بنا دیا۔ ان کے طرزِ حکومت کا فلسفہ، جسے ابن الابری کے حوالے سے فلپ ہٹی نے اپنی کتاب History of the Arabs (لندن، 1973) میں نقل کیا ہے، آج ایک کلاسیکی اقتباس سمجھا جاتا ہے:

''میں وہاں کوڑا نہیں چلاتا جہاں زبان کافی ہو، اور وہاں تلوار نہیں اٹھاتا جہاں کوڑا کارگر ہو۔ اگر میرے اور عوام کے درمیان ایک بال جیسا نازک رشتہ بھی ہو تو میں اسے ٹوٹنے نہیں دیتا۔ اگر وہ کھینچیں تو میں ڈھیل دیتا ہوں، اور اگر وہ ڈھیلا کریں تو میں کھینچ لیتا ہوں۔''

اسلام کی ابتدائی بے مثال فتوحات کا سرچشمہ ایمان تھا، اور حضرت معاویہؓ کے بعد سیاست نے مسلمانوں کے اس اتحاد کو پارہ پارہ کر دیا۔

عصرِ حاضر کے مسلمان، جو کسی ابوبکر، عمر، علی یا حتیٰ کہ معاویہ جیسے کسی عظیم لیڈر کی آمد سے مایوس ہو چکے ہیں، شاید معاویہ کے بیٹے یزید (683–680) کو اپنے حالیہ حکمرانوں سے زیادہ قریب پائیں۔ یزید اپنے والد کے برعکس تھا۔ وہ سنگدل، لالچی، اور ایسا شخص تھا جس کا اسلام سے تعلق

ایمان و یقین کی بنیاد پر نہیں بلکہ پیدائش کی بنیاد پر تھا۔ صرف تین ہولناک برسوں میں اس نے وہ استحکام تباہ کر دیا جو معاویہ نے برسوں کی تدبیر سے قائم کیا تھا۔

اسے اس کے والد نے حضرت حسنؓ کے بھائی حسینؓ کے ساتھ نرمی برتنے کی وصیت کی تھی، لیکن یزید نے جارحیت کا راستہ اختیار کیا، اور یہی جارحیت سنی اور شیعہ کے درمیان ہمیشہ کے لیے ایک ناقابل عبور خلیج بن گئی۔ 680ء میں جب ماہ محرم کی گرمی تھی، تعداد اور عسکری لحاظ سے یزید کی بڑی فوج نے حضرت حسینؓ، ان کے اہل خانہ اور چند جاں نثار ساتھیوں کو کربلا میں گھیر کر شہید کر دیا۔ کربلا بغداد سے تقریباً ساٹھ میل کے فاصلے پر واقع ہے۔ یزید کے سپہ سالار عبیداللہ نے یزید کو کربلا سے ایک بہت ہی دردناک تحفہ پیش کیا۔ وہ تحفہ تھا حسینؓ کا قلم شدہ سر۔ یزید کے خوشامدی درباری ہنس رہے تھے اور اس مقدس سر کو ٹھوکر مار رہے تھے، یہاں تک کہ ایک شخص نے ان سے التجا کی کہ کم از کم نبی کریم ﷺ کے نواسے کی بے حرمتی نہ کرو۔

مسلم تاریخ کے اس دور میں خون اور افراتفری شانہ بشانہ چل رہے تھے۔ جب قوم کی قیادت بے سمت چلتی ہے تو ایسا ہی ہوتا ہے۔ نبی کریم ﷺ کی وفات کے پچاس برس کے اندر ایک ہی وقت میں تین مختلف افراد نے اپنی خلافت کا دعویٰ کیا۔ دمشق میں یزید کے بعد اس کا بیٹا خلافت سے دست بردار ہو گیا، چنانچہ ایک سرکاری عہدیدار مروان نے اقتدار سنبھالا۔ 684ء میں اس کی وفات کے بعد اس کا بیٹا عبدالملک خلیفہ بنا۔

عرب کے صحراؤں میں حضرت عبداللہ بن زبیر نے علم بغاوت بلند کیا۔ انہوں نے مکہ اور مدینہ دونوں مقدس شہروں پر قبضہ کر کے اپنی خلافت کا اعلان کر دیا۔ کوفہ میں جو حضرت علیؓ کا دارالحکومت رہا تھا، مختار نام کے ایک پر جوش شخص نے "لشکرِ توابین" کے نام سے ایک تحریک چلائی جس کے ممبر ایسے لوگ بنے جنہیں اس بات پر ندامت تھی کہ وہ رسول اللہ ﷺ کے اہل بیت کی مدد نہ کر سکے۔ مختار نے حضرت علیؓ کے بیٹے محمد بن حنفیہ کے حق میں اپنی حمایت اور وفاداری کا اعلان کیا۔

مختار نے کربلا کا کسی حد تک اس طرح انتقام لیا جب اس نے عبیداللہ کو اسی مقام پر شکست دے کر قتل کیا جہاں حسینؓ شہید ہوئے تھے۔ مختار محض ایک جنگجو ہی نہیں تھا۔ اس نے قرآنی مساوات کا

حوالہ دیتے ہوئے غریبوں کو اپنے گرد جمع کر لیا، اور ایک ایسا سحر انگیز تصور پیش کیا جو آج تک مایوسی کے اندھیروں میں امید کے چراغ جلاتا ہے۔ اس نے اعلان کیا کہ ایک ''امامِ غائب''، یعنی مہدی کا ظہور ہوگا، جو دنیا کو عدل و انصاف سے بھر دیں گے اور مسلم افواج کو فتح دلائیں گے۔

عبدالملک بن مروان ایک عظیم خلیفہ تھا۔ اس نے اپنی خلافت کی ابتدا میں اس بات کا انتظار کیا کہ اس کے مخالفین آپس میں لڑ بھڑ کر کمزور ہو جائیں۔ اور ایسا ہی ہوا۔ جب عبداللہ بن زبیر نے مختار کو شکست دی تو اس کے بعد عبدالملک نے عبداللہ کی طرف رخ کیا۔ اس کی فوج نے عرب کے مقدس شہروں پر قبضہ کر لیا۔ عبداللہ بن زبیر میدان جنگ میں مارے گیے، اور ان کا کٹا ہوا سر نیزے پر چڑھا کر دمشق بھیجا گیا۔

بغاوتیں یکے بعد دیگرے سیاہ رات کی طرح آتی جاتی گئیں، مگر انہی تیرہ و تاریک راتوں سے جب سحر نمودار ہوئی تو وہ نہایت شاندار تھی۔ خلیفہ عبدالملک اور ان کے جانشینوں نے اگلے سو برسوں میں ایک ایسی عظیم الشان سلطنت قائم کی جو انسانی تاریخ کی سب سے وسیع سلطنتوں میں شمار ہوتی ہے۔ یہ سلطنت عمدہ نظم و نسق کے امتزاج اور علمی و فکری سرپرستی کے باعث پروان چڑھی۔

ہر کمال کا زوال ہوتا ہی ہے۔ بنو امیہ نے اسلام کے رہنما اصولوں کو ترک کر دیا، ثقافت کو گھن لگ گیا اور پھر بھلا سیاست کیسے پیچھے رہتی۔ مشہور و معروف اسلامی مورخ رفیق زکریا لکھتے ہیں:

> ''اسلامی اخوت سے جو رنگ، نسل اور زبان سے بالاتر تھا، بنو امیہ کے انحراف نے ان کے زوال کی بنیاد رکھی۔''

(ماخذ: The Struggle Within Islam، وائکنگ، 1988)

آگے چل کر ہم بتائیں گے کہ بنو امیہ کی حکومت کا خاتمہ ان ہی کے ایک سپہ سالار ابو العباس کے ذریعہ ہوا، جو نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے خاندان کے ایک دور کے رشتے دار تھے۔ ان کے ساتھ عباسی خلافت کا آغاز ہوا، اور یوں مسلم تاریخ میں عروج، زوال اور احیاءِ نو کا ایک نیا دور شروع ہوا۔

خلافت ایک ایسا نظام حکومت تھا جو حکمراں خاندانوں کے الٹ پھیر سے محفوظ رہا۔ آخر اس نظام کی طاقت اور بقا کا راز کیا تھا؟ تین براعظموں میں پھیلے ہوئے سنی مسلمان مختلف بادشاہوں کے اطاعت گذار ہونے کے باوجود، صرف ایک کو ہی خلیفہ تسلیم کرتے تھے۔ اتنے بڑے منصب کے لیے یقیناً کسی معقول جواز کی ضرورت تھی۔ خلافت کا یہ جواز سولہویں صدی میں ترک علما نے عظیم عثمانی سلطان سلیم اول کے دور میں قاہرہ سے حاصل کیا۔ انہوں نے اپنے دعوے میں پانچ دلیلیں دیں:

1 قوت شمشیر (یعنی قوت وغلبہ)
2 اہل عقد (علماء ومشائخ کی مشاورتی کونسل) کی توثیق
3 سابق خلیفہ کی جانب سے نامزدگی
4 حرمین شریفین کی نگہبانی
5 نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی تبرکات کی ملکیت (داڑھی مبارک کے بال اور چادر مبارک) جو قاہرہ کے برائے نام خلیفہ نے سلطان سلیم کو بطور 'تحفہ' عطا کیا اور پھر خلافت بھی منتقل کر دی

ان پانچوں میں سب سے زیادہ اہمیت دو چیزوں کی تھی: شمشیر کی قوت اور حرمین کی نگہبانی۔ درحقیقت یہ دونوں ایک دوسرے کے لیے لازم وملزوم ہیں، کیونکہ حرمین کا دفاع تلوار کی طاقت کے بغیر ممکن نہیں۔ خلافت کے دعوے کے لیے شرط تھی کہ خلافت کی حامل عرب سرزمین اور مقدس مقامات کا دفاع کر سکے۔

اسی لیے اندلس کے اموی حکمران یا ہندوستان کے مغل بادشاہوں کی طرف سے خلافت کے ممکنہ دعوے کو اس بنا پر لائق اعتناء نہیں سمجھا گیا کیوں کہ وہ حرمین شریفین کی نگہبانی نہیں کر سکتے تھے۔

عوام کی نظر میں تسلیم شدہ خلیفہ ہمیشہ مدینہ، دمشق، بغداد یا ترکوں کے دور میں قسطنطنیہ (استنبول) سے حکمرانی کرتا رہا۔ حج چونکہ اسلام کے ارکان میں سے ایک اہم رکن ہے، اس لیے دنیا بھر کے مسلمان اپنے خلیفہ سے توقع رکھتے تھے کہ وہ نہ صرف مکہ ومدینہ کی حفاظت کرے بلکہ ان تک رسائی کے راستوں کو بھی محفوظ رکھے۔

ایران کے سلاطین مثلاً 1306ء میں محمود عبداللہ نے کبھی خلافت کا دعویٰ نہیں کیا، کیونکہ شیعہ عقیدے کے مطابق خلافت یا امامت صرف نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے خاندان کے کسی فرد کا حق ہے۔ ان کے نزدیک حضرت علیؓ سے لے کر امام محمد العسکریؒ تک بارہ ائمہ کا سلسلہ مکمل ہوتا ہے۔

''خلیفہ'' جسے انگریزی میں کیلف (Caliph) کہتے ہیں عربی لفظ ''خَلَفَ'' سے ماخوذ ہے ''پیچھے چھوڑنا''۔ اسی لیے خلیفہ کا مطلب جانشین یا نائب ہوتا ہے۔ قرآن مجید میں اللہ تعالیٰ نے دو شخصیات کو اپنا خلیفہ قرار دیا ہے۔

پہلا خلیفہ حضرت آدمؑ کو بنایا گیا۔ جیسا کہ سورۃ بقرہ (آیت 30) میں اللہ تعالیٰ فرماتا ہے:

> ''اور جب تیرے رب نے فرشتوں سے کہا: میں زمین میں ایک خلیفہ بنانے والا ہوں۔''

فرشتوں نے اس پر سوال اٹھایا:

> ''کیا تو زمین میں اسے بھیجے گا جو وہاں فساد کرے گا اور خون بہائے گا، حالانکہ ہم تیری تسبیح اور حمد بیان کرتے ہیں اور تیری پاکی بیان کرتے ہیں؟''

گویا فرشتے سمجھ رہے تھے کہ وہ کچھ ایسا جانتے ہیں جو اللہ نہیں جانتا، اور اس گمان پر اللہ تعالیٰ نے ان کو تنبیہ فرمائی۔ پھر اللہ نے آدمؑ کو علم عطا کیا اور حکم دیا کہ فرشتے انہیں سجدہ کریں۔ سب نے سجدہ کیا، سوائے ابلیس کے۔ اس نے انکار کرتے ہوئے کہا کہ ''میں آگ سے پیدا کیا گیا ہوں اور آدم مٹی سے۔'' اللہ تعالیٰ نے اسے قیامت تک کے لیے لعنت کا مستحق قرار دیا۔

دوسرے خلیفہ حضرت داوٗدؑ تھے۔ سورۃ ص (آیت 26) میں اللہ تعالیٰ فرماتا ہے:

> ''اے داوٗد! ہم نے تمہیں زمین میں خلیفہ بنایا، پس لوگوں کے درمیان حق کے ساتھ فیصلہ کرو۔''

حضرت عمرؓ نے اس خیال کو رد کر دیا کہ کوئی انسان اللہ کا خلیفہ ہو سکتا ہے۔ ان کے مطابق صرف

حضرت آدمؑ اور حضرت داؤدؑ ہی اس درجے کے مستحق تھے۔ ان کے بعد آنے والا کوئی بھی خلیفہ، زیادہ سے زیادہ نبی کریم ﷺ کا نمائندہ ہوسکتا ہے، اللہ کا نہیں۔

تاہم بعد کے بعض مسلم حکمران، خاص طور پر عباسی خلفاء، اس فتنہ میں مبتلا ہو گئے کہ خود کو "زمین پر اللہ کا سایہ" (ظل الٰہی) کہلوانے لگے۔ یہ دعویٰ درحقیقت ان کی خود پسندی کی عکاسی کرتا تھا، نہ کہ اللہ کے کسی حکم کی۔

سنی خلیفہ کا انتخاب تکنیکی طور پر مسلمانوں کی اجتماعی رضا مندی سے ہوتا ہے۔ لیکن یہ اصول عملاً حضرت معاویہؓ کے بعد ترک کر دیا گیا، لیکن نظریاتی طور پر برقرار رہا۔ عثمانی سلطنت میں خلافت کی تلوار ایک علیحدہ رسمی طریقے سے سلطان کو سونپی جاتی تھی، جو موروثی نہیں بلکہ علما کونسل کی منظوری سے ہوتی تھی۔ اگرچہ اس مذہبی انتخاب کا نتیجہ پہلے سے طے شدہ ہوتا تھا، عوامی رائے عامہ کو جانے بغیر۔

لیکن خلیفہ کے انتخاب کی یہ تلوار دو دھاری تھی۔ جنہیں انتخاب کا حق تھا انہیں معزول کرنے کا حق بھی حاصل تھا۔ اگر کوئی خلیفہ اللہ کے قانون سے انحراف کرتا ہے تو مومنین پر لازم ہو جاتا ہے کہ وہ اس کی اطاعت نہ کریں۔ نبی کریم ﷺ کی مشہور حدیث... "اللہ کی نافرمانی میں کسی کی اطاعت نہیں" اس اصول کو شرعی بنیاد فراہم کرتی ہے۔ خلیفہ یا سلطان، اللہ کے قانون سے بالاتر نہیں ہوسکتا۔

یہ بات جدید مسلم سیاست کی فکری ساخت کو سمجھنے میں نہایت اہم ہے۔ عثمانی سلطنت میں یہ اختیار عملاً استعمال بھی ہوا، خاص طور پر اس وقت جب لوگوں کو محسوس ہوا کہ خلیفہ نے اللہ کے ساتھ کیا گیا عہد توڑ دیا ہے یا اسے معطل کر دیا گیا ہے۔

ایک مثال سے اس کا اندازہ ہوسکتا ہے۔ عثمانی سلطنت کا چڑھتا ہوا سورج سولہویں صدی تک پہنچتے پہنچتے رک سا گیا، اور پھر سلطان ابراہیم (جو تاریخ میں 'پاگل ابراہیم' کے نام سے مشہور ہے) کے آٹھ سالہ دور حکومت میں اور پھر اس کے بیٹے سلطان محمد چہارم (1687–1648) کے طویل عہد حکومت میں زوال کا شکار ہو گیا۔ قسطنطنیہ میں ان دونوں کے بارے میں ایک مقولہ زبان زد عام

وخاص ہو چکا تھا جو دراصل ترکی زبان میں تھا:

The father was mad for the cunt; The son is mad for the hunt.

(باپ عاشق خاتون تو بیٹا شکار کا دیوانہ)

عثمانی سلطنت میں ابراہیم کے دور سے پہلے ہی اصلاح پسند تحریکیں مساجد میں سر اٹھانے لگی تھیں۔ ایک گروہ، جسے قادیزادے لیئر (Kadizadeliler) کہا جاتا تھا، شدت پسند نظریات کی تبلیغ کر رہا تھا۔ یہ لوگ موسیقی، رقص، ریشمی لباس، مزارات کی زیارت، درویشی طریقے، اور حتیٰ کہ اذان دینے کے لیے میناروں تک کو حرام قرار دیتے تھے۔ وہ اسلام کے ایک ایسے سخت گیر تصور کی وکالت کر رہے تھے جو مسلمانوں اور سلطنت دونوں کو نئی عظمت عطا کر سکے۔ یہی خیالات بعد میں وہابی تحریک میں بھی سنائی دئے۔ 1656 میں وزیر اعظم کوپرولو محمد پاشا نے ان قادیزادے مبلغین کو قبرص جلاوطن کر دیا۔ تاہم وہ اس مذہبی غصے کی جڑوں کو خوب سمجھتے تھے۔ جب 31 اکتوبر 1661 کو سلطان ان کی عیادت کے لیے آیا تو انہوں نے مرتے وقت یہ آخری نصیحت کی:

> ''ریاست کو دین اور انصاف پر استوار ہونے کی ضرورت ہے... ایک مسلم سلطنت کے یہی دو بنیادی ستون ہیں۔''

1683 میں عثمانیوں نے یورپ میں ایک بڑی پیش قدمی کی جس میں تقریباً فتح حاصل ہونے ہی والی تھی جو اچانک ایک ہولناک شکست میں بدل گئی۔ قرا مصطفیٰ پاشا کو ویانا کے دروازوں پر رومن سلطنت، پوپ، وینس اور پولینڈ کے اتحاد نے شکست دی۔ مصطفیٰ پاشا کو اپنی ناکامی کی قیمت جان سے ہاتھ دھو کر چکانی پڑی، مگر اس شکست سے زوال کا ایک واضح سلسلہ شروع ہو چکا تھا۔ 1686 میں بُدا آسٹریا کے قبضے میں چلا گیا اور 1688 میں بلغراد بھی ہاتھ سے نکل گیا۔ قسطنطنیہ بھی خطرے کی زد میں آ گیا، اور لوگ خوف کے مارے شہر سے نقل مکانی کرنے لگے، جس کے نتیجے میں جائیدادوں کی قیمتیں بری طرح گر گئیں۔ اس سب کے باوجود، سلطان محمد چہارم شکار کے شوق میں مگن رہا۔

1680 میں کوپرولو فضل مصطفیٰ پاشا وزیر اعظم بنے۔ ان میں وہ تمام خوبیاں تھیں جو سلطان میں مفقود تھیں: ایمان، دیانت، شجاعت اور دور اندیشی۔ 8 نومبر 1687 میں انہوں نے اسلامی اصول

کے تحت ایک اہم قدم یہ اٹھایا کہ اگر کوئی بادشاہ اللہ کے قانون سے انحراف کرے تو اس کی اطاعت واجب نہیں رہتی۔ انہوں نے علما کی ایک مجلس بلائی اور بادشاہ کے خلاف ایک عرضداشت پڑھی جس میں مطالبہ کیا گیا کہ:

''ایک ایسا بادشاہ جو صرف شکار کے لطف میں مگن ہے، اسے معزول کر دیا جائے۔''

فضل مصطفی علما کو لے کر خاموشی سے محل تک گئے۔ علما نے کسی قسم کا احتجاج نہیں کیا۔ محل میں سلطان کے بھائی سلیمان چالیس برس سے حرم میں چھپے ہوئے تھے۔ جیسے ہی انہیں خبر ملی کہ کچھ لوگ دربار میں آئے ہیں، وہ سمجھے کہ شاید سلطان نے انہیں قتل کروانے کے لیے بھیجا ہے۔ لیکن ان کے تعجب کی انتہا نہ رہی جب انہیں حرم سے نکال کر تخت شاہی پر بٹھا دیا گیا۔ مگر وہ بھی کوئی بہتر حکمران ثابت نہیں ہوئے، اور جلد ہی انہیں معزول کر کے ان کے تیسرے بھائی احمد ثانی کو 1691 میں تخت پر بٹھا دیا گیا۔

اس وقت تک فضل مصطفی پاشا وزیر اعظم (صدر اعظم) بن چکے تھے، اور انہوں نے حکومت کو قرآن کے قریب تر اصولوں پر چلانا شروع کیا۔ ایمان اور احیاء نو کا باہمی تعلق ایک بار پھر تقویت پکڑ گیا۔ 6 نومبر 1689 کو قسطنطنیہ میں برطانیہ کے سفیر سر ولیم ٹرمبل نے لارڈ ناٹنگھم کو لکھا:

''فضل مصطفی پاشا پہلے ہی اس ارادے کا اظہار کر چکے ہیں کہ وہ حکومت کو قدیم طریقوں کے مطابق استوار کریں گے۔''

اور یہ بات شاندار انداز میں درست ثابت ہوئی۔ خود روس کا عظیم زار پیٹر اعظم 1711 میں اس وقت شکست کھا گیا جب وہ قسطنطنیہ کو مسیحیت کے لیے دوبارہ حاصل کرنے کا خواب دیکھ رہا تھا۔ 1738 میں بلغراد بھی عثمانیوں کو واپس مل گیا۔ اگرچہ ان کامیابیوں کے کئی اسباب ہو سکتے ہیں، مگر مسلمانوں نے اسے اسلام کی قدیم اقدار کی طرف واپسی کا نتیجہ قرار دیا۔ یہ بھی کہا جا سکتا ہے کہ خلافت کا نظام حکومت خلفاء کی کمزوریوں سے زیادہ طاقتور ثابت ہوا، اور یہ کہ شریعت اسلامیہ نے مسلمانوں کو بہت سی کوتاہیوں سے بچا لیا۔ قدیم طریقے ایک بار پھر کامیاب ثابت ہوئے۔

شریعت یعنی اسلامی قانون ایمان کی بنیاد ہے۔ قرآن کے بعد شریعت کی اساس سنت (یعنی نبی

کریم ﷺ کا طرزِ عمل) اور حدیث (یعنی آپ ﷺ کے اقوال) پر قائم ہے۔ اس کے ساتھ ساتھ حالات اور ضروریات کے مطابق چند اصول بھی نافذ کیے جا سکتے ہیں، جیسے:

- اجماع (امت کا اجتماعی اتفاق)
- اجتہاد (انفرادی فکری کوشش)
- قیاس (کسی نظیر سے حکم اخذ کرنا)
- استحسان (عدل اور مصلحت کی بنیاد پر فیصلہ)
- استصلاح (عوامی مفاد کو مقدم رکھنا)
- عرف (رائج الوقت عادات)
- استدلال (قانونی منطق سے حکم اخذ کرنا)

فتویٰ دراصل کسی معتبر عالم دین کی شریعت کے حوالے سے دی گئی رائے ہوتی ہے۔ خلیفہ پر لازم ہے کہ وہ شریعت کا محافظ ہو، تاکہ دارالاسلام، یعنی اسلامی معاشرہ قائم رہے۔ مسلمان کے لیے یہ ضروری نہیں کہ وہ کسی اسلامی ریاست میں رہے، لیکن اسے یہ حق ضرور حاصل ہونا چاہیے کہ وہ قانون الٰہی کے مطابق زندگی گزار سکے۔ اگر یہ حق چھین لیا جائے، تو وہ علاقہ دارالحرب بن جاتا ہے، اور وہاں جہاد فرض ہو جاتا ہے۔

اسلامی فقہ میں تاریخ کے نشیب و فراز کو سمیٹنے کی مکمل گنجائش موجود ہے، البتہ کسی دوسرے قانون کے نفاذ کی اجازت نہیں۔ مسئلہ تب پیدا ہوتا ہے جب دیگر تہذیبوں، بالخصوص مغربی دنیا، کے اثرات اسلامی معاشروں پر مسلط ہونے لگتے ہیں۔ یہ تہذیبی کشمکش آج بھی موجود ہے، خاص طور پر جب مغربی معاشرتی اقدار کو جدیدیت، سائنس، اور ترقی کا مترادف سمجھا جاتا ہے اور اسلامی ورثے کو فرسودہ یا رجعت پسند کہہ کر رد کر دیا جاتا ہے۔ کچھ مسلم معاشرے میں پردے کی سختیاں جہاں مسلم موقف کو کمزور کرتی ہیں، وہیں مغربی معاشروں میں ہیمبر گر کلچر کی زیادتیاں بھی ان کے ماڈل پر سوالیہ نشان ہیں۔ مگر نہ برقع اس بحث کی اہمیت کو کم کرتا ہے، نہ ہیمبر گر۔ یہ مباحث اصل میں تہذیبی شناخت اور فکری خودمختاری سے وابستہ ہیں۔ اسلامی تاریخ اس قسم کی کشمکش سے پہلے بھی دو چار ہو چکی ہے۔

ابھی صلاح الدین ایوبی نے تیسری صلیبی جنگ میں مسلمانوں کو مغرب کے حملوں سے بچایا ہی تھا کہ مشرق سے ایک اور طوفان اُٹھا، جو بخارا اور سمرقند سے ہوتا ہوا بغداد تک سب کچھ تباہ کرتا چلا گیا۔ ہلاکو خان... جو قبلائی خان کا بھائی اور چنگیز خان کا پوتا تھا... مسلمانوں کو قرآن کی ان آیات سنا کر طعنہ دیتا تھا جن میں ایمان سے روگردانی کرنے والوں کے لیے ہلاکت کی وعید دی گئی ہے۔ وہ فخر سے کہتا: ''میں اللہ کا قہر ہوں!''

مسلمانوں کو ہلاکو خان کے قہر سے بچانے کے لیے ایک معجزے کی ضرورت تھی جو اس بار مصر سے آیا۔ بیبرس جو ابھی حال ہی میں مملوک سلطان بنے تھے، انہوں نے عین جالوت کے مقام پر منگولوں کو شکست دے کر دنیا کو حیرت زدہ کر دیا، ان کے خطرے کا خاتمہ کیا اور پورے خطے کی سب سے بڑی طاقت بن کر ابھرے۔ اسی مایوسی کے دور میں، عوامی سطح پر ایک بڑی اصلاحی تحریک اخوان الصفاء (یعنی ''پاکیزہ بھائیوں'' کی جماعت) بھی ابھر کر سامنے آئی۔ اس تحریک کے رہنما زاہد کا مرکز بصرہ میں تھا، اور وہ کسی بھی قسم کے تنگ نظر یا سخت گیر عالم نہیں تھے۔ وہ قرآن کے عقلی فہم کے قائل تھے، اور اسی کو مسلمانوں کی کھوئی ہوئی عظمت کی واپسی کا واحد راستہ سمجھتے تھے۔ مسلمانوں کے اعتماد کی بحالی میں کچھ حیران کن واقعات بھی شامل تھے: ہلاکو کا بیٹا مسلمان ہو گیا، اور اس تبدیلی نے ایک ترک قبیلے کے سردار عثمان کو بھی متاثر کیا، جنہوں نے اسلام قبول کیا اور بعد میں عثمانی سلطنت کی بنیاد رکھی۔ صرف پچاس سال کے اندر، بغداد کی منگولوں کے ہاتھوں تباہی کے بعد، تین بڑی مسلم سلطنتیں وجود میں آئیں: صفوی سلطنت (ایران میں)، عثمانی سلطنت (ترکی میں) اور مغلیہ سلطنت (ہندوستان میں)

مملوک خود بھی وسط ایشیا سے تعلق رکھتے تھے، اور خواہ وہ پہلے مسلمان ہوں یا کافر، حقیقت یہی ہے کہ اس وقت اصل طاقت کا مرکز وسطی ایشیا ہی تھا۔ ایک نیا ثقافتی تعلق وجود میں آیا جو عرب-ایرانی ثقافت سے مختلف تھا۔ منگولوں نے اسلام قبول کرنے کے بعد بھی ان چیزوں کی سینے سے لگائے رکھا جنہیں وہ ماضی میں عظمت اور طاقت کا راز سمجھتے تھے۔ ان میں سب سے نمایاں تھا چنگیز خان کا مشہور قانون ''یاسا''، جسے وہ اپنی عالمی طاقت بننے کا اصل راز مانتے تھے۔ مشہور مؤرخ جے جے

سانڈرز نے اپنی کتاب The History of the Mongol Conquests (راؤٹلیج اینڈ کیگن پال، لندن، 1971) میں یاسا کے بارے میں لکھا:

''یاسا، جس کا مکمل متن اب ہمارے پاس موجود نہیں، روشن خیالی اور توہم پرستی کا ایک عجیب امتزاج تھا۔ اس میں مذہبی رواداری کو قانونی تحفظ حاصل تھا، ہر مذہب کے علما کو ٹیکس سے مستثنیٰ قرار دیا گیا تھا، چلتے پانی میں ہاتھ دھونا یا پیشاب کرنا ممنوع تھا (کیونکہ بہتا پانی 'زندہ' اور مقدس سمجھا جاتا تھا)، اور جاسوسی، (میدان جنگ سے) فرار، چوری، زنا، اسلامی طریقے سے جانور ذبح کرنا، یہاں تک کہ کسی تاجر کی تیسری بار دیوالیہ پن پر سزائے موت دی جاتی تھی... ایک توہم پرستانہ عقیدہ یہ تھا کہ یہی قانون منگولوں کی کامیابی کا راز ہے۔ اس لیے یاسا کو وسیع پیمانے پر اپنایا گیا، یہاں تک کہ مملوک مصر میں بھی اسے ایک ترمیم شدہ شکل میں نافذ کیا گیا۔''

یاسا کی کئی باتیں مملوک سلطنت کے قانون میں چپکے سے شامل کر لی گئیں، جس پر روایتی علماء سخت نالاں تھے۔ معاشرتی سطح پر، منگول نے اپنے ساتھ مختلف ہیئر اسٹائل اور طرز لباس بھی ساتھ لائے، بالکل ویسے ہی جیسے بعد میں برطانوی نوآبادیاتی حکمرانی نے مقامی طرز زندگی کو متاثر کیا تھا۔ برنارڈ لیوس اپنی کتاب The Political Language of Islam (یونیورسٹی آف شکاگو پریس، 1988) میں لکھتے ہیں کہ منگول اثرات نے:

''ایسے حکمران طبقے کو جنم دیا جو مسلمان نام رکھتے تھے، اسلام کا دعویٰ کرتے تھے، لیکن غیر مسلم قوانین نافذ کرتے اور چلاتے تھے۔ یوں وہ اہل ایمان کی نظر میں اسلامی معاشرے کے بنیادی تانے بانے کو کھوکھلا کرنے والوں میں سے تھے جس کی حفاظت مسلمانوں کی اولین ذمہ داری ہے۔ اسلامی تاریخ کے چودہ صدیوں میں بہت کم مسلم حکومتیں ایسی گزری ہیں جنہوں نے شریعت پر مکمل اور سختی سے عمل کیا ہو۔ لیکن جہاں ان سے کوتاہی ہوئی، وہ یا تو غلطی سے تھی یا توجہ نہ دینے سے... نہ کہ براہِ راست مخالفت کے ذریعے۔''

تاہم، انیسویں اور بیسویں صدی کی جدید مسلم ریاستوں میں شریعت کو صرف نظر انداز نہیں کیا گیا بلکہ بعض اہم شعبوں میں اسے واضح طور پر منسوخ کر کے غیر اسلامی قوانین سے بدل دیا گیا۔ برنارڈ لیوس کے الفاظ میں:

> ''یہ سب سے بڑا دھوکہ تھا، سب سے بڑی تباہی... یہاں تک کہ کافروں کی فتح و حکمرانی سے بھی بدتر۔ کیونکہ یہ سب کچھ اسلام کے نام پر کیا گیا اور مسلمانوں کی وفاداری کو ڈگمگانے، اور ان کے دین کو مٹانے کی کوشش کی گئی۔

جو لوگ کفریہ قانون نافذ کرتے ہیں وہ خود کافر ہیں، اور اگر وہ مسلمان ہونے کا دعویٰ کرتے ہیں تو وہ مرتد ہیں... اور ان کے ساتھ مرتدوں جیسا سلوک ہونا چاہیے۔''

عثمانی خلفاء نے حتی الامکان شریعت کو رائج کرنے کی کوشش کی جنہوں نے بالآخر پورے خطے کو ایک وحدت اور استحکام دیا۔ مگر جب یورپ کی پیش قدمی، اور بیسویں صدی میں ترک اصلاح پسندوں کی اندرونی تحریک نے خلافت کو ہلا کر رکھ دیا، تو مصطفیٰ کمال نے اسے مکمل طور پر ختم کر دیا۔ ویسے بھی، اس وقت تک خلیفہ محض ایک علامتی شخصیت بن چکے تھے۔ پہلی عالمی جنگ کے دوران برطانیہ اور فرانس کی افواج نے مقدس مقامات کا کنٹرول پہلے ہی چھین لیا تھا۔ عرب مسلمان اس تبدیلی پر زیادہ پریشان نہ تھے۔ کچھ عربوں کو ترکوں کے خلاف جاری کردہ فتوؤں نے تسلی دی، تو کچھ ابھرتی ہوئی عرب قوم پرستی سے مطمئن تھے، اور کچھ کو برطانوی پاؤنڈ کی چمک دمک نے خاموش کر دیا۔ لیکن دنیا میں سب سے بڑی مسلم آبادی والے ہندوستان میں ایک عظیم اسلامی طوفان اٹھا۔ مسلمانوں نے برطانیہ کی حرمین پر گرفت کے خلاف شدید غصے کا اظہار کیا، اور جب مہاتما گاندھی نے اس تحریک میں ہندو اور سکھ قوم پرستی کی گھن گرج شامل کی، تو تاریخ کی سب سے طاقتور عیسائی سلطنت بھی لڑکھڑا گئی۔

جب نبی کریم ﷺ نے اپنے آخری ایام میں فرمایا کہ ''جزیرہ عرب میں دو دین باقی نہ رہیں'' تو ان کا مطلب کیا تھا؟ یہ تو واضح ہے کہ نبی کریم ﷺ نے یہ نہیں فرمایا تھا کہ دنیا میں دو مذاہب باقی نہ رہیں۔ دراصل اسلامی فقہ کا پورا ایک باب غیر مسلموں سے تعلقات کے بارے میں ہے، جس

سے یہ صاف ظاہر ہے کہ اسلام ہمیشہ اس حقیقت کو تسلیم کرتا رہا ہے کہ دنیا میں ایسے لوگ بھی موجود ہوں گے جو اسلام کو قبول نہیں کریں گے۔ نبی کریم ﷺ کے وصال کے بعد نومولود مسلم معاشرہ جن مسائل سے دوچار ہوا، وہ حضرت عائشہؓ کے قول بلیغ ''سرد رات میں بارش میں بھیگی بھیڑوں'' کی مانند تھا۔ ان کے سامنے تین بڑے چیلنج تھے: مرتدین، یہود اور نصاریٰ۔

یہود اتنے طاقتور نہیں تھے کہ کوئی سنجیدہ خطرہ بن سکتے۔ اصل خطرہ مرتدین سے تھا... یعنی وہ قبائل جنہوں نے نبی کریم ﷺ کی زندگی میں اسلام قبول کر لیا تھا، لیکن اب وہ ابوبکرؓ کی قیادت کو تسلیم کرنے سے ہچکچا رہے تھے۔

پہلے خلیفہ حضرت ابوبکر صدیقؓ نے اس چیلنج کا بڑی قوت سے مقابلہ کیا اور ''جنگِ ارتداد'' کے نام سے معروف مہم میں ان تمام قبائل کو شکست دے دی۔

یہ جنگیں جو حضرت ابوبکرؓ کے دورِ خلافت کا بڑا حصہ رہیں، نہ صرف مسئلہ ارتداد کو ختم کرنے کا ذریعہ بنیں، بلکہ غداروں سے نمٹنے کی ایک مستقل مثال بھی چھوڑ گئیں۔ مرتدین کے خلاف جنگ کے احکام کافروں سے جہاد کے مقابلے میں کہیں زیادہ سخت ہیں: کوئی امان نہیں، رحم بہت محدود، صلح کا امکان نہ ہونے کے برابر، اور اگر وہ اسلام میں واپس نہ آئیں تو اس کا انجام صرف موت ہی باقی رہ جاتی ہے۔

اب سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ جب نبی کریم ﷺ نے فرمایا: ''جزیرۂ عرب میں دو دین باقی نہ رہیں'' تو ان کے ذہن میں کون سا مذہب تھا؟ مدینہ کے شمال میں ایک بڑی سلطنت تھی جو ایک ایسے دین کے نام پر قائم تھی جسے اللہ تعالیٰ نے نبی کریم ﷺ کے ذریعے منسوخ کر دیا تھا۔ کیونکہ آپ ﷺ حضرت عیسیٰؑ کے بعد آنے والے اللہ کے آخری نبی تھے.... لہٰذا حضرت عائشہؓ نے جن تین عناصر کو اسلام کے ابتدائی دور میں فتنہ وفساد کا ذریعہ قرار دیا وہ مرتدین، یہود اور نصاریٰ تھے، اور ان میں تیسرے نمبر پر نصاریٰ تھے، جو اسلام کے لیے سب سے زیادہ نظریاتی چیلنج بن کر سامنے آئے۔

4

# عالم اسلام کا جغرافیہ

مسلمانوں کی ایک تہائی جماعت شکست کھائے گی، جسے اللہ کبھی معاف نہیں کرے گا۔
ایک تہائی قتل کر دی جائے گی، جو بہترین شہداء میں شمار ہوں گے۔ اور ایک تہائی فتح یاب
ہوگی اور قسطنطنیہ کو فتح کرے گی۔

(صحیح بخاری کی روایت، جس میں نبی اکرم ﷺ نے بازنطینی رومی سلطنت کے خلاف جہاد کا ذکر فرمایا)

رینالڈ آف شیاتیلوں (Reynauld of Chatillon) ایک فرانسیسی مہم جو تھا جو 1147 میں دوسری صلیبی جنگ کے موقعہ پر مقدس سرزمین گیا تھا۔ وہ کوئی مہذب شخص نہیں تھا۔ وہ اپنے مقتولین کے سروں کو خواہ وہ مسلمان ہوں یا عیسائی، لکڑی کے ایک صندوق میں رکھتا اور اپنے قلعہ کراک کی بلند فصیلوں سے نیچے پھینک دیتا تھا، اس امید پر کہ جب وہ نیچے پتھروں سے ٹکرائیں گے تو ہوش میں آ جائیں گے۔ جب انطاکیہ کے پادری نے عیسائی جزیرے قبرص پر حملے کے لیے مالی مدد دینے سے انکار کر دیا تو اسے برہنہ کر کے شہد میں لت پت کیا گیا اور پھر مشرق وسطیٰ کے تپتے سورج تلے چھوڑ دیا گیا تاکہ وہ مکھیوں کی خوراک بن جائے۔ بری طرح جھلس جانے والے پادری نے بالآخر مطلوبہ رقم ادا کر دی۔

قبرص میں رینالڈ کے غارت گروں نے اندھا دھند عصمت دری اور لوٹ مار کے ذریعے اس کی درندگی کو مزید شہرت بخشی۔ جب 1160 میں وہ مویشی چوری کرتے ہوئے مسلمانوں کے ہاتھوں

گرفتار ہوا تو تمام مذہبی طبقوں میں خوشی کی لہر دوڑ گئی۔ وہ چودہ سال قید میں رہا اور بالآخر 120000 سونے کے دینار کے عوض رہا ہوا۔ اب اس کی نفرت کا واحد مرکز صرف مسلمان تھے۔ اس نے قسم کھائی تھی کہ وہ مسلمانوں کے مقدس شہروں کی بے حرمتی کرے گا، ''اس منحوس اونٹ والے'' کی لاش کو مدینہ کی قبر سے نکالے گا، اور کعبہ میں لگے مقدس پتھروں کو پاش پاش کرے گا۔

1182 میں رینالڈ نے اپنے خشکی میں قائم قلعے میں جہازوں کا ایک بیڑا تیار کیا۔ اس نے ان جہازوں کو بحر مردار میں تجربے کے لیے بھیجا، پھر انہیں کھول کر دوبارہ جوڑتے ہوئے صحرا سے گھسیٹ کر بحر احمر کے کنارے ایلات تک پہنچایا۔ یہی اس کا متحرک قزاقی مرکز بن گیا، جہاں سے اس کے بحری قزاقوں نے مسلم دیہات اور بستیوں کو لوٹنا شروع کیا اور مقدس شہروں پر حملے کی منصوبہ بندی کرنے لگے۔ ان کے اس حملے کو صلاح الدین ایوبی کے بھائی ملک العادل نے مدینہ سے چند میل کے فاصلے پر روک دیا تھا۔ تاریخ میں کسی غیر مسلم حملہ آور ٹولی کا کسی مقدس شہر کے اتنے قریب پہنچ جانے کا یہ پہلا واقعہ تھا۔

ایسے شدید جذبات اب ہزار برس بعد ماند پڑ چکے ہیں، مگر ہر دور میں اسلام کی پیدائش سے شروع ہونے والے اس تصادم کی نوعیت بدل جاتی ہے۔ یہ تہذیبوں کا تصادم نہیں ہے، کیونکہ اسلام اور عیسائیت دونوں ایک سے زائد تہذیبوں اور ثقافتوں کو اپنے اندر سموئے ہوئے ہیں۔ زیادہ تر حالات میں اس تصادم کی اصل وجہ، زمینی قبضہ اور اقتدار کی سیاسی کشمکش ہوتی ہے، مزید براں اس کے پس پشت مبادیات، عقائد اور نظریاتی اختلاف بھی کارفرما ہوتے ہیں۔

مسلمانوں کے لیے محمد ﷺ ایک انسان ہیں اور انبیاء کے اس سلسلے کے آخری نبی، جو آدم علیہ السلام سے شروع ہوتا ہے اور عیسیٰ علیہ السلام کو بھی شامل کرتا ہے۔ جبکہ عیسائیوں کے لیے حضرت عیسیٰ خود اللہ ہیں اور انسانیت کے آخری نجات دہندہ ہیں۔ اسی لیے کلیسا کے لیے لازم ہے کہ وہ محمد ﷺ کو جھوٹا نبی قرار دے، کیونکہ اگر وہ ایسا نہ کرے گا تو پھر عیسائیت محض 611 برس پرانا دین بن جائے گا، اور عیسیٰ کا مشن ''ازلی'' تسلیم نہ کیا جا سکے گا۔

قرآن عیسائیوں کو بارہا ابراہیم کے توحیدی عقیدے کی طرف پلٹنے کی دعوت دیتا ہے، تثلیث کے

تصور سے دستبردار ہونے کا مطالبہ کرتا ہے، اور محمد ﷺ کو آخری رسول ماننے کی تلقین کرتا ہے۔ قرآن عیسیٰ علیہ السلام کی تعظیم کرتا ہے، لیکن اگر کلیسا بھی اسی طرح کی تعظیم کرنے لگے تو وہ اپنے بنیادی عقیدہ ہی کا منکر ہو جائے گا، جس کا وہ متحمل نہیں ہو سکتا۔

اسلام کی بنیاد توحید پر ہے، یعنی خدا کی وحدانیت، ایک ناقابلِ تقسیم اکائی۔ اسی لیے خدا کا بیٹا ہونا ممکن نہیں۔ سورۃ نساء کی آیت 171 میں صراحت کے ساتھ فرمایا گیا ہے:

> ''اے اہلِ کتاب! اپنے دین میں غلو نہ کرو، اور اللہ کے بارے میں سچ کے سوا کچھ نہ کہو۔ مسیح عیسیٰ ابنِ مریم تو بس اللہ کے رسول ہیں، اور اس کا کلمہ ہیں جو اس نے مریم کی طرف بھیجا، اور اس کی طرف سے ایک روح ہیں۔ پس اللہ اور اس کے رسولوں پر ایمان لاؤ، اور یہ نہ کہو کہ 'تین' ہیں۔ باز آ جاؤ، یہی تمہارے لیے بہتر ہے۔ اللہ تو بس ایک ہی ہے۔ وہ پاک ہے اس سے کہ اس کا کوئی بیٹا ہو۔''

اگلی آیت میں کہا گیا ہے کہ:

> ''مسیح کو اللہ کی بندگی کرنے میں کوئی عار نہیں۔''

تو پھر عیسائی اس بندگی سے کیونکر انکار کرتے ہیں؟

قرآن مریم علیہا السلام کی کنواری ہونے کی تصدیق کرتا ہے، مگر عیسیٰ کی الوہیت کو نہیں مانتا۔ سورۃ مریم میں ذکر ہے کہ زکریا (جسے قرآن یحییٰ کے والد کے طور پر پیش کرتا ہے) جب بوڑھے اور کمزور ہو چکے تھے، تو اللہ سے ایک وارث کی دعا کرتے ہیں جو یعقوب کی نسل کو آگے بڑھائے۔ اللہ ان کی دعا قبول کرتا ہے۔ زکریا پوچھتے ہیں: ''جب میں بڑھاپے کو پہنچ چکا ہوں اور میری بیوی بانجھ ہے، تو یہ کیسے ممکن ہوگا؟'' اللہ جواب دیتا ہے:

> ''یہ میرے لیے آسان ہے۔ میں نے تجھے بھی تو اس وقت پیدا کیا جب تو کچھ بھی نہ تھا۔''

یہاں پر وہ اشکال بھی حل ہو جاتے ہیں کہ خدا کے حکم سے پیدا ہونے والا کسی کنواری کا بچہ خدا کا بیٹا کیسے ہو سکتا ہے؟ اگر ایسا ہوتا تو پھر حضرت آدم کو خدا کا بیٹا کیوں نہیں کہا جاتا؟ جب کہ حضرت آدم کو اللہ

نے کسی ماں باپ کے بغیر اور سرے سے کسی وجود کے بغیر پیدا کیا تھا۔لیکن عیسائی حضرت آدم کو خدا کا بیٹا نہیں کہتے۔اس سے یہ واضح ہوتا ہے کہ قرآن حضرت عیسیٰ کو عظیم نبی مانتا ہے،مگر ان کی الوہیت کا انکار کرتا ہے، اسی طرح اگر کلیسا محمد صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی نبوت تسلیم کر لے،تو اس کے اپنے مذہب کی بنیاد ہی ڈھیر ہو جاتی ہے۔دونوں مذہبوں کے درمیان یہی تصادم کی جڑ ہے جو صدیوں سے چل رہی ہے۔

اسلامی فن تعمیر کا پہلا عظیم شاہکار قبۃ الصخرہ ہے جو یروشلم میں تعمیر کیا گیا، جسے اموی خلیفہ عبدالملک نے 688ء میں تعمیر کرایا تھا۔ یہ گنبد مسجد نہیں ہے۔اس میں قبلہ کی طرف رخ کرنے والی کوئی دیوار بھی موجود نہیں ہے۔مسجد الاقصیٰ کے نام سے معروف و مشہور مسجد اس قبہ کے ساتھ واقع ہے۔ سوال یہ ہے کہ عیسائیوں کے مقدس ترین شہر (یہودیوں کے مقدس ترین شہر) میں تعمیر کی گئی اس قبۃ الصخرہ کی معنویت کیا ہے؟

دوراہ داریاں، چالیس ستونوں سے گزرتی ہوئی، اس چٹان کو اپنے گھیرے میں لے لیتی ہیں جس پر یہ قبہ ایستادہ ہے۔ یہ قبہ چرچ آف دی اسینشن اور کنیسۂ قیام یا چرچ آف دی ہولی سیپلکر کے گنبد پر سایہ فگن ہے۔ یہ دیوارِ گریہ اور ہیکلِ سلیمانی جسے حضرت سلیمان علیہ السلام نے 1000 قبل مسیح کے آس پاس تعمیر کیا تھا اس سے بھی بلند ہے۔ اس دیوارِ گریہ اور ہیکلِ سلیمانی کو پہلے بابل والوں کی قیادت میں بخت نصر نے منہدم کیا۔ بعد میں حضرت عزیر علیہ السلام نے اسے دوبارہ تعمیر کیا، پھر بت پرستوں نے 167 قبل مسیح میں اس کی بے حرمتی کی جب انہوں نے اس میں بت رکھ ان کی پوجا شروع کر دی۔ ہیروڈ نے اسے بحال کیا،لیکن پھر 70ء میں طیطوس نے اسے زمیں بوس کر دیا۔

حضرت سلیمانؑ نے ہیکل ٹھیک اسی جگہ تعمیر کیا تھا جہاں حضرت ابراہیمؑ نے اپنے بیٹے کی قربانی دینے کا فیصلہ کیا تھا۔ یہودیوں کے مطابق وہ بیٹے حضرت اسحاقؑ تھے۔ مسلمانوں کے نزدیک ان کے دوسرے بیٹے حضرت اسماعیلؑ تھے۔ مسلمان انہیں کی نسل سے ہیں اور انہیں اپنا مورث اعلیٰ مانتے ہیں۔قرآن حضرت اسحاقؑ اور حضرت اسماعیلؑ دونوں کو وحی یافتہ نبی قرار دیتا ہے۔

کارن آرمسٹرانگ نے اپنی کتاب A History of Jerusalem: One City, Three Faithsہارپر کولنز، 1997) کی ایک خوشنما تعبیر میں قبۃ الصخرہ کو ایک ''اسلامی نقشہ''

قرار دیا ہے۔مسلمانوں کا عقیدہ ہے کہ اسی چٹان سے نبی کریم ﷺ نے معراج کا آسمانی سفر کیا تھا، جیسا کہ قرآن کی سورۃ بنی اسرائیل کی آیت 17:1 میں اس کا ذکر کیا گیا ہے: ''پاک ہے وہ ذات جو اپنے بندے کو راتوں رات مسجدِ حرام سے مسجدِ اقصیٰ لے گئی، جس کے گرد و نواح کو ہم نے بابرکت بنایا، تاکہ ہم اسے اپنی کچھ نشانیاں دکھائیں۔''

یہ قبۃ الصخرہ، صرف مسلم فنِ تعمیر کا ایک جیتا جاگتا نمونہ ہی نہیں، بلکہ آسمانی معراج کی ایک شاندار علامت بھی ہے۔ مگر اس کے ساتھ ساتھ یہ توحید کے کامل توازن کا آئینہ دار بھی ہے۔ اس کا بیرونی ڈھانچہ جو آسمان کی وسعتوں کی طرف بلند ہوتا ہے، اپنے اندرونی دائرے کا مکمل عکس ہے۔ یہ اس روحانی توازن کی وضاحت کرتا ہے جس میں انسانی اور ملکوتی، اندرونی اور بیرونی دنیا ایک دوسرے سے ہم آہنگ ہو کر ایک کامل وحدت تشکیل دیتی ہے۔ اس مقدس گنبد کے رنگ میں بھی ایک خاص پیغام پنہا ہے۔ اسلامی فنون میں نیلا رنگ آسمان کی وسعت کی علامت ہے، جبکہ سنہرا رنگ علم کا مظہر ہے۔ اور قرآن میں علم ہی وہ صلاحیت ہے جو انسان کو اللہ کی معرفت سے بہرہ ور کرتی ہے۔

قبۃ الصخرہ کی اندرونی محراب پر جلی حرفوں میں جو عبارت کندہ ہے وہ نبی کریم ﷺ کے معراج سے متعلق قرآنی آیات نہیں، بلکہ وہ آیات ہیں جن میں اللہ تعالیٰ عیسائیوں کو حضرت عیسیٰؑ کے پیغام میں تحریف پر سرزنش کرتا ہے۔

قبۃ الصخرہ دراصل عیسائیوں کے لیے ایک دعوت ہے کہ وہ تثلیث کو ترک کر کے توحید کی طرف لوٹ آئیں اور اللہ واحد پر ایمان لائیں۔

نظریاتی طور پر، محمد ﷺ اور حضرت عیسیٰؑ دونوں ایک دوسرے سے بالکل مختلف مثالی نمونے پیش کرتے ہیں، اور یہی فرق محمد ﷺ کی شخصیت کے خلاف منفی پروپیگنڈے کی بنیاد بن گیا۔ قرآن واضح کرتا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے مختلف زمانوں میں مختلف انبیاء کو مبعوث فرمایا، اور ہر ایک کو مخصوص فضیلت عطا کی۔ اللہ نے موسیٰؑ سے براہِ راست کلام کیا۔ وہ چالیس برس صحراؤں میں اپنی ہی قوم کے انکار اور گمراہی کے خلاف نبرد آزما رہے۔ انہیں کتاب عطا ہوئی لیکن تلوار نہیں۔ حضرت داؤدؑ بکریاں چراتے تھے، مگر بعد میں وہ جنگجو، بادشاہ، شاعر، موسیقار، اور اللہ کے خلیفہ بنے۔

حضرت عیسیٰؑ کو مدد کے لیے روح القدس عطا کیے گیے، مگر جنگ کے لیے کوئی ہتھیار نہیں دیا گیا۔ ان کا پیغام پوری طرح امن پر مبنی تھا۔ نبی آخرالزماں محمد صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی ذات گرامی میں پچھلے تمام انبیاء کرام کی خصوصیات کو جمع کر دیا گیا تھا، کیونکہ ان کا مشن پچھلے تمام انبیاء کرام سے زیادہ بڑا اور جامع تھا۔

اسلام اور عیسائیت کے درمیان قربت ہی ان کے درمیان مخاصمت کا سبب بن گئی۔ جب عیسیٰؑ خود کو ''انسان کا بیٹا'' کہتے تھے تو عیسائیوں نے انہیں ''خدا کا بیٹا'' کیوں کہا؟ یہودی بھی اہل کتاب ہیں، اور توحید کے معاملے میں اسلام سے زیادہ قریب ہیں۔لیکن وہ عیسائیت کو تسلیم نہ کر کے اسلام سے ایک نبی کی دوری پر آ کر رک گئے۔ اس پر تلون قربت کو ایک معمولی سی انسانی ضد، امنگ یا نادانی کی چنگاری بھی جلا کر خاکستر کر سکتی ہے۔

چھٹی صدی عظیم الشان سلطنتوں کے قیام کی صدی تھی۔ چین میں تانگ خاندان، ہندوستان میں ہرش وردھن، بازنطینی سلطنت میں جسٹنین، اور ایران میں انوشیروان عادل جس کا نام ہی عدل کی علامت بن گیا تھا، نے اپنے اپنے علاقوں میں عظیم الشان سلطنتیں قائم کیں۔ چونکہ طاقتور ہمسایوں کے مابین چپقلش ایک فطری عمل ہے اس لئے بازنطینی اور ساسانی سلطنتیں ایک دوسرے کے ساتھ مسلسل برسرِ پیکار رہیں۔

ساتویں صدی کی پہلی دہائی میں ایرانی بادشاہ خسرو دوم کی قیادت میں ساسانی سلطنت تقریباً ناقابل تسخیر بن چکی تھی۔ ایرانی فوجیں آرمینیا، ایشیائے کوچک اور شام کو فتح کرتی ہوئیں 610ء میں قسطنطنیہ کے دروازے پر دستک دے رہی تھیں۔ انہیں سخت حالات میں بازنطینیوں کو ایک نجات دہندہ ہراکلیوس مل گیا، جو بقول ایک معاصر مؤرخ وہ شیر کی کچھار میں گھس کر شیر کو بغیر ہتھیار کے مارنے کی طاقت رکھتا تھا۔ 611ء میں انطاکیہ ایرانیوں کے قبضے میں چلا گیا، اور 5 مئی 614ء کو یروشلم بھی فتح کر لیا گیا۔ چرچ آف دی ہولی سیپلکر کو نقصان پہنچایا گیا اور اصل صلیب کو مال غنیمت کے طور پر (True Cross) ایران لے جایا گیا۔

مشرکین مکہ نے ایران کے ہاتھوں یروشلم کی فتح پر جشن منایا۔ ان کا مطمح نظر یہ تھا کہ محمد صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم جیسے

ہی ایک توحید پرست طاقت کو شکست ہوئی ہے۔ انہوں نے یہ طعنہ دیا کہ محمد ﷺ کا اللہ یروشلم کو نہ بچا سکا۔ اسی موقع پر ایک بہت ہی ولولہ انگیز وحی نازل ہوئی، جس میں نبی کریم ﷺ اور مسلمانوں کو جلد ہی ایک اچھی خبر کی بشارت دی گئی تھی۔ یہ سورۃ روم کی (آیات 2 تا 6) تھیں جن میں کہا گیا تھا کہ:

> ''رومی قریب کی سرزمین میں مغلوب ہو گئے ہیں۔ اور وہ اپنی اس شکست کے بعد چند ہی برسوں میں غالب آ جائیں گے۔ اللہ ہی کا اختیار ہے، پہلے بھی اور بعد میں بھی۔ اور اس دن اہل ایمان اللہ کی مدد سے خوش ہوں گے۔ وہ جس کی چاہے مدد کرتا ہے اور وہ غالب ومہربان ہے۔ یہ اللہ کا وعدہ ہے اور اللہ کبھی اپنے وعدے کی خلاف ورزی نہیں کرتا، لیکن اکثر لوگ جانتے نہیں۔''

تاہم جنگ کے اگلے مراحل بظاہر اس پیش گوئی سے مطابقت نہیں رکھتے تھے۔ 616ء میں ایرانی افواج نے مصر کو اپنی سلطنت میں شامل کر لیا اور طرابلس تک جا پہنچے۔ ایک دوسرا لشکر قسطنطنیہ کے دروازے تک پہنچ گیا۔

لیکن قرآن کبھی غلط نہیں ہوسکتا۔ 622ء میں ہراکلیوس نے جنگ کا پانسہ پلٹ دیا۔ ہراکلیوس کی جنگ میں سمندر نے فیصلہ کن کردار ادا کیا تھا، اس نے ایرانیوں کو گھیرنے کے لیے بحری قوت استعمال کی۔ اس نے اپنی فوج کو بحر ایجیئن کے راستے بھیجا، اور پھر ایسس کے مقام پر ایرانیوں کو چاروں طرف سے گھیر لیا، وہی میدان جہاں تقریباً ایک ہزار برس پہلے سکندر اعظم نے فتح حاصل کی تھی۔

625ء تک ہراکلیوس کی فوجوں نے سابقہ پوزیشن بحال کر دی اور ''اصل صلیب'' کو بھی دوبارہ حاصل کر لیا۔ 628ء میں ہراکلیوس نے اپنی نذر پوری کرنے کے لیے پیدل چل کر ''اصل صلیب'' کو یروشلم میں اس کی اصل جگہ پر رکھا۔

اسی مقدس شہر میں ہراکلیوس کی موجودگی کے دوران ہی اسے ہندوستان اور یورپ کی طرف سے مبارکباد کا پیغام ملا اور پھر اسی شہر میں اسے مدینہ سے بھی ایک خط موصول ہوا۔ دراصل یہ خط رومن سلطنت کے بادشاہ کو اسلام قبول کرنے کی دعوت تھی۔

دراصل نبی اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے اسی طرح کے خطوط ایران، حبشہ، بحرین، عمان اور مصر کے حکمرانوں کو بھی ارسال کئے تھے۔ ایران کے ''شہنشاہ'' نے اس دعوتی خط کو حقارت سے ٹھکراتے ہوئے چاک کر دیا۔ اس پر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا: ''جس طرح اس نے میرا خط پھاڑا ہے، اللہ اس کی سلطنت کو بھی پارہ پارہ کر دے گا۔''

ایرانی شہنشاہ نے یمن میں اپنے گورنر، بازان کو حکم دیا کہ وہ مدینہ میں اس شخص کو گرفتار کر لے جو خود کو ایک شہنشاہ کے برابر سمجھتا ہے، اور اگر وہ حکم کی تعمیل نہیں کرتا تو اس کے ملک کو تباہ و برباد کر دے۔

نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے جواب میں فرمایا:

> ''اسے بتا دو کہ میرا دین اور میری حکومت ان حدود تک پہنچے گی جہاں خسرو کی سلطنت بھی نہ پہنچی تھی۔''

گورنر بازان بجائے اس کے کہ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو گرفتار کرتا، خود اسلام لے آیا اور یمن کو ابھرتی ہوئی اسلامی ریاست میں شامل کر دیا۔

نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو بتایا گیا کہ رومی بادشاہ کوئی خط اُس وقت تک نہیں پڑھتا جب تک اس پر مہر ثبت نہ ہو۔ چنانچہ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے چاندی کی ایک انگوٹھی بنوائی، جس پر یہ الفاظ کندہ کروائے گئے: **محمد رسول اللہ**۔ خط لے جانے کے لیے دحیہ بن خلیفہ کلبی خزرجی کو منتخب کیا گیا۔ پیغام مختصر مگر بامعنی تھا:

اللہ کے نام سے جو بے حد مہربان اور نہایت رحم کرنے والا ہے۔ یہ خط محمد، اللہ کے بندے اور اس کے رسول کی طرف سے، ہرقل، حکمرانِ روم کے نام ہے۔ ہدایت کے پیروکاروں پر سلام ہو۔ میں تمہیں اللہ کی بندگی کی طرف دعوت دیتا ہوں۔

اسلام قبول کرو، تمہیں سلامتی نصیب ہوگی۔ اسلام قبول کرو، اللہ تمہیں دہرا اجر دے گا۔ لیکن اگر تم نے اس دعوت کو مسترد کیا تو اپنی قوم کو گمراہی میں ڈال دو گے۔

ہرقل نے اس خط کو نہایت احترام کے ساتھ قبول کیا۔ اُس نے اس شخص کے بارے میں تحقیق کروائی جو خود کو ایک نیا مسیحا قرار دے رہا تھا، اور پوچھا کہ کیا کوئی ایسا مسافر موجود ہے جو حجاز سے آیا ہو؟

اتفاق سے ابوسفیان ایک قافلے کے ساتھ یروشلم میں موجود تھے۔ انہوں نے نبی کریم ﷺ کا تعارف بادشاہ کے سامنے نہایت احترام سے کرایا۔ ایران کے بادشاہ کے برعکس، ہرقل نے رسول اللہ ﷺ کی دعوت کو تحقیر سے رد نہ کیا۔

نبی کریم ﷺ کی عیسائیوں کے ساتھ براہ راست جنگ کی نوبت اس وقت پیش آئی جب آپ ﷺ نے شام کی سرحد پر واقع تبوک پر لشکرکشی کا فیصلہ کیا تاکہ بازنطینی سلطنت کی طرف سے کسی ممکنہ خطرے کا سدباب کیا جا سکے۔ کچھ مسلمانوں نے اس جہاد کی دعوت پر لبیک کہنے میں تھوڑی سی سستی دکھائی۔ اس کی ایک وجہ تو سخت گرمی تھی (کیونکہ یہ لشکر ستمبر یا اکتوبر میں روانہ ہوا)، اور دوسری وجہ بازنطینی فوج کا رعب و دبدبہ تھا۔ منافقین کے ایک شاطر گروہ نے یہ عذر لنگ پیش کیا کہ وہ شام کی عورتوں کے حسن و جمال کی وجہ سے فتنہ میں پڑ جائیں گے، اس لیے ان کے لیے مدینہ ہی میں رکنا بہتر ہے۔ فوج کی روانگی کے بعد، منافقین نے اس پر خوشی منائی کہ وہ گرمی سے بچ نکلے۔ اللہ تعالیٰ نے قرآن میں ان پر لعن طعن کرتے ہوئے فرمایا کہ جہنم کی آگ اس گرمی سے کہیں زیادہ شدید ہے۔ انہی منافقین نے واپسی کے وقت راستے میں نبی کریم ﷺ کو قتل کرنے کی ایک ناکام سازش بھی کی۔

صحیح بخاری میں ایسے کئی شواہد موجود ہیں جو ظاہر کرتے ہیں کہ نبی کریم ﷺ کے آخری ایام میں قسطنطنیہ آپ ﷺ کے پیش نظر تھا۔ کتاب الجہاد میں روایت ہے کہ نبی کریم ﷺ نے حضرت امِّ حرام نامی خاتون سے فرمایا کہ جو پہلا اسلامی بحری لشکر جہاد کے لیے روانہ ہوگا، اُس کے افراد جنت کے مستحق ہوں گے۔ امّ حرام نے پوچھا: ''کیا میں ان میں شامل ہوں گی؟''

آپ ﷺ نے فرمایا: ''ہاں۔''
پھر فرمایا: ''جو پہلا اسلامی لشکر قیصر کے شہر (قسطنطنیہ) پر حملہ کرے گا، اس کے تمام گناہ معاف کر دیے جائیں گے۔''
ام حرام نے عرض کیا: ''کیا مجھے بھی یہ سعادت حاصل ہوگی؟''
آپ ﷺ نے فرمایا: ''نہیں۔''

بخاری میں ایک اور روایت ہے جس میں نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا کہ رومیوں کے ساتھ جنگ میں مسلمان تین گروہوں میں بٹ جائیں گے: ایک تہائی کو شکست ہوگی جسے اللہ کبھی معاف نہیں کرے گا۔ ایک تہائی شہید ہوں گے جو بہترین شہداء میں شمار ہوں گے، جبکہ ایک تہائی کو فتح حاصل ہوگی، اور وہ قسطنطنیہ کو فتح کریں گے۔ حقائق نے ان کی بات کو درست ثابت کیا، لیکن یہ روایت ایک استعارہ بھی ہو سکتی ہے۔ مسلمانوں اور عیسائیوں کے درمیان تصادم میں موت، شکست اور فتح تینوں شامل حال رہی ہیں۔

مسلم افواج نے پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی وفات کے فوراً بعد عیسائی سلطنت کے خلاف محاذ کھول دیا، حالانکہ اس وقت تک مرتدین کا مسئلہ پوری طرح حل بھی نہیں ہوا تھا۔ خلیفہ اول حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ نے اپنے دو مایہ ناز سپہ سالاروں، حضرت عمرو بن العاص رضی اللہ عنہ اور حضرت خالد بن ولید رضی اللہ عنہ (وہی خالد رضی اللہ عنہ جنہوں نے احد میں مسلمانوں کو شکست دی تھی) کو شام کی طرف روانہ کیا، جہاں کی غالب اکثریت عیسائیوں کی تھی۔ خلیفہ اول کی جنگی ہدایات اپنی مثال آپ تھیں: کوئی مجاہد کسی بھی حالت میں بدعہدی نہ کرے، مالِ غنیمت میں خیانت نہ کرے، کسی لاش کی بے حرمتی نہ کرے۔ بچوں، عورتوں اور بوڑھوں کو قتل نہ کرے، درخت نہ کاٹے، کھجور کے درخت نہ جلائے، اور کسی جانور کو صرف کھانے کے لیے ہی ذبح کرے۔ راہبوں کے ساتھ تعرض نہ کرے۔ حضرت ابوبکر کے اس حکم کی وجہ سمجھ میں نہیں آتی کہ جس کے سر پر مذہبی منڈن (tonsure) ہو، اسے قتل کر دیں۔

حضرت عمرو بن العاص رضی اللہ عنہ مغرب کی طرف روانہ ہوئے، اور حضرت خالد بن ولید رضی اللہ عنہ مشرقی راستے سے عمان، درعا کے درّے (Deraa Pass)، اور دمشق کی طرف روانہ ہوئے، جو ان کا اصل ہدف تھا۔ ہرقل نے اپنی افواج درمیانی راستے سے روانہ کی تا کہ حضرت عمرو بن العاص رضی اللہ عنہ کے کمزور دستے کو شکست دے سکے۔ لیکن جنگی تاریخ کا ایک حیرت انگیز واقعہ اس وقت پیش آیا جب حضرت خالد بن ولید رضی اللہ عنہ کی اونٹ سوار فوج نے صحراؤں کو چیرتے ہوئے برق رفتاری سے حضرت عمرو رضی اللہ عنہ کے محاذ تک رسائی حاصل کی اور جنگ کا پانسہ پلٹ دیا۔ جولائی 634ء میں اجنادین کے مقام پر بازنطینیوں کو عبرتناک شکست ہوئی، اور یہ مسلمانوں کی عیسائیوں کے خلاف پہلی بڑی جنگی فتح تھی۔

ابوبکرؓ اس وقت بخار میں مبتلا تھے جب فتح کی خبر پہنچی، اوراسی ماہ 23 اگست 634ءکوان کا انتقال ہو گیا۔ عمرؓ بن خطاب خلیفہ بنے اور مجموعی فوجی سربراہی ان کے ہاتھ میں آئی۔ مسلم افواج مختلف دستوں میں کام کررہی تھیں جن کی قیادت علی الترتیب حضرت عمروؓ، حضرت شرحبیل بن حسنہؓ اور حضرت خالدؓ کررہے تھے، جبکہ حضرت ابوعبیدہؓ ان سب کے نگرانِ اعلیٰ تھے۔ دمشق حضرت ابو عبیدہؓ اور حضرت خالدؓ کی افواج کے ہاتھوں فتح ہوا۔ شہرکوسزا سے محفوظ رکھا گیا، تاہم اس کے باشندوں پرایک دیناراورایک پیمانہ گندم بطور جزیہ عائد کیا گیا۔ ہرقل اس شکست پر حیران ضرور ہوا، شکست قبول نہ کی۔

اب بھی اس کے پاس سمندری طاقت موجود تھی اور وہ شام کے لیے نئی فوج تیار کرنے کی صلاحیت رکھتا تھا۔ مسلمان پیچھے ہٹے اور یرموک کے جنوبی علاقے میں پوزیشن سنبھالی، کیونکہ وہ صحرا کواپنی پشت پر رکھ کرلڑنا پسند کرتے تھے، وہی صحرا جوان کے لیے آزادی کا استعارہ تھا اور دشمن کے لیے ہلاکت کا پیغام۔ ہرقل نے دوبارہ درعا کے درے پر قبضہ کر کے اپنی فوج کومحفوظ کرلیا۔ دونوں طرف سے چار ماہ تک جنگ کی حالت جمود میں رہی۔ لیکن مسلمانوں نے اس موقع سے بہتر حکمت عملی کے ساتھ فائدہ اٹھایا، مدینہ سے تازہ دم افواج منگوائیں اور تین اطراف سے بازنطینی فوج کوگھیرنے کی کوشش کی۔ 19 اگست 636ء کی شام ایک تیز، آنکھوں کواندھا کردینے والی ریت کی آندھی نے دشمن کو پریشانی میں ڈال دیا، جسے مسلمانوں نے ''غیبی مدد'' سمجھا، اور جس نے مسلمانوں کوفیصلہ کن موقع فراہم کردیا۔

20 اگست کی صبح تک طوفان نے آندھی کی شکل اختیار کرلی تھی۔ مسلمانوں کا ایک دستہ خاموشی سے پیچھے سے گھوما اور وادی الرقّاد پر بنے پل پر قبضہ کرلیا، جس کے نتیجے میں بازنطینی افواج مکمل طور پر گھیرے میں آگئیں۔ اس کے بعد وہ تاریخی حملہ ہوا جس میں دشمن کی نگاہیں ریت کی آندھی سے اندھی ہوچکی تھیں۔ قدرتی اورانسانی قوت کے اس امتزاج نے بازنطینی فوج کوریزہ ریزہ کردیا۔ اس دن کا ایک حیران کن منظر یہ بھی تھا کہ بے باک ہندہ (ابوسفیان کی بیوی) بھی مجاہدین کی حوصلہ افزائی کررہی تھی، اپنے بیٹوں کوغیرمختون عیسائیوں کے اعضا کاٹنے پراکسارہی تھی۔ ہرقل پسپا ہوکر قسطنطنیہ واپس چلا گیا۔

اگلے ہی سال یروشلم فتح ہو گیا۔ یہ واحد مفتوح شہر تھا جسے خلیفہ عمرؓ نے بنفس نفیس جا کر دیکھا۔ تاریخ کے طویل دھارے کو چند جملوں میں سمیٹنا آسان نہیں ہوتا، لیکن تاریخ کا ورثہ ہمیشہ حقائق اور تاثرات کا ایک امتزاج ہوتا ہے۔ کوئی کامیابی ایسی نہیں ہے جو مکمل طور پر بے عیب ہو، اور کوئی ناکامی ایسی نہیں جو خواب دیکھنے کی گنجائش باقی نہ رکھے۔ پھر بھی تاریخی حقائق میں مفہوم تلاش کرنا انسان کے سامنے ایک بڑا چیلنج ہوتا ہے، جیسا کہ بعد کے یورپی مؤرخین نے مطالبہ کیا کہ سچ کو سچ کی طرح بیان کیا جائے، لیکن یہ اس نظریے سے خالی نہیں ہو سکتا جو ابن خلدون نے اسلامی طاقت کے عروج، زوال اور احیاءِ نو کے دائرے میں پیش کیا تھا۔

قدامت پسند مسلمان اسلام کے پہلے زوال کی ابتدا حضرت عمرؓ کی شہادت سے شمار کرتے ہیں، جنہیں ایک عیسائی (مجوسی) غلام فیروز نے دورانِ نماز شہید کر دیا تھا۔ ابتدائی دور کی کشیدگیاں ایسی تھیں کہ چاروں خلفائے راشدین میں صرف ابوبکرؓ ہی طبعی موت سے وفات پا سکے۔ حضرت عثمانؓ اور حضرت علیؓ دونوں اپنے ہی مسلمان بھائیوں کے ہاتھوں شہید ہوئے۔ اس کے باوجود اقتدار کی ان پیچیدگیوں نے اسلامی فتوحات اور جہاد کے جذبے کو نہیں روکا۔ جہاد نے ایشیا اور افریقہ میں وسعت کے لیے غیر معمولی جوش اور رفتار حاصل کی۔ گبن (Gibbon) اس بارے میں لکھتے ہیں:

> ''جب بازنطینی سلطنت ایران کے ساتھ جنگ سے تھک چکی تھی، اور کلیسا نسطوری اور مونو فیسائٹ فرقوں کے جھگڑوں میں الجھا ہوا تھا، حضرت محمد صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ایک ہاتھ میں تلوار اور دوسرے میں قرآن کے ساتھ، مسیحیت اور روم کی شکستہ بنیادوں پر اپنا جلالی تخت قائم کیا۔ عرب نبی کی ذہانت، اس قوم کی روایات، اور اس کے دین کی روح، مشرقی سلطنت کے زوال کی وجوہات میں شامل تھیں۔ اور ہماری نگاہیں تاریخ کے ان چند بڑے انقلابات میں سے ایک پر جمی ہوئی ہیں جنہوں نے اس دنیا کی قوموں پر ایک نیا اور دائمی نقش چھوڑا۔''

مسلمانوں کے لیے یہ سب کچھ ایک معجزہ تھا۔ انہوں نے مسیحیت کے مرکز یروشلم کو فتح کیا، اور اس کے فوراً بعد ان کی نظریں عیسائی طاقت کے قلب 'قسطنطنیہ' پر جم گئیں۔

تیسرے خلیفہ حضرت عثمانؓ کے دور خلافت میں بازنطینی سلطنت کے دارالحکومت قسطنطنیہ پر پہلا حملہ کیا گیا۔ 653ء میں حضرت عثمانؓ کے قریبی رشتہ دار اور اس وقت کے شام کے گورنر معاویہؓ نے اپنی فوج کو بوسفیورس کی جانب روانہ کیا، جبکہ بسری بن ارطاہ کی قیادت میں بحری بیڑا طرابلس سے روانہ ہوا۔ رومی شہنشاہ کانسٹانس دوم نے اس بیڑے کے خلاف اپنی افواج بھیجیں، اور دونوں جانب سے اس بحری معرکے میں کامیابی کا دعویٰ کیا گیا۔ تاہم مسلمانوں کو اتنے شدید نقصانات اٹھانے پڑے کہ وہ قسطنطنیہ کی فصیلوں تک نہ پہنچ سکے۔

جب معاویہؓ خلافت پر فائز ہوئے تو انہوں نے مشرقی رومی سلطنت پر حملے دوبارہ شروع کیے۔ 664ء میں حضرت خالد بن ولیدؓ کی قیادت میں ایک مہم روانہ کی گئی، جو اناطولیہ عبور کرتے ہوئے پرگاموس تک پہنچی۔ بسری بن ارطاہ ایک بار پھر بحری بیڑے کی قیادت پر مامور تھے۔ تاہم موسم سرما کی شدت کے باعث انہیں پسپائی اختیار کرنی پڑی۔

سب سے بڑی اور پرعزم مہم 668ء میں بھیجی گئی، جس کی قیادت حضرت فضالہ بن عبید انصاریؓ نے کی۔ اس لشکر میں نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کے کئی اصحاب اور نامور مجاہدین شامل تھے، جن میں حضرت ایوب الانصاریؓ بھی نمایاں تھے۔ بسری بن ارطاہ اس بار بھی بحری بیڑے کے امیر تھے۔ اگرچہ اس مہم کے سال پر اختلاف ہے، لیکن عمومی طور پر تسلیم کیا جاتا ہے کہ مسلمان فوجیں اور بحری بیڑا 670ء میں قسطنطنیہ کی فصیلوں تک پہنچ گیا تھا۔

اس کے بعد آٹھ برس تک یہی حکمت عملی رہی کہ گرمیوں میں محاصرہ کیا جاتا، اور سردیوں میں قسطنطنیہ سے اسی میل جنوب کے ایک جزیرے پر قیام کیا جاتا۔ یہ حکمت عملی حملہ آوروں کو تھکانے اور محافظین کا حوصلہ بلند رکھنے کے لیے سودمند ثابت ہوئی۔ بالآخر 678ء میں مسلمان پسپا ہو گئے، اور یہ ان کے ابتدائی عسکری حملوں کی پہلی بڑی ناکامی ثابت ہوئی۔

انہی فصیلوں کے نیچے ایوب انصاریؓ شہید ہوئے۔ آٹھ صدیوں بعد، جب ترکوں نے 1453ء میں قسطنطنیہ فتح کیا تو ان کی قبر دریافت ہوئی، اور اسے ایک عظیم مذہبی یادگار کے طور پر یاد کیا گیا۔ خلافت عثمانیہ کے سلاطین کو خلافت کی تلوار اسی مسجد میں پہنائی جاتی تھی جو ایوب انصاریؓ کی یاد

میں بنائی گئی۔678ء کی ناکامی کے بعد معاویہؓ نے قسطنطنیہ کے ساتھ چالیس سالہ صلح کی۔

جب سلیمان نے 715ء میں دمشق میں خلافت سنبھالی تو بعض علمائے دین نے ان سے کہا کہ چونکہ وہ پہلے خلیفہ ہیں جن کا نام کسی نبی (سلیمان) کے نام پر رکھا گیا ہے، اس لیے وہ وہاں کامیاب ہوں گے جہاں ان کے پیشرو ناکام رہے۔تاہم، ان کے قسطنطنیہ پر لشکرکشی کے اسباب صرف اس روحانی نسبت تک محدود نہ تھے، بلکہ اس کے پیچھے ایک منظم اور دوراندیش عسکری حکمت عملی بھی کارفرما تھی۔

716ء میں خلافت بنوامیہ نے بازنطینی دارالحکومت قسطنطنیہ کے خلاف ایک ہمہ گیر اور غیر معمولی حملے کا منصوبہ بنایا، جس کی قیادت سلیمان کے بھائی، مسلمہ بن عبدالملک کے سپرد کی گئی۔ان کے لیے احکام نہایت واضح اور قطعی تھے: یا تو شہر فتح کر کے لوٹو یا وہیں قیام کرو، واپسی صرف دمشق کے حکم پر ہی ممکن ہوگی۔سلیمان نے وہ غلطی نہیں دہرائی جو حضرت معاویہؓ سے ہوئی تھی۔اس کی فوج سردیوں کے لیے بھی تیار تھی۔تاہم قسطنطنیہ کی قسمت ساتھ دے رہی تھی۔عرب افواج کے پہنچنے سے چھ ماہ پہلے ایک ذہین سپاہی لیو نے شہنشاہ تھیوڈوسیس سوم سے اقتدار چھین لیا اسکے بعد شہنشاہ تھیوڈوسیس سوم ایک خانقاہ میں چلے گئے۔اقتدار کی یہ قسطنطنیہ کے عوام کے لیے بہترین ثابت ہوئی۔

مسلمانوں نے 15 اگست 717ء کو قسطنطنیہ کا دوسرا محاصرہ خشکی اور سمندر دونوں محاذوں سے شروع کیا۔اس عظیم مہم میں تقریباً ایک لاکھ اسی ہزار عرب فوجی شریک تھے، جب کہ سلیمان بن معاذ کی قیادت میں لگ بھگ 1800 بڑی اور چھوٹی کشتیاں روانہ کی گئیں۔مسلمانوں کے پختہ عزم کے مقابلے میں عیسائیوں کے پاس دو ہتھیار تھے: ایک خود بادشاہ لیو کی قیادت، اور دوسرا ایک معجزاتی ہتھیار جسے وہ ''یونانی آگ'' کہتے تھے۔

گندھک کی تیزی زمانۂ قدیم سے معروف تھی۔ 429 قبل مسیح میں اسپارٹا کے لوگوں نے پلاٹیا کو جلانے کے لیے گندھک اور تار میں بھیگی لکڑی کی گیندیں استعمال کیں۔لیکن بازنطینیوں کا عقیدہ تھا کہ ''یونانی آگ'' کا راز ایک فرشتے نے ان کے شہر قسطنطنیہ کے بانی، قسطنطین کو عطا کیا تھا۔

کہا جاتا ہے کہ یونانی آگ گندھک، نفتا اور تار کا مرکب تھی۔ یہاں تک کہ پانی بھی اس آگ کو بجھا

نہیں سکتا تھا، صرف ریت یا سرکہ ہی اسے بجھا سکتا تھا۔ محافظ، ہوا کی سمت کا انتظار کرتے، اور جب موقع سازگار ہوتا تو عربوں کی کشتیوں پر یونانی آگ کے گولے پھینکتے، جو دہشت اور تباہی پھیلا دیتے۔ اگرچہ عرب اس ہتھیار کی طاقت کا تجربہ پہلے بار بھی کر چکے تھے، لیکن اس بار شدت کہیں زیادہ تھی۔ اس وقت تک وہ اس کی کیمیا سے نا آشنا تھے، لیکن جب بعد میں اس کی ترکیب جان لی، تو انہوں نے بھی دشمنوں پر یہی مہلک ہتھیار استعمال کیا۔

مسلمانوں کا خیال تھا کہ وہ سردی کے موسم کے لیے تیار ہیں، مگر یہ محض ایک مفروضہ ثابت ہوا۔ کمک اور رسد موسم بہار میں پہنچی، لیکن تب تک فتح کا یقین متزلزل ہو چکا تھا۔ بادشاہ لیو نے کم وسائل کو چالاکی سے استعمال کرتے ہوئے مکروفریب، یونانی آگ سے جوابی حملے اور مستقل مزاحمت کے ذریعے محاصرے کو ناکام بنا دیا۔ اسی مہم کے دوران سلیمان کا انتقال ہو گیا۔ مسلمانوں کا کہنا ہے کہ وہ وفورِ غم کی وجہ سے فوت ہوئے، اگرچہ اس بات کو بہت بڑھا چڑھا کر پیش کیا گیا ہے۔ ان کا لشکر شکست خوردہ حالت میں 717ء میں دمشق واپس پہنچا۔ طوفانوں نے عربوں کی کشتیاں بکھیر دیں، یا وہ قزاقوں کے ہتھے چڑھ گئیں جو پسپا فوجوں کو لوٹنے کے منتظر ہوتے ہیں۔

جیسا کہ نبی کریم ﷺ نے فرمایا تھا، ابتدائی مسلم لشکر کو شکست ہوئی۔ مشرقی عیسائی سلطنت پر عربوں کا پہلا بڑا حملہ اختتام پذیر ہوا۔ جنگ کا محاذ اب جنوب کی طرف بحیرۂ روم میں منتقل ہو چکا تھا۔ یہاں صحرائی عربوں نے سمندری جنگ میں بھی مہارت کا ثبوت دیا۔ حضرت معاویہ کے لشکر نے قبرص اور رہوڈز کو فتح کیا اور سسلی پر حملہ کیا۔ عبدالملک کے دور میں عربوں نے میجورکا اور مینورکا فتح کر کے اسپین کے ساحلی علاقوں میں ایک مضبوط اڈہ قائم کیا۔ مسلمان، چاہے کسی خلیفہ کے ماتحت ہوں یا کسی مقامی امیر کے ماتحت یا صرف قزاقی کے لیے ہوں، اٹلی اور بازنطینی پانیوں کی مالدار بندرگاہوں میں خوف کی علامت بن گئے۔ ان میں سے ایک آزاد گروہ نے کریٹ پر قبضہ کر لیا، جب کہ تیونس کے امیر زیادۃ اللہ کے آدمیوں نے نویں صدی کی پہلی سہ ماہی میں سسلی میں ایک مسلم ریاست قائم کر دی۔ ایک وقت ایسا بھی آیا کہ پوپ کو مسلمانوں کو دور رکھنے کے لیے جزیہ دینا پڑا۔ قسطنطنیہ کا خواب بھلا دیا گیا، لیکن ایک ہزار سال بعد ترکوں نے اسے پھر سے زندہ کیا۔

قسطنطنیہ میں 717ء کی شکست کے صرف پندرہ برس بعد ہی یورپ کے مغربی دروازے بھی اسلامی افواج پر بند ہو گئے۔ یہ وہ معرکہ تھا جسے مسلمان مؤرخین 'میدان شہداء' (Pavement of Martyrs) کہتے ہیں اور مسیحی مؤرخین 'جنگ تور' (Battle of Tours) کے نام سے یاد کرتے ہیں۔

یہ حیرت انگیز حقیقت تھی کہ مسلمان افواج یورپ کے اس قدر اندر تک پہنچ گئی تھیں۔ یہ تصادم اکتوبر 732ء میں نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے وصال کے ٹھیک سو برس بعد دریائے لوار کے کنارے پیش آیا تھا۔ دنیا اس پر حیران تھی کہ مسلمان یہاں تک کیسے پہنچے، اور مسلمان اس بات پر کہ وہ اس سے آگے کیوں نہ جا سکے؟ اگر ایمان نے یہاں تک پہنچایا تھا تو تور میں کیا چیز مانع ہو گئی؟ کیا ایمان کی شدت میں کمی ہو گئی تھی؟

خلیفہ عبدالملک کے دو نامور جرنیل طارق بن زیاد اور موسیٰ بن نصیر جب بحر اوقیانوس کے کنارے پہنچے تو انہوں نے اللہ سے مزید زمینیں فتح کرنے کی دعا مانگی۔ انہیں یہ زمینیں عطا ہوئیں۔ 711ء میں گوتھ (Goths) کی سلطنت مسلمانوں کے ہاتھ آئی۔ اگلی چند دہائیوں میں مسلمان افواج فرانس کے جنوبی علاقوں پر چھا گئیں، یہاں تک کہ 722ء میں انہیں ٹولوز میں روک دیا گیا۔

731ء میں اندلس (مسلم اسپین) کو ایک نیا امیر عبدالرحمن بن عبداللہ الغافقی ملا جو ایک زیرک اور لائق حکمران تھا۔ اس نے عربوں اور بربروں کے درمیان اختلافات کو ختم کیا جو نئی مسلم سلطنت کو کمزور کر رہے تھے۔ شمالی افریقہ سے اسلام میں داخل ہونے والے بربر یہ محسوس کرنے لگے تھے کہ وہ زیادہ جنگ کرتے ہیں، لیکن اعلیٰ مناصب پر عربوں کو ہی فائز کیا جاتا ہے۔

عبدالرحمن، بربر سردار منوزہ (Munuza)، فرانس کے ڈیوک ایڈو (Duke of Edo) اور کارل مارٹل (Karl Martel) کے درمیان کشمکش اور سازشوں کی تفصیلات یہاں غیر ضروری ہیں۔ بس اتنا جان لینا کافی ہے کہ 732ء کے اوائل میں عبدالرحمن ارغون اور ناوار کے راستے گزرا اور دریائے رون کے کنارے شہر آرل میں ڈیوک ایڈو (Duke of Edo) کو شکست دی۔ پھر اس نے آکیتین (Acquitaine)، بوردو (Bordeaux) اور لیون (Leon) کے شہر فتح

کیے۔اس کے اگلے دستے پیرس سے صرف سو میل دور رہ گئے تھے۔

فرینکس جو کلووس کے دور میں عیسائی بن چکے تھے، یورپ کی سب سے بڑی طاقت تھے۔اگر انہیں شکست ہوجاتی تو اس کے نتائج کو گبن (Gibbon) نے ایک مشہور اقتباس میں یوں بیان کیا ہے:

> ''مسلمانوں کی فتح کی لکیر جبل الطارق سے لے کر دریائے لوار تک تقریباً ہزار میل تک پھیلی ہوئی تھی۔اگر یہی فاصلہ دوبارہ طے کرلیا جاتا تو وہ پولینڈ کی سرحدوں اور اسکاٹ لینڈ کے پہاڑوں تک پہنچ جاتے۔رائن (Rhine) بھی نیل یا فرات سے زیادہ قابل عبور دریا تھا۔عربوں کا بیڑا بغیر کسی بحری جنگ کے دریائے ٹیمز (Thames) کے دہانے تک جا سکتا تھا۔شاید آج آکسفرڈ کے اسکولوں میں قرآن کی تفسیر پڑھائی جارہی ہوتی، اور اس کے منبر سے ایک ختنہ شدہ قوم کو پیغام محمدیؐ کی حقانیت اور آفاقی پیغام پر خطبہ دیا جارہا ہوتا۔''

یہ ایک غور طلب نکتہ ہے۔

کہا جاتا ہے کہ تھیوڈیرک کے اقتدار کے پیچھے اصل طاقت کارل مارٹل تھا۔عرب مؤرخین کا بیان ہے کہ کارل نے جان بوجھ کر عبدالرحمٰن کے خلاف جنگ میں تاخیر کی تاکہ مسلمانوں کی فوج مال غنیمت (جو کہ مسلم لشکروں کا ہمیشہ سے ایک کمزور پہلو رہا ہے) کے بوجھ سے اس قدر دب جائے کہ وہ داخلی اختلافات اور واپسی کی خواہش سے کمزور ہوجائے۔بالآخر دونوں فوجیں تور (Tours) کے میدان میں آمنے سامنے ہوئیں۔عبدالرحمٰن کو دشمن کی فوج کی تعداد دیکھ کر حیرت ہوئی، کیونکہ اس کے ہراول دستوں نے فرانک فوج کی قوت کو کم تر سمجھا تھا۔

جھڑپوں کا آغاز 12 یا 13 اکتوبر کو ہوا۔پہلا فیصلہ کن معرکہ نو دن بعد پیش آیا، اور دسویں دن مسلمانوں کو برتری حاصل ہوتی محسوس ہورہی تھی۔تاہم فرانک فوج نے ایک کاری ضرب لگائی۔انہوں نے اس راستے پر قبضہ کرلیا جو مسلمان لشکر کے مالِ غنیمت کے کیمپ کی طرف جاتا تھا۔عبدالرحمٰن اپنی فوج کی صف بندی کو برقرار نہ رکھ سکا، کیونکہ لشکر کے بعض حصے دشمن کو زیر کرنے کے بجائے مالِ غنیمت کی حفاظت کی طرف متوجہ ہوگئے۔21 اکتوبر کو جب عبدالرحمٰن نظم و ضبط بحال

کرنے کی کوشش کر رہے تھے، تو وہ ایک تیر یا نیزے کا نشانہ بنے اور شہید ہو گئے۔ اُس شب مسلمان جو کچھ بچا سکے، سمیٹ کر پسپا ہو گئے۔

کاش کسی کو غزوۂ احد کی وہ قرآنی آیات یاد آ جاتیں جن میں واضح کیا گیا تھا کہ مالِ غنیمت کی لالچ مسلمانوں کی شکست کا سبب بنی تھی۔ شکست کی منطق تو قرآن بہت پہلے بیان کر چکا تھا۔

مورخین اس بات پر منقسم ہیں کہ اصل فتح لیو کی تھی یا کارل مارٹل کی۔ تاہم یہ بحث محض علمی ہے۔ حقیقت یہی ہے کہ دونوں اپنی اپنی جگہ کامیاب ہوئے۔

5

# گردابِ جہنم

افسوس ہے مسلم حکمرانوں پر! ایسے حادثات پر آنسو چھلک پڑتے ہیں، دل وفورِ غم سے ٹوٹ جاتے ہیں، اور غم سے انسان نڈھال ہو جاتا ہے...

(امام شیخ شمس الدین یوسف کا جامع مسجد دمشق میں تاریخی خطبہ جب 1229ء میں فریڈرک اور الکامل کے درمیان صلح کے ایک معاہدہ کے نتیجے میں مسلمانوں نے بیت المقدس کو بغیر لڑے ہوئے صلیبیوں کے حوالے کر دیا)

پہلے اچھی خبر سن لیجیے۔ فریڈرک دوم کے شاہی نجومی مائیکل اسکاٹ میں واقعی کچھ بات تھی۔ اس نے اپنی موت کی پیش گوئی خود کی تھی۔ جب اس نے اپنے ستاروں کا زائچہ تیار کیا تو معلوم ہوا کہ ایک خاص وزن کا پتھر اس کے سر پر گرے گا اور وہی اس کی موت کا سبب بنے گا۔ اس انکشاف کے بعد اس نے ہر وقت ہیلمیٹ پہننا شروع کر دیا۔ ایک بار چرچ میں عبادت کے دوران جب اُس نے ہیلمیٹ اتارا تو اچانک چھت سے ایک چھوٹا سا پتھر آ گرا جو اس کے سر پر لگا اور معمولی چوٹ آئی۔ اس نے فوراً پتھر کو تولا، تو وزن وہی نکلا جو اس نے اپنے زائچے میں دیکھا تھا۔ وہ بستر پر چلا گیا اور وہیں اس کی موت ہو گئی۔ یہ واقعہ 1235ء میں پیش آیا۔

مائیکل اسکاٹ 1220ء میں شہنشاہ اٹلی کے دربار میں ایک کیمیا گر اور نجومی کی حیثیت سے شامل ہو گیا۔ اپنی موت کی پیش گوئی کے علاوہ اس کی سب سے نمایاں کامیابی ارسطو کی اس کتاب کا ترجمہ تھا

جو یورپ تک ایک عظیم عرب فلسفی ابن رشد (جسے مغرب میں ایورویس کے نام سے جانا جاتا ہے) کے توسط سے پہنچا۔ فریڈرک ان عظیم حکمرانوں میں شامل تھا جس نے تیرہویں صدی کے پہلے نصف میں اسلام اور مسیحیت کے درمیان ذاتی اور فکری سطح پر رابطہ قائم کرنے کی سنجیدہ کوشش کی تھی۔

اس دور کے معمول کے مطابق فریڈرک کے کئی خطابات تھے جن میں 'شہزادوں کا شہزادہ' (Prince of Princes) اور 'عجوبۂ روزگار' (Wonder of the World) شامل تھے۔ دوسرے لقب کا تو کچھ حد تک جواز بھی تھا کیونکہ وہ صلیبی جنگوں کی تاریخ کا واحد بادشاہ تھا جس نے بغیر خون بہائے ایک صلیبی جنگ جیتی تھی۔ عرب مؤرخ جمال الدین ابن واصل کے مطابق وہ ایک غیر معمولی اور باصلاحیت شخص تھا، جو فلسفہ، منطق اور طب کا طالب علم اور مسلمانوں کا دوست تھا۔ اس کی جائے پیدائش سسلی تھی، جہاں اس نے تعلیم حاصل کی۔ اس کے والد، دادا اور وہ خود سسلی کے حکمران تھے، اور سسلی کی اکثریت مسلم آبادی پر مشتمل تھی۔

فریڈرک عربی زبان پر اس قدر عبور رکھتا تھا کہ علماء کرام کے ساتھ براہ راست خط و کتابت کرتا۔ اسے مسلم تہذیب وتمدن اور علم سے بے حد عقیدت تھی جبکہ وہ مغربی یورپ کے فرانک باشندوں اور پاپائے روم سے شدید نفرت کرتا تھا۔ اس کے محل کے محافظین میں مسلمان شامل تھے جو مؤذن کی اذان پر مکہ کی سمت رخ کر کے نماز ادا کرتے تھے۔ دو محفوظ شدہ خطوط اس کی عربی شاعری اور علامتی طرز بیان سے گہری واقفیت کو ظاہر کرتے ہیں۔

1229 میں جب اُس نے قاہرہ کے اپنے ایک دوست امیر فخر الدین کو خط لکھا اور پاپائے روم کی غداری کا ذکر کرتے ہوئے بتایا کہ ''پاپا نے ایک ہماری قلعہ گاہ، مونتے کاسینو، دھوکے سے ہم سے لے لی، جسے ایک ملعون راہب نے اس کے حوالے کیا''، تو اپنی ذاتی اذیت کو دسویں صدی کے مشہور شاعر المتنبی کے اس شعر سے بیان کیا:

> ''موت ہم سے تھک چکی ہے، اس نے ہمارے بجائے اوروں کو اپنا شکار بنایا ہے۔ اس نے ہمیں چھوڑ دیا ہے اور ہماری محبت کو بھلا دیا ہے... جب تم اُن لوگوں سے جدا ہو جاؤ جو اس جدائی کو روک سکتے تھے، تو دراصل وہ وہی ہیں جو تم سے

دور جاتے ہوتے ہیں۔''

1227 میں جب گریگوری چہارم پوپ بنا، تو فریڈرک نے مسلمانوں سے جنگ کی کوئی خواہش ظاہر نہ کی۔ اگر چہ وہ یروشلم کو زیارت کے لیے ایک اچھی جگہ سمجھتا تھا، لیکن اس کے لیے وہ صلیبی جنگ کو غیر ضروری سمجھتا تھا۔ وہ یروشلم کا بادشاہ بھی تھا، کیونکہ اس نے یولاند سے شادی کی تھی، جو جان آف بریئن کی بیٹی تھی۔ مگر پوپ نے 1221 میں پانچویں صلیبی جنگ کے دوران دمیاط میں شکست کھانے کے باوجود بدلہ لینے پر بضد ہو کر عقل کی بات کو قبول نہیں کیا۔

فریڈرک 1228 میں ایک چھوٹی فوج کے ہمراہ عکہ (Acre) پہنچا، مگر خون بہانے کے بجائے مذاکرات کا راستہ اختیار کیا۔ اس زمانے کا سلطان الملک الکامل بلاشبہ تیرہویں صدی کا انور سادات تھا۔ وہ صلاح الدین ایوبی کے بھائی العادل کا بیٹا تھا۔ 1218 میں پانچویں صلیبی جنگ کے دوران وہ مصر اور یروشلم سے ہاتھ دھو بیٹھنے کے بالکل قریب پہنچ چکا تھا، مگر 1221 کے اگست میں دونوں علاقے پوری طرح اس کے اقتدار میں آ گئے۔

وہ جنگ کے نقصانات اور خطرات کو بخوبی سمجھتا تھا۔ اکتوبر 1219 میں ایک موقع پر اُس نے یروشلم، صلیب مقدس اور دریائے اردن کے مغرب سے لے کر پورے فلسطین تک کا علاقہ دینے کی پیشکش کی۔ لیکن ہسپانوی پادری کارڈنل پلاگیوس کی سخت گیر سوچ نے یہ معاہدہ مکمل ہونے نہیں دیا۔ سلطان بعد میں بھی امن کا خواہاں رہا اگر چہ فریڈرک کی پیشکش کچھ زیادہ ہی نرم تھی۔

شاہ فریڈرک نے یروشلم کی حوالگی کا مطالبہ اس دلیل کے ساتھ کیا کہ چونکہ یروشلم کی دفاعی اہمیت اُس کی فصیلوں کے گرائے جانے سے ختم ہو چکی ہے اس لیے اسے اس کے حوالے کیا جا سکتا ہے۔ یہ بہت ہی مضبوط فصیلیں سلطان کامل کے بھائی شام کے حکمران المعظم نے اس وقت منہدم کرا دی تھیں جب اسے لگا کہ صلیبی یروشلم پر قبضہ کر سکتے ہیں۔ فریڈرک کا کہنا تھا کہ یروشلم میں چند فرانکوں کی موجودگی مسلمانوں کے لیے اُس فرانکی لشکر سے کم خطرناک ہوگی جو یروشلم پر حملہ کرنے کے لیے راستے میں ہوں۔

فریڈرک اور الکامل کے درمیان تعلقات اُس وقت سے قائم تھے جب فریڈرک بیت المقدس پہنچا بھی نہیں تھا۔ دونوں نے سفارتی شطرنج کا کھیل غیر معمولی مہارت سے کھیلا۔ قاہرہ کی طرف سے مذاکرات کار امیر فخر الدین فریڈرک کا ذاتی دوست بن گیا۔ شہنشاہ نے ان مذاکرات کے بہانے قاہرہ کے فلسفہ، ہندسہ اور ریاضی کے ماہرین سے پیچیدہ سوالات کیئے۔ اسے تمام سوالات کے جوابات دیے گئے۔ فریڈرک نے فخر الدین سے رازدارانہ طور پر کہا: ''مجھے نہ تو بیت المقدس پر قبضہ کرنے کی خواہش ہے اور نہ ہی کسی اور چیز پر، میں صرف عیسائیوں کے درمیان اپنی ساکھ کو بچانا چاہتا ہوں۔''

18 فروری 1229 کو فریڈرک اور فخر الدین کے درمیان ایک معاہدہ طے پایا جس کے تحت اسلامی تقویم کے مطابق دس سال پانچ مہینے اور چالیس دن کی صلح پر دستخط ہوئے۔ عیسائیوں کو یروشلم میں اپنے مقدس مقامات، بشمول بیت لحم اور نزاریہ واپس ملے، تاہم وہ ان مقامات کو قلعہ بند نہیں کر سکتے تھے۔ مسلمان اپنی مقدس مسجد اقصیٰ پر بدستور قابض رہے۔

سلطان الکامل نے کہا کہ ''ہم نے ان کو صرف چند گرجا گھر اور چند شکستہ مکان دیے ہیں۔ وہ تمام مقامات جو ہمارے لیے مقدس ہیں جن میں قبۃ الصخرہ اور دیگر مقدسات شامل ہیں، ہمارے ہی پاس ہیں جیسا کہ پہلے تھے۔'' مگر ساتھ ہی اس نے چالاکی سے یہ بھی کہا کہ ''ہم جو کچھ صلح کے تحت دے رہے ہیں، جنگ کے بعد واپس بھی لے سکتے ہیں۔''

تاہم اس وقت سڑکوں پر ایسے غصے اور ندامت کی آگ بھڑک اٹھی کہ آج کے ٹیلی ویژن کے دور میں اسے عالمی خبر کی شکل دے دی جاتی۔ مسلم دنیا میں یہ خبر کہ سلطان کامل نے صلاح الدین ایوبی کی سب سے بڑی کامیابی کو شرمناک طور پر گنوا دیا، کسی آتش فشاں سے کم نہ تھی۔ حلب، بغداد، موصل میں ہنگامے پھوٹ پڑے۔ دمشق میں سلطان کامل کے بھتیجے، شام کے حکمران الملک الناصر نے اس عوامی غم و غصے کو خوب ہوا دی تاکہ اپنا ذاتی حساب چکا سکے۔ اس نے عظیم مسجد دمشق میں امام اور خطیب شیخ شمس الدین یوسف کو بیت المقدس پر خطبہ دینے کے لیے بلایا۔

جب امام نے مسجد میں خطبہ دیا تو لوگوں نے گریہ وزاری شروع کر دی۔ شیخ شمس الدین یوسف نے

سلطان کامل کو غدار کہا۔ انہوں نے بلند آواز سے کہا کہ اب ''بیت المقدس'' کا راستہ متقی مسلمانوں کے لیے بند ہو گیا ہے! وہاں رہنے والے نیک دل لوگوں کے لیے یہ کتنی اذیت ناک خبر ہے۔ وہاں انہوں نے کتنے سجدے کیے ہیں، کتنی بار اللہ کے حضور روئے گڑگڑائے ہیں! اللہ کی قسم، اگر ان کی آنکھوں سے بہنے والا آنسو ایک چشمہ کی طرح ابل پڑے تو بھی وہ اس غم کا مداوا نہیں کر سکتے۔ اے مسلم حکمرانو! کچھ تو شرم کرو! ایسے ہی موقعوں پر آنکھوں سے آنسو بہتے ہیں، دل آہ و فغاں سے ٹوٹ جاتے ہیں، اور غم کے شعلے بلند ہوتے ہیں۔''

دوسری طرف عیسائی بھی چیخ چیخ کر کہہ رہے تھے کہ ان کے ساتھ دھوکہ ہوا ہے۔ فریڈرک جس کی مقدس شہر میں تاج پوشی ہونی تھی۔ وہ جب یروشلم پہنچا تو اسے معلوم ہوا کہ کوئی بھی پادری اس کی تاج پوشی کرنے پر آمادہ نہیں ہے۔ پوپ جو معقول صلح کے بجائے صلیبی جنگ چاہتا تھا، پہلے ہی فریڈرک کو جنگ میں تاخیر کرنے کے جرم میں کلیسا سے نکال چکا تھا۔ چنانچہ فریڈرک نے خود ہی تاج اٹھایا اور چرچ آف دی ہولی سیپلکر کے محراب پر اپنے سر پر رکھ لیا۔ یروشلم میں اس کا رویہ عیسائیوں کو کچھ خاص پسند نہ آیا۔ جب وہ مسجد اقصیٰ پہنچا تو وہاں ایک بے باک عیسائی پادری بائبل لیے مسجد میں گھوم رہا تھا۔ عرب مورخین کے مطابق فریڈرک اس کے قریب گیا اور چیخ کر بولا: ''خنزیر! سلطان نے ہمیں عزت دی کہ ہم یہاں آ سکیں، اور تم یہ حرکت کر رہے ہو! اگر آئندہ تم میں سے کوئی اس طرح یہاں آیا تو میں اسے قتل کر دوں گا۔''

جب وہ قبۃ الصخرہ گیا تو اس نے پوچھا کہ دروازے پر لکڑی کی جالی کیوں ہے۔ بتایا گیا کہ پرندوں کو اندر آنے سے روکنے کے لیے۔ فریڈرک نے طنز کے لہجے میں کہا کہ ''اور ذرا سوچو ہم سے پہلے کے صلیبیوں کا حال، جنہوں نے یہاں سور تک چھوڑ دیے تھے!''

فریڈرک کا استقبال کرنے والے نابلس کے قاضی شمس الدین نے فریڈرک کے تئیں جذبہ خیر سگالی کے طور پر موذنوں سے کہا کہ ان کے قیام کے دوران اذان نہ دیں۔ لیکن مسجد اقصیٰ کے موذن عبد الکریم نے فجر کے وقت منارے پر چڑھ کر قرآن کی وہ آیات بلند آواز میں پڑھیں جن میں اللہ کے بیٹے ہونے کی تردید ہے اور جن میں عیسیٰ اور مریم کا ذکر ہے۔ قاضی نے موذن کو ڈانٹا

اور پھر فریڈرک کے باقی قیام کے دوران اذان نہیں دی گئی۔

فریڈرک نے دریافت کیا کہ اذان کیوں بند ہوگئی ہے؟ جب انہیں وجہ بتائی گئی تو انہوں نے قاضی سے کہا کہ "قاضی صاحب آپ نے یہ غلط کیا۔ کیا آپ میرے لیے اپنے دین، رسم اور قانون کو بدل دیں گے؟ اگر آپ میرے ملک میں ہوتے تو کیا میں آپ کے لیے گرجے کی گھنٹیاں بند کروا دیتا؟ خدا کی قسم! آئندہ ایسا مت کریں۔ یہ پہلی ایسی بات ہے جس کی وجہ سے مجھے آپ سے شکایت ہوئی۔"

فریڈرک نے مسجد میں موجود ہر شخص کو دس دینار انعام میں دیے۔ یروشلم میں صرف دو راتیں قیام کے بعد وہ یافا روانہ ہو گیا، کیونکہ اسے اپنی جان کا خطرہ تھا۔ عیسائی جنگجو گروہ 'ٹیمپلر ز' اسے قتل کرنا چاہتے تھے۔ وہ فلسطین میں موجود تھے اور دنیا مزید ظلمتوں کے سائے میں آ چکی تھی۔

تیرہویں صدی کے کسی صلیبی شہزادے کے لیے فریڈرک جیسا طرزِ عمل یادگار اس لیے ہے کہ وہ غیر معمولی تھا۔ کیرن آرمسٹرانگ اپنی کتاب A History of Jerusalem, One City, Three Faiths میں لکھتی ہیں:

"خونریزی اور جنگوں کے بعد یروشلم مسلم وقار کی علامت بن چکا تھا، اور کوئی بھی اسلامی حکمراں اس مقدس شہر کے حوالے سے کسی قسم کی نرمی یا رعایت دینے کا متحمل نہیں ہوسکتا تھا۔ عیسائی بھی شدید حیرت زدہ تھے۔ کافروں کے ساتھ ایسا کوئی معاہدہ کرنا ان کے نزدیک توہین آمیز (تقریباً کفر کے مترادف) تھا۔ یہ تصور ہی کہ مسلمانوں کو ایک عیسائی شہر کے اندر واقع حرم میں باقی رہنے دیا جائے، ان کے لیے ناقابل برداشت تھا۔ فریڈرک کے طرزِ عمل پر وہ مکمل طور پر ششدر رہ گئے۔ یہ کسی صلیبی سپاہی کے شایانِ شان رویہ نہیں تھا! ٹیمپلر نامی عسکری گروہ نے فریڈرک کو قتل کرنے کی سازش رچی، جس کے بعد وہ عجلت میں ملک چھوڑ کر نکل گیا۔ صبح سویرے جب وہ ساحل کی جانب روانہ ہوا تو عکہ (Acre) کے قصابوں نے اس پر آنتیں اور فضلات پھینکے۔ یروشلم اب عیسائی دنیا کے لیے اس قدر حساس مسئلہ بن چکا تھا کہ جو بھی مسلمانوں سے میل جول رکھتا یا مقدس شہر کے معاملے میں نرمی دکھاتا اس کی جان خطرے میں آ جاتی۔ فریڈرک کی اس غیر معمولی صلیبی مہم کی پوری

داستان اس بات کا ثبوت ہے کہ اسلام اور مغرب کے مابین ہم آہنگی اور بقائے باہمی کی کوئی گنجائش باقی نہ رہی تھی۔ دونوں جانب سے باہمی امن و بقا کی کوئی خواہش دکھائی نہیں دیتی تھی۔

اسلام اور عیسائیت کے درمیان پہلا تصادم جو عربوں اور بازنطینیوں کے درمیان ہوا، شدید ضرور تھا لیکن اس میں زہر آلود نفرت شامل نہ تھی۔ نبی کریم ﷺ کے وصال کے تقریباً چالیس سال بعد پیدا ہونے والے دمشق کے سینٹ جون نے عیسائی الٰہیات کے ردعمل کی نظریاتی بنیاد رکھی۔ پہلے قرآن کی اُن آیات کا رد کیا جو عیسائیت کے متعلق تھیں، پھر بنیادی عقائد پر سوال اٹھایا: کیا اللہ کا کلام مخلوق ہے یا غیر مخلوق؟ کیا خدا کبھی خاموش یا بے کلام بھی ہوسکتا ہے؟ پھر وہ تمسخر شامل ہوا جو بعد میں عیسائی موقف کا مستقل حصہ بن گیا، یعنی نبی کریم ﷺ پر جنسی رغبت میں زیادتی کا الزام۔ اس فکری ردعمل کے ساتھ ساتھ عیسائی عقیدۂ گناہ بھی جڑا تھا۔ عیسائی سلطنتوں کی پے در پے شکست کو صرف اسی بات کا نتیجہ سمجھا گیا کہ خدا انہیں ان کے گناہوں کی سزا دے رہا ہے۔ لاطینی الٰہیات میں بازنطینی بادشاہ ہرقل کے رومی کیتھولک چرچ سے انحراف کو بھی بدعت کی فہرست میں شمار کیا گیا۔

تاہم کچھ جامع روایات بھی موجود رہیں۔ کچھ عرب عیسائیوں نے بحیرا راہب کی تعظیم شروع کر دی جو اسلامی روایت کے مطابق وہ راہب تھا جس نے نبی کریم ﷺ کو پہچانا اور ان کی نبوت کی پیش گوئی کی۔ ان کا ماننا تھا کہ اسی راہب نے نبی کریم ﷺ کو عیسائی اسرار کی تعلیم دی۔ جیسے جیسے جنگیں بازنطینی سلطنت، بحیرہ روم، اور اندلس میں جاری رہیں، زورِ کلام کی شدت میں اضافہ ہوتا گیا۔ مگر یہ سلسلہ مسلسل اور زہریلا اس وقت ہوا جب رومن پوپ کی قیادت میں صلیبی جنگیں شروع ہوئیں اور یروشلم بین الاقوامی خونریزی کا مرکز بن گیا۔

وقت گزرنے کے ساتھ عیسائی ردعمل بھی مسلسل بدلتا رہا، یہاں تک کہ ایک ایسا مرحلہ آیا جب یہ رد عمل میدان جنگ کے قتلِ عام سے بھی زیادہ اشتعال انگیز ہوگیا۔ نویں صدی میں بازنطینی مفکر نیکیطاس نے وہی پرانی گھسی پٹی باتیں دہرائیں (مثال کے طور پر ''محمد کا خدا عیسائی شریعت کو تسلیم نہیں کرتا، اس لیے وہ سچا خدا نہیں ہوسکتا)، مگر اب یہ لب و لہجہ کہیں زیادہ زہریلا ہو چکا تھا۔ انہوں نے محمد ﷺ کو ''شیطان'' کہنا شروع کر دیا۔ شکست، اور اس سے بڑھ کر عیسائی مفتوحہ علاقوں میں

مسلمانوں کی حکومت اور عیسائیوں کی محکومی نے عیسائی سماج میں نبی کریم ﷺ کی ذات پر رقیق حملوں کی راہ ہموار کی۔ یہ کوئی اتفاق نہیں کہ اس زہریلی تلخ کلامی کا سب سے بڑا مرکز اندلس بن گیا۔ یہ نفرت ایک ایسا ناسور بن گیا تھا جس کا زخم آج تک نہیں بھرا۔ مسلمانوں نے ان کردار کشی کا جواب قتل کی سزا کے ذریعہ دیا۔

دوسرے ہزار سال میں جذبات کو بھڑکانے میں سب سے بڑا رول پاپاؤں کی اشتعال انگیزی اور فلسفیوں کی ہرزہ سرائی نے ادا کیا۔ صلیبی جنگوں سے قبل چرچ کی جنگجویانہ روش نے محمد کو ''ماہوند'' میں بدل دیا، اور دانتے جیسے شاعرں ے انہیں اس بنیاد پر دوزخ کے آٹھویں طبقے میں ڈال دیا کہ انہوں نے مذہبی اختلافات کو ہوا دی۔ مسلمانوں نے ہمیشہ ایک سوال اٹھایا ہے جس کا انہیں آج تک کوئی مناسب جواب نہیں ملا: اگر وہ حضرت عیسیٰؑ کا احترام کر سکتے ہیں تو عیسائی نبی کریم ﷺ کے لیے ایسی ہی رواداری کیوں نہیں دکھا سکتے؟

چونکہ حضرت عیسیٰ کو خالص نیکی کا پیکر بنا دیا گیا تھا، اس لیے عیسائی ہمیشہ نبی کریم ﷺ کا موازنہ اس خدا سے کرتے رہے جس کا دعویٰ آپ ﷺ نے کبھی نہیں کیا۔ آپ ﷺ کے نزدیک کنوار پن کوئی اخلاقی برتری نہ تھی۔ آپ ﷺ کی ازدواجی زندگی نہ صرف فعّال تھی بلکہ آپ ﷺ کے بعض رفقا کی غیر محتاط جو شاید نیک نیتی پر مبنی تھیں روایات نے اسے کافی بڑھا چڑھا کر پیش کیا۔ صحیح بخاری میں درج کچھ واقعات مغربی یورپ کے طاقتور مصنفین اور خطیبوں کے ہاتھوں صلیبی جنگوں سے پہلے، اس کے دوران اور اس کے بعد ایک مؤثر ہتھیار بن گئے۔ وولٹیر بھی اسی گروہ میں شامل تھا جس میں دانتے شامل تھا۔ اس طرح محمد ﷺ کو ایک شہوت پرست اور ''ماہوند'' دھوکہ باز کی صورت میں پیش کیا گیا۔

آپ ﷺ کے پیغام کو جھوٹا ثابت کرنے کی کوشش کی گئی۔ ان من گڑھت آیات کا حوالہ دیا گیا جنہیں بعد میں نبی کریم ﷺ نے منسوخ کیا، (جو کبھی نازل ہی نہیں ہوئی تھیں)، جن میں لات وعزیٰ اور منات نامی بتوں کی تعریف کی گئی تھی۔ یہ وہی آیات ہیں جو آج ''شیطانی آیات'' کے نام سے مشہور ہیں۔ پیڈرو ڈی الفونسو، جو ایک ہسپانوی یہودی تھا اور 1106 میں عیسائی بن کر آراگون

کے الفونسو اول کا گود لیا ہوا بیٹا بن گیا، کہتا ہے کہ اگر محمد صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم پر دباؤ نہ ہوتا تو وہ یہ آیات واپس نہ لیتے۔ پیٹر جو کلونی میں راہبوں کی اقامت گاہ کا منتظم اعلیٰ تھا اور جو دعویٰ کرتا تھا کہ وہ طاقت کے بجائے عقل اور تلوار کی جگہ الفاظ کو ترجیح دیتا ہے، اپنی کتاب ''مسلمانوں کی بدترین بدعت'' میں انتہائی زہر آلود زبان استعمال کرتے ہوئے محمد صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو ایک مکار جھوٹا قرار دیتا ہے۔ اس نے فرانس کے بادشاہ لوئیس ہفتم کو خط لکھ کر کہا کہ جیسے یوشع نے امویوں اور کنعانیوں کا خاتمہ کیا، تم بھی اس گمراہ عقیدے کو نیست و نابود کرو۔

ایسے بے شمار واقعات ملتے ہیں۔ قرآن کی وحی کا مذاق اڑایا گیا۔ تھامس آف پادیا نے کہا کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے جبریل نہیں بلکہ کوئی شیطانی مشیر بات کرتا تھا جو ان پڑھ عربوں کو دھوکہ دینے کے طریقے سکھاتا تھا۔ بعض روایات میں یہاں تک کہا گیا کہ محمد صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ایک کبوتر کو اس طرح سدھایا کہ وہ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے کان سے دانہ چگتا تاکہ لوگ سمجھیں کہ یہی روح القدس ہے۔ یہ سب پرانی کہانیوں کی نئی شکلیں تھیں۔ جب نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم زندہ تھے تو آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے مخالفین قرآن کو ایک مجنوں شاعر کی بڑ سمجھتے تھے۔ قرآن نے اس کا جواب دیا: ''ہم نے اس (نبی) کو شاعری نہیں سکھائی'' (سورۃ یٰسین: 39) اور ''یہ کسی شاعر کا کلام نہیں، تم کم ہی ایمان لاتے ہو! نہ ہی یہ کسی کاہن کا کلام ہے'' (سورۃ الحاقہ: 41-42)۔

شہوت پرست پیغمبر کا مقدمہ ہمیشہ سے عیسائی ذہنوں میں موجود رہا ہے۔ دکھ میں نجات تلاش کرنے والے عیسائی کے لیے ایک ایسے پیغمبر کا تصور، جس کی کئی شادیاں ہوں اور جو میدان جنگ کی لوٹی ہوئی دولت کا مالک بھی ہو، ہمیشہ باعث تضحیک رہا ہے، اس کی تضحیک کے لیے بس اتنا ہی کافی ہے، خواہ کوئی اور وجہ ملے یا نہ ملے۔ اس کی وجہ میں پہلے بیان کر چکا ہوں کہ اسلام تو حضرت عیسیٰؑ کو پیغمبر مان کر بھی زندہ رہ سکتا ہے، لیکن مسیحیت باقی نہیں رہ سکتی اگر محمد صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم (نہ کہ مسیحؑ) آخری پیغمبر مانے جائیں۔ اس لیے محمد صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو "فتنہ پیدا کرنے والا" اور "بدعت کا بانی" قرار دینا لازم ہو گیا، بالکل اسی طرح جیسے مسلمانوں کے نزدیک مسیحیت ایک نامکمل دین تھا۔

زبانی حملوں کی شدت سے پتہ چلتا ہے کہ یہ نفرت کس قدر گہری اور ناقابلِ عبور ہو چکی تھی، یہاں تک

کہ دانتے کے دور میں یہ خلیج ایک نہ ختم ہونے والی دیوار کی طرح کھڑی ہو گئی تھی۔ عیسائی ادب میں دانتے الیگیر ی جیسے عظیم شاعر نے اس نفرت کو اتنی شدت سے بیان کیا کہ فن کی آزادی کی حدود بھی پار کر گئیں (اس کا ترجمہ جان چیاردی نے انگریزی میں کیا ہے، جسے پینگوئن نے ہارمنڈسورتھ سے شائع کیا، 1954)، جس میں وہ محمد ﷺ اور علیؓ کو جہنم میں دیکھتا ہے۔

اس کا اردو ترجمہ یہ ہے:

ایک شراب کا پیپا جب ٹوٹتا ہے تو
اس کی دراڑ اتنی چوڑی نہیں ہوتی
جتنی میں نے ایک چہرے پر دیکھی
ٹھوڑی سے اس منہ تک جس سے آدمی فضلہ خارج کرتا ہے۔

اس کی ٹانگوں کے درمیان
اس کی لال انتڑیاں لٹک رہی تھیں
دل، پھیپھڑے، جگر، پتّا
اور وہ سکڑا ہوا تھیلا
جو فضلہ جمع کر کے باہر پھینکتا ہے۔

میں پتھریلی چوکھٹ پر کھڑا گھورتا رہا
اس نے مجھے دیکھا اور اپنے سینے کو
دونوں ہاتھوں سے چاک کرتے ہوئے کہا:
'دیکھو میں کیسے خود کو چیر رہا ہوں!

دیکھو محمد کیسے چیتھڑوں میں بٹا ہوا ہے!
میرے آگے علی اشکبار چل رہا ہے
اس کا سر چوٹی سے ٹھوڑی تک چاک ہے۔

اور باقی تمام خون آلود روحیں
جو روتی اور کراہتی ہیں

اسی خندق میں بھٹک رہی ہیں
یہ سب وہی لوگ ہیں
جو دوسروں کے بیچ اختلاف ڈالتے تھے
اور اب خود بھی چیرے جا رہے ہیں۔

ہمارے پیچھے، اس کٹے پھٹے لشکر کا نگہبان
جہنم کا حلقہ
وہ شیطان ہے
جو ہمیں قصائی کی طرح کاٹتا ہے
اور پھر نئے زخم لگانے کے لیے
ہمیں دوبارہ لے جاتا ہے

جب ہم دوبارہ گڑھے کے گرد چکر لگا کر
اس کے سامنے پہنچتے ہیں
تو پچھلے زخم پھر سے بھر چکے ہوتے ہیں۔

لیکن تم کون ہو
جو اس چوکھٹ پر کھڑے یہ سب دیکھ رہے ہو
شاید اس لیے کہ اپنی سزا کو کچھ وقت کے لیے ٹال سکو
اس گڑھے کی سزا کو جس کے تم بھی مجرم ہو؟

دار الاسلام میں ایسی زہریلی نفرت کو تلوار کے ذریعے دبا دیا جاتا تھا۔ لیکن دار الحرب کئی محاذوں کا میدان جنگ بنا رہا۔ صلیبی جنگیں سب سے پہلے ذہنوں میں لڑی گئیں۔ ابن اسحاق کی سیرت اور

روایات سے منتخب اکا دکا حوالوں کو توڑ مروڑ کر پھیلایا گیا۔ محمد ﷺ کو کبھی مکار اور کبھی دھوکے باز قرار دیا گیا۔ جنسی حوالہ خاص طور پر اس پروپیگنڈے کو بھڑکانے کے لیے استعمال ہوا، خواہ وہ حضرت عائشہ ؓ کی عمر ہو جب ان کی شادی ہوئی، یا پھر جنت میں ہر شہید کے لیے مخصوص ستر حوروں کا ذکر۔ یہاں تک کہ جب صلیبی جنگیں کمزور پڑ گئیں، تب بھی سچے دین کی جنگ شدت سے جاری رہی۔ زیادہ ذہین لوگ منطق کی باریکیاں زیادہ استعمال کرنے لگے۔ مثال کے طور پر ریکولڈو دا مونتے کروچے نے اسلام کے کلمہ شہادت پر ایک مقالہ لکھا: ''اللہ کے سوا کوئی معبود نہیں اور محمد ﷺ اللہ کے رسول ہیں''۔ ریکولڈو کا جواب تھا: ''اور یہ وہ لفظ ہے جسے محمد نے قرآن میں شاید سو سے زیادہ مرتبہ دہرایا ہے۔ اللہ کے سوا کوئی معبود نہیں۔ یہ تو ہر چیز پر صادق آتا ہے: کوئی کتا نہیں سوائے کتے کے، کوئی گھوڑا نہیں سوائے گھوڑے کے۔''

حد سے زیادہ چالاکی! ریکولڈو نے یہ الزام بھی دہرایا کہ محمد ﷺ مجنون یا آسیب زدہ تھے، اور اسی وجہ سے قرآن میں اتنا کنفیوزن ہے۔ سان پیدرو جو ہسپانوی عیسائیوں کے ارتداد کو روکنا چاہتا تھا اس نے ایک مخصوص تصویر پیش کی: ''محمد نے جامنی لباس پہنا اور خوشبودار تیل لگایا تاکہ وہ خوشبودار لگیں، اور اپنے ہونٹوں اور آنکھوں کو رنگ دیا جیسے آج کل مسلمانوں کے رہنما اور بہت سے دوسرے مرد وزن کرتے ہیں''......

حتیٰ کہ محمد ﷺ کی وفات بھی ان کی تہمتوں سے نہ بچ سکی۔ ایلن آف للے یا گیبرٹ آف نوژن جیسے صلیبی ذہن کے دانشور کہتے تھے کہ محمد کو کتوں نے کھالیا تھا یا وہ دم گھٹنے سے مر گئے اور پھر سوروں نے ان کا گوشت کھایا۔ رانولفی ہگڈن نے تو مزید یہ اضافہ کر دیا تھا کہ یہ سب کچھ اس وقت ہوا جب وہ نشے میں مدہوش تھے۔ نارمن ڈینیئل نے اسلام اور مغرب میں اس گستاخی کی جنگ پر ایک شاندار جائزہ لکھا ہے (ایڈنبرا یونیورسٹی پریس، ایڈنبرا، 1958)، جس میں ان حوالوں کی بھرمار ہے۔

چنانچہ صلیبی جنگوں کو اخلاقی فریضہ قرار دے کر مشتہر کیا گیا، یعنی تلوار کے ذریعے زمین کی تطہیر اور صفائی کا عمل۔ ڈینیئل تبصرہ کرتے ہیں:

''صلیبی جنگ کا اصل مفہوم تھا'' خدا کی محبت میں قتل کرنا۔'' سنجیدہ مصنفین کے کبھی

کبھار کے تبصرے بھی اسی رویے کو ظاہر کرتے ہیں۔ فیڈ یزیو نے اپنی تحریر کا مقصد ہی صلیبی جنگوں کی حوصلہ افزائی کو بنایا، لیکن اس کے ذہن کی جھلک ایک موقع پر نظر آتی ہے جب وہ اسلام کی شہوانی آوارگی کے بارے میں لکھتا ہے جس کی وہ تائید کرتا ہوا معلوم ہوتا تھا: ''اور اگر اس کے سوا کوئی اور وجہ نہ بھی ہوتی تو بھی عیسائیوں پر فرض تھا کہ وہ ان سے لڑیں اور زمین کو پاک کریں...... ''بینیڈکٹ آف الائنن کا کہنا تھا کہ مسلمان تو بحث کے قابل بھی نہیں تھے بلکہ ''انہیں آگ اور تلوار سے جڑ سے اکھاڑ پھینکنا ہی بہتر تھا۔'' اسی طرح سینٹ برنارڈ نے لکھا ہے: ''ایک عیسائی کو ایک مشرک (یعنی مسلمان) کی موت پر فخر کرنا چاہیے کیونکہ اس سے مسیح کی عظمت ظاہر ہوتی ہے۔ ایک عیسائی کی موت سے بادشاہ کی سخاوت کا اظہار ہوتا ہے کیونکہ وہ اپنے اجر کی طرف بڑھ رہا ہوتا ہے۔''

عیسائی مذہب میں بھی شہید کے لیے جنت کی بشارت موجود تھی۔ اس جارحیت کے پیچھے وہ گہرا عیسائی ملال پوشیدہ تھا جو اس پیغمبر کی کامیابی دیکھ کر پیدا ہوا تھا جو مسیح کے بعد آیا تھا۔ یہ ملال اس وقت دوگنا ہو گیا جب صلاح الدین کی فتوحات نے عیسائیوں کے حوصلے پست کر دیے اور اس کے بعد کی صلیبی جنگیں یروشلم کو دوبارہ فتح کرنے میں ناکام رہیں۔

1239 میں اسی سال جب فریڈرک اور الکامل کے درمیان صلح ختم ہوئی، کرک کے گورنر الناصر داؤد نے (اور یہ وہی قلعہ تھا جو پہلے ریئنالڈ کے قبضے میں تھا) فرانکوں کو یروشلم سے نکال باہر کیا۔ کچھ عرصے بعد اس نے دوبارہ یروشلم فرانکوں کے حوالے کر دیا تاکہ قاہرہ کے خلاف اپنی جنگ میں ان کی مدد حاصل کر سکے، مگر یہ محض ایک عارضی وقفہ ثابت ہوا۔

1244 میں ترکوں کی ایک فوج نے دوبارہ شہر پر قبضہ کر لیا۔ پانچ سال بعد صلیبی جنگوں کا آخری حملہ، جو ساتواں تھا، ان کا بحری بیڑہ فرانس کے لوئس نہم کی قیادت میں دمیاط کے ساحل پر اترا۔ مصریوں نے بغیر لڑے میدان چھوڑ دیا۔ معاصر عرب مورخ ابن واصل اسے شرمناک قرار دیتے ہیں کیونکہ بندرگاہ میں کم از کم دو برس تک دفاع کے لیے کافی رسد اور ہتھیار موجود تھے۔ ''مصر میں شدید غم چھا

گیا، خاص طور پر اس لیے کہ سلطان نجم الدین ایوب بیمار اور بہت کمزور تھے۔ وہ اپنی فوج کو کنٹرول نہیں کر پا رہے تھے، جبکہ فوج اپنی مرضی مسلط کرنا چاہتی تھی۔''

30 اگست 1249 کو سلطان کا انتقال ہو گیا۔ اگرچہ صلیبیوں کو دیگر محاذوں پر شکستوں کا سامنا کرنا پڑا تھا، وہ منصورہ کی جانب بڑھتے رہے، جہاں مصری فوج خیمہ زن تھی۔ اس وقت اس کا جانشین المعظم عراق میں تھا۔ قاہرہ کی عظیم مسجد میں امیر فخر الدین کا ولولہ انگیز پیغام جہاد کے لیے پڑھ کر سنایا گیا۔

10 فروری 1250 کو منصورہ کے قریب مسلم لشکر جو وہاں خیمہ زن تھا، اچانک فرانک سواروں کو اپنے درمیان پایا۔ فخر الدین غسل کر رہے تھے، انہوں نے بغیر ہتھیار کے اپنے گھوڑے پر سوار ہو کر فوج کو منظم کرنے کی کوشش کی مگر ٹیمپلرز کے ہاتھوں گرفتار ہو کر مارے گئے۔ صلیبی اپنی فتح پر اتنے مطمئن ہو گئے تھے کہ انہوں نے گلیوں میں بکھر کر گھومنا شروع کر دیا۔

اس فیصلہ کن لمحے پر قسمت کا ایک اور نا قابل فہم الٹ پھیر رونما ہوا۔ دم توڑتی سلطنت میں اتنی نئی جان آ گئی کہ اس نے عیسائی یورپ کی قوت کو شکست دے دی۔ مصر کی فوج کے بحریہ رجمنٹ کے مملوک ترکوں نے، اپنے رہنما رکن الدین بیبرس کی قیادت میں، اچانک ایک زبردست حملہ کیا اور فرانکوں کو تہس نہس کر ڈالا۔ قاہرہ شدید تشویش میں مبتلا تھا۔ اب تک کبوتر صرف بری خبریں ہی لاتے رہے تھے۔ اگلی صبح جو بدھ کا دن تھا بیبرس کی فتح کی خبر دار الحکومت پہنچی۔ ابن واصل اس منظر کو یوں بیان کرتے ہیں ''شہر نے جشن کی تیاری کی اور ڈھول کی تھاپ پر خوش خبری کا اعلان کیا گیا۔ فرانکوں پر فتح کی خبر نے بے حد خوشی اور مسرت کی لہر دوڑا دی۔ یہ وہ پہلا معرکہ تھا جس میں ترک شیر کافروں کے کتوں پر غالب آئے۔''

زندہ دل مسلمانوں نے 7 اپریل 1250 کو ''ایک شاندار فتح'' کے ساتھ اس کامیابی کو مزید آگے بڑھایا۔ ایک بار پھر مملوک ترک سب سے زیادہ بہادر اور دلیر ثابت ہوئے۔ ابن واصل لکھتے ہیں کہ ''یہ اسلام کے ٹیمپلرز تھے۔'' ساتویں صلیبی جنگ کا پورا لشکر قید کر لیا گیا۔ فرانس کے بادشاہ کی حفاظت پر حبشی غلام صبیح کو مامور کیا گیا، جس پر مملوک حلقے میں کچھ حیرت بھی ظاہر کی گئی۔ ادھر قاہرہ کے شاعروں نے ایسے اشعار کہے گویا عیسیٰؑ خود بھی اپنے پیروکاروں کی گستاخیوں پر دم نہ بھر سکیں گے۔

2 مئی کومملوک رہنمارکن الدین سلطان المعظم کے کیمپ میں داخل ہوئے،تلوار سے وار کیااور واپس پلٹ گئے۔زخمی سلطان نے مدد کی فریاد کی،مگر کوئی آگے نہ آیا۔وہ کشتیوں کی طرف بھا گامگر گرفتار ہو کر مارا گیا۔گزرنے والے کشتی بانوں نے تین دن بعد اس کی تدفین کی۔اس طرح اس عظیم ہیرو، صلاح الدین ایوبی، سے شروع ہونے والی سلطنت کا خاتمہ ہوا۔

اس وقت کے نومسلم مملوک ترکوں نے اسلام میں ایک تازہ روح پھونک دی۔ 1260 میں بیبرس نے دنیا کو حیران کر دیا جب اس نے گلیل کے مقام عین جالوت میں منگولوں کی یلغار کو روک دیا اور اسے شکست دی۔فلسطین اور شام ایک بار پھر مصر کی عملداری میں آ گئے۔عیسائی مغرب حیران رہ گیا اور کوئی دلیل اس ''کافر'' اسلام (‘Islam’heretic ) کی ایک اور شاندار احیاءنو کو سمجھانے کے قابل نہ رہی۔اس نے تو منگول طوفان کو بھی الٹ دیا تھا۔ 1291 میں مملوک سلطان خلیل نے عکہ کی عیسائی سلطنت کا خاتمہ کر دیا اور فلسطین سے عیسائی طاقت کا قلع قمع کر دیا، اگرچہ عیسائیوں کی موجودگی وہاں باقی رہی۔

ڈینیئل لکھتے ہیں کہ اسلامی فتوحات کے مسئلے نے اور پھر اسلامی نظام حکومت کے تحت عیسائیوں کی مصیبتیں اور بڑھ گئیں، خاص طور پر جب اس کا مشاہدہ براہ راست کیا جائے۔وہ ریکولڈو کی ایک دل کو چھو لینے والی عبارت کا حوالہ دیتے ہیں جو اس نے اپنی تحریر Epistocae commentatorie de perditione Acconis میں لکھی:

> ''یہ اس وقت کی بات ہے جب میں بغداد میں دریائے خُوبَر یعنی دجلہ کے کنارے قیدیوں کے درمیان تھا۔ایک لحاظ سے اس باغ کی خوبصورتی مجھے بہت بھلی لگی۔ یہ جنت کی مانند تھا، درختوں کا جھنڈ، زرخیزی اور مختلف پھلوں کی بہار سے بھرا ہوا۔ یہ باغ جنت کے پانیوں سے سیراب ہوتا تھا اور اس کے اردگرد سونے کے مکان بنے ہوئے تھے۔لیکن دوسری طرف، عکہ کی دردناک شکست کے بعد عیسائیوں کے قتل عام اور ان کے غلام بننے کی خبر سے مجھے گہرا دکھ پہنچا۔ جب میں نے دیکھا کہ مسلمان نہایت خوش اور شاداب تھے اور عیسائی واقعی نظر انداز کئے جا رہے تھے اور

ان کا ذہنی سکون تباہ ہو چکا تھا...... میں نے پہلے سے کہیں زیادہ احتیاط سے خدا کے فیصلوں پر غور کرنا شروع کیا، خاص طور سے مسلمانوں اور عیسائیوں کے بارے میں...... ہندوستان سے لے کر مغربی علاقوں تک مسلمان بڑے سکون اور بغیر کسی مخالفت کے بہترین اور زرخیز زمینوں کے بادشاہ ہیں۔ یہ زمینیں ہر طرح کی نعمتوں سے بھری ہوئی ہیں: نمک کی پہاڑیاں، تیل کے چشمے، آسمان کے من وسلویٰ، جنت کی نہریں، خوشبودار مصالحے، قیمتی پتھر، بلسان کی بیلیں اور دنیا کی سب سے میٹھی پیداواریں۔''

ریکولڈو کا جوش اور غصہ محسوس کیا جا سکتا ہے۔ اس نے لکھا کہ مسلمان اس لیے بڑھتے جا رہے ہیں کیونکہ ان کے نبی نے انہیں شہوانی عمل کی ترغیب دی تھی۔ اور پھر بھی خدا نے انہیں یہ طاقت دی کہ وہ دوسرے مذاہب کو روند سکیں۔ اسے عیسائی عورتوں اور بچوں کو غلامی میں فروخت ہوتے دیکھنا پڑا جب انہیں سڑکوں پر دکھایا جا رہا تھا۔ راہباؤں کو لونڈیاں بنتے دیکھا اور یہ سنا کہ عیسائیوں کا عیسیٰ محمد کے مقابلے میں ان کی کوئی مدد نہیں کر سکتا۔ ایسا لگتا تھا کہ خدا قرآن کا خدا بن گیا ہے، بائبل کا خدا نہیں! مسلمانوں کے کرب کے لمحات میں بھی وہی شکوہ سننے کو ملتا تھا: جب عیسائی فتوحات کا دور آیا تو مسلمانوں کا بھی یہی گلہ اللہ سے تھا۔ یہ کیفیت دراصل ایک ایسی ذہنی کیفیت ہے جسے آدھا خود ترسی اور آدھا بڑھا چڑھا کر پیش کرنے کی عادت کہا جا سکتا ہے۔ مستقبل کے کسی انعام کا وعدہ عام طور پر ایسی کیفیت کے لیے کافی نہیں ہوتا۔

مسلمان جو خود بھی عیسائیوں کے خلاف طنز وطعن میں پیچھے نہیں تھے نبی کریم ﷺ پر حملے کو ایک سوچی سمجھی اور تکلیف دہ سازش سمجھتے تھے۔ صلیبی جنگوں کے نظریہ ساز ہمبرٹ آف رومنز کے الفاظ میں محمد ﷺ نے ''خاص طور پر عیسائیت کی تباہی کے لیے اسلام کو قائم کیا تھا'' (دوبارہ دیکھیں: نارمن ڈینئیل)۔ دانتے نے بھی عیسائیوں اور مسلمانوں کو ایک ہی باپ کے دعوے دار اولاد کی طرح دیکھا اور سمجھا کہ ان میں سے صرف ایک ہی جائز وارث ہو سکتا ہے۔ اگلا قدم آسان تھا: عیسائیت خطرے میں تھی۔ چرچ کو اپنے شہید درکار تھے۔ ایک جہاد نے دوسرے جہاد کو جنم دیا تھا۔

یہ تین سو سال یا اس سے بھی زیادہ طویل جنگ فکری، مذہبی اور فوجی تھی۔ پاپائے روم کی زیر قیادت پادریوں نے عوام کو متحرک کرنے اور ان نظریات کی تبلیغ میں اہم کردار ادا کیا جن پر ان کا ایمان تھا۔ ڈومینیکن فریار اور فرانسیسکن اسی مقصد کے لیے قائم ہوئے تاکہ وہ مسلمانوں کے درمیان تبلیغی سرگرمیاں انجام دیں۔

1219 میں سینٹ فرانسس آف اسیسی پانچویں صلیبی جنگ کے دوران دریائے نیل کو پار کر کے خود سلطان الکامل کے پاس پہنچا تاکہ اسے عیسائیت قبول کرنے کی طرف مائل کر سکے۔ سلطان نے اس درویش مبلغ کے روحانی جذبات کو سراہا اور عزت واحترام سے پیش آیا، پھر اُسے پوری حفاظت کے ساتھ واپس بھیج دیا۔ سلطان الکامل اپنی امن پسندی کے باوجود، پاپا کے ساتھ صلح کے لیے تیار نہیں تھا۔ ویسے بھی فرانسیسکنوں کے ذہن میں امن وصلح سب سے آخری بات تھی۔ جب کچھ بھی حاصل نہ ہو، یا جب سب کچھ کھویا ہوا محسوس ہو، تب بھی ایک مسلمان کے دل میں تلوار کے زیر سایہ شہادت کی تمنا موجود ہوتی ہے۔ اسی سال جب سینٹ فرانسس نے سلطان کو عیسائیت کی طرف مائل کرنے کی کوشش کی، اسی کے ساتھ ہی فرانسیسکن بھائیوں کا ایک گروہ ایک منصوبہ کے ساتھ مراکش گیا تاکہ وہ اپنے شوق شہادت کا مظاہرہ کر سکیں۔ انہوں نے وہاں جان بوجھ کر مسلمانوں کے مذہبی جذبات کو برانگیختہ کیا تاکہ اپنی شہادت کو یقینی بنا سکیں۔ ان کے اس رویے کے پس پشت ایک پرانی تاریخ دہرانا تھا جس کا تعلق نویں صدی کے ہسپانیہ سے تھا۔ یہ ایک عیسائی ہیرو راہب پرفیکٹس تھا جس نے قرطبہ میں مسلمانوں کے سامنے کھڑے ہو کر اسلام کے خلاف نعرے لگائے، جس کے نتیجے میں اپنی جان سے ہاتھ دھو بیٹھا۔ فرانسیسکن بھائیوں نے اسی راہب کے نقش قدم پر چلتے ہوئے مراکش میں مسلمانوں کے مذہبی جذبات کو برانگیختہ کیا اور پھر اپنی شہادت کو یقینی بنایا۔

قرطبہ میں راہب پرفیکٹس کا واقعہ عیسائیت اور اسلام کے مابین کئی پیچیدہ گرہوں کو کھولتا ہے۔ 850ء میں پرفیکٹس کو ایک بازار میں مسلمانوں کی ایک جماعت نے گھیر لیا اور پھر وہی گھسا پٹا سوال پوچھا: عیسیٰ بڑے نبی تھے یا محمد ﷺ؟ یہ مسلمانوں کی طرف سے ایک بچھایا ہوا جال تھا۔ اگر وہ عیسیٰؑ کا انکار کرتا تو اپنے ایمان سے ہاتھ دھوتا، اور اگر محمد ﷺ کا انکار کرتا تو سزائے موت اس کا

مقدر بن جاتی۔ نبی کریم ﷺ کی توہین ایک سنگین جرم تھا۔ پرفیکٹس نے پہلے تو محتاط انداز میں جواب دینے کی کوشش کی، لیکن اچانک وہ ضبط کھو بیٹھا اور انتہائی غصے میں محمد ﷺ کو فریبی، شہوت پرست اور نہ جانے کیا کیا کہہ ڈالا۔ ایک بازار کا معمولی سا جھگڑا اچانک خطرناک رخ اختیار کر گیا۔ غصے سے بھرے ہجوم نے راہب کو قاضی کے سامنے پیش کیا، جس نے صحیح فیصلہ کرتے ہوئے کہا کہ پرفیکٹس کو ناحق اشتعال دلایا گیا تھا، اس لیے اس پر سزائے موت لاگو نہیں ہوتی۔ مگر پرفیکٹس کو دوبارہ ایک اخلاقی جوش چڑھ گیا اور وہ اتنا گستاخ ہوا کہ قانون کو آخر کار اپنا فیصلہ بدلنا پڑا۔ اس کی گردن عید کے دن اُڑا دی گئی۔

اسی عید کے دن جب مسلمان ایک کشتی کی سیر کے لیے نکلے اور وہ کشتی الٹ گئی تو کئی مسلمان ڈوب کر ہلاک ہو گئے۔ عیسائیوں نے اس واقعے کو ایک نشانِ عبرت سمجھا کہ خدا نے پرفیکٹس کی موت کا بدلہ موروں سے لے لیا۔ راہب پرفیکٹس ہسپانیہ میں ایک روحانی ماڈل بن گیا جس کی قربانی نے کئی ممکنہ شہیدوں کو متاثر کیا۔

851 کے موسم گرما میں تقریباً پچاس عیسائی جن میں راہب، پادری، عالم اور عام لوگ سب شامل تھے قاضی کے پاس اس مقصد سے گئے کہ محمد ﷺ کی اعلانیہ توہین کر سکیں اور اپنی سزائے موت کو یقینی بنا سکیں۔ چرچ اس غیر رسمی مذہبی جوش سے زیادہ خوش نہیں تھا۔ نئے حکمرانوں کے ساتھ پر امن بقائے باہم کے حامی قرطبہ کے بشپ نے اس جوش کو کھلے عام مسترد کر دیا۔

لیکن ان ''شہیدوں'' کو ایولوجیو اور پال الوارو جیسے پر جوش خطیب مل گئے جنہوں نے اس واقعہ کو قیامت کی پیش گوئی کے ساتھ جوڑ دیا۔ ان کے مطابق اسلام کا عروج دنیا کے خاتمے کی ابتدا تھی۔ کیا یہ نہیں کہا گیا تھا کہ عیسیٰؑ اس وقت تک واپس نہیں آئیں گے جب تک ایک بڑا ارتداد نہیں پھیلتا اور ایک باغی یروشلم پر قبضہ کر کے کئی عیسائیوں کو مسلمان نہیں بنا لیتا؟ انہوں نے ''کتاب مکاشفات'' (The Book of Revelations) کا حوالہ دیا جس میں ایک عظیم درندے کا ذکر ہے جس پر 666 کا نشان ہوتا ہے اور جو کسی گڑھے سے نکل کر معبد (Temple Mount) کے تخت پر بیٹھ کر دنیا پر حکمرانی کرے گا۔ مسلمانوں نے معبد کے مقام پر دو مساجد تعمیر کر لی تھیں اور دنیا کے

بڑے حصے پر حکومت کر رہے تھے۔ اس دلیل کو مزید مضبوط کرنے کے لیے انہوں نے کہا کہ محمد ﷺ ہسپانیہ کے عیسائی کیلنڈر کے مطابق سال 666ء میں وفات پا گئے تھے۔ (اگر ان میں سے کسی نے قرآن پڑھا ہوتا تو وہ شاید حیرت اور خوف سے یہ جان لیتے کہ قرآن میں بھی قیامت کی نشانیوں میں ایک درندے کا ذکر موجود ہے سورۃ نمل: 82)۔

چودہویں صدی کے آخر تک یروشلم کے فرانسیسکن وہی کچھ کر رہے تھے جو انہوں نے تقریباً دو صدیاں پہلے مراکش میں کیا تھا۔ 11 نومبر 1391 کو ان کا ایک گروہ مسجد اقصیٰ پہنچا اور قاضی سے درخواست کی کہ وہ ان کی بات سنے۔ جب قاضی نے انہیں سنا تو انہوں نے محمد ﷺ کو شہوت پرست، قاتل، پیٹو اور ایسا شخص قرار دیا جو زندگی کا مقصد صرف کھانا، جنسی تسکین اور قیمتی لباس سمجھتا تھا۔ ایک مشتعل ہجوم جمع ہو گیا جو ان گستاخوں کی سزائے موت کا مطالبہ کر رہا تھا۔ فرانسیسکن بھی یہی چاہتے تھے۔ قاضی نے سزائے موت سنانے سے پہلے انہیں اسلام قبول کرنے کی پیشکش کی، مگر انہوں نے انکار کر دیا کیونکہ ان کی الٹی منطق کے مطابق ان کا مرنا مسلمانوں کے لیے بھی عذاب کی ضمانت بن جاتا۔ 1393 میں بھی ایک ایسا ہی واقعہ پیش آیا۔ قتل ہو یا خودکشی، یہ صلیبی جذبہ ہی تھا۔

ایک معروف مقولہ پہلی صلیبی جنگ کو ''بادشاہت کی انارکی پر فتح'' قرار دیتا ہے۔ اس وقت جب عیسائی بادشاہ آپس میں متحد ہو رہے تھے، اس وقت جب وہ پاپاؤں اور عوامی دباؤ کے تحت اپنے شدید اختلافات کو پسِ پشت ڈال رہے تھے، مسلم طاقت اپنی کمزوریوں کی جانب گامزن تھی۔ اموی خلافت جنگِ تور کے بعد زیادہ دیر برقرار نہ رہ سکی۔ ان کی ساکھ ختم ہو گئی اور پھر سلطنت بھی ہاتھ سے نکل گئی۔ خلیفہ ہشام، جو اس جنگ میں ناکام ہوا تھا، کے بعد صرف ایک عشرے کے اندر اس کے چار جانشین آئے اور رخصت ہو گئے۔

جون 750 میں نبی کریم ﷺ کے خاندان سے تعلق رکھنے والا اور اموی فوج کے ایک جرنیل ابوالعباس نے اسی خاندان کے 80 معززین کو اپنے گھر مدعو کیا اور وہیں ان کا قتل بھی کرا دیا۔ وہاں موجود دیگر مہمانوں نے اس خونی کھیل کو محض تفریح کا ایک حصہ سمجھا۔ (صرف ایک شہزادہ عبدالرحمن اس قتل عام سے بچ نکلا اور اس نے اسپین کے شہر قرطبہ میں ایک شاندار اموی خلافت کی بنیاد رکھی۔)

اس بغاوت کو عوام کی زبردست حمایت بھی ملی ( کیونکہ حکومت پہلے اصول کی بنیاد پر حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے خاندان میں منتقل ہوئی تھی )۔نہایت ہی دلچسپ اسلوب نگارش والے مورخ طبری غالباً اسی وقت کی عوامی سوچ کی عکاسی کرتے ہوئے لکھتے ہیں: ''اب دنیا کی تاریک راتیں ختم ہوگئیں، اس کا پردہ ہٹ گیا، زمین وآسمان پر روشنی پھیل گئی، دن کے چشموں سے سورج نکل آیا اور چاند اپنی جگہ سے بلند ہوا......حق وہیں واپس آ گیا جہاں اس کا اصل مقام ہے: تمہارے نبی ﷺ کے اہل بیت میں، وہ لوگ جو تم پر شفقت اور مہربانی کرنے والے ہیں......''

ابوالعباس کی عباسی خلافت، جسے السفاح یعنی ''خون بہانے والا'' کے نام سے جانا جاتا تھا، مذہبی پاکیزگی سے زیادہ اپنے بعض جانشینوں کی عظمت کے سبب یاد رکھا جاتا ہے، جن میں سب سے نمایاں ہارون الرشید (786–804) تھے۔حقیقت یہ ہے کہ ''الف لیلہ'' کی کہانیاں بھی اس دربار کی وسعت اور جلال کو مکمل طور پر بیان نہیں کرسکتیں۔اب عربی اجارہ داری کا دور ختم ہو چکا تھا اور دربار میں فارسیوں اور ترکوں کو بھی نمایاں مقام مل چکا تھا۔دارالحکومت بغداد منتقل ہوا، جس کی تعمیر 762ء میں شروع ہوئی اور چار برس بعد تقریباً پانچ ملین درہم کی لاگت سے مکمل ہوئی۔زوال شاید ناگزیر تھا۔اس کی سب سے بڑی وجہ یہ تھی کہ شاہی دربار میں حقیقت اور فسانہ ایک دوسرے کے مقابل کھڑے ہوگئے تھے۔

کہا جاتا ہے کہ ہارون کے پوتے متوکل کے پاس چار ہزار کنیزیں تھیں اور اس کا دعویٰ تھا کہ اس نے سب کے ساتھ تعلق قائم کیا۔غلام اور خواجہ سرا بکثرت نظر آنے لگے۔دولت کی کہانیاں زبان زدعام ہوگئیں اور اسراف اپنی انتہا کو پہنچ گیا۔ہارون الرشید ایک یاقوت 40000 درہم میں خرید سکتا تھا جبکہ خلیفہ مستعین نے اپنی والدہ کے لیے ایک قالین 13 کروڑ درہم میں تیار کرایا۔تاہم ان کے دور میں علمی خدمات بھی بے مثال رہیں۔ابوسینا، الفارابی اور الغزالی جیسے عظیم مفکر آج بھی زندہ جاوید ہیں۔ایک حیران کن بات یہ ہے کہ نویں صدی کے اختتام تک بغداد میں ایک سو سے زیادہ کتب خانے موجود تھے جبکہ اس وقت لندن یا پیرس میں ایک بھی کتابوں کی دکان نہ تھی۔

عباسیوں کی عیاشیوں کو ایک ایسی قوم تو برداشت کرسکتی تھی جس کے حصے میں بھی کچھ خوشحالی آتی ہو،

مگر دیندار علما کی طرف سے انہیں ہمیشہ سخت مزاحمت کا سامنا رہا۔ عباسی خلفاء کی گردنوں پر اس بدنامی کا طوق لٹک رہا ہے کہ انہوں نے اسلامی فقہ کی بنیاد رکھنے والے چار عظیم ائمہ کو ستایا اور ان پر قید و بند کی صعوبتیں ڈھائیں۔

امام ابوحنیفہ (767–700) جیل ہی میں انتقال کر گئے۔ امام مالک ابن انس (795–710) کو کوڑے مارے گئے۔ امام شافعی (826–772) کو قید کی سزا دی گئی اور امام احمد بن حنبل (855–780) کو کوڑوں کے ساتھ ساتھ قید کا سامنا بھی کرنا پڑا۔ یہی وہ چار عظیم مفکر تھے جن کے بعد کہا گیا کہ آزادانہ تحقیق کے دروازے بند ہو گئے۔ پھر حیرت کیسی کہ جب 1258 میں منگول سردار ہلاکو خان بغداد کے دروازے پر پہنچا تو اس نے خلیفہ المستعصم کو قرآن کی وہ آیات یاد دلائیں جن میں اللہ مسلمانوں کو تکبر کی سزا یعنی ذلت اور تباہی سے خبردار کرتا ہے۔ بغداد کو تباہ کر دیا گیا اور خلیفہ قتل کر دیا گیا۔ اس کے ساتھ ہی اس عظیم سلطنت کا خاتمہ ہو گیا اور علاقے میں مسلم اقتدار کا مرکز جنوب کی طرف قاہرہ منتقل ہو گیا، جہاں ایک نئی اور عظیم نشاۃ ثانیہ کا ظہور ہونے والا تھا۔

ٹور کی جنگ میں فرانسیسیوں کی فتح، جس نے دمشق کو ہلا کر رکھ دیا تھا، یورپ میں بھی ایک بڑی اور مثبت تبدیلی کی بنیاد بن گئی۔ فرانک قبائل کے اتحاد کے ساتھ طاقت کا توازن مشرق سے مغرب کی طرف منتقل ہونے لگا۔ جو چودہ صدیوں بعد بھی پلٹ کر واپس نہیں آیا۔ بازنطینیوں نے پاپا پر اپنی گرفت اس وقت کھو دی جب مارٹیل کے بیٹے پیپن کے دور میں 752ء میں پوپ اسٹیفن منتخب ہوئے۔ پیپن کا بیٹا شارلیمان عظیم، جو ہارون الرشید کا ہم عصر تھا، اس نے وراثت کو اپنی ذہانت سے مزید چار چاند لگائے۔ اب عیسائیوں نے سنجیدگی سے یروشلم، صلیب کے مقام، عیسیٰؑ کے مقبرے اور چرچ آف ہولی سپلکر کے خواب دیکھنے شروع کر دیے۔ یہ خواب مسلسل زیارتوں کے ذریعے مزید مضبوط ہوتا گیا، جو غربت، بیماری اور جنگ کے اس دور میں صرف ایمان کے سہارے طے کی جاتی تھیں اور جن کی قیادت سرگرم مذہبی رہنما کرتے تھے۔

ہزار سال کی آخری صدی میں عیسائی یورپ کے بڑھتے ہوئے اعتماد کو ایک پرانی پیش گوئی سے بھی مزید تقویت ملی۔ اس پیش گوئی میں کہا گیا تھا کہ دنیا کے اختتام سے قبل، جو اس دور میں دوبارہ قریب

محسوس ہونے لگا تھا، مغرب سے ایک شہنشاہ ابھرے گا، یروشلم پر قبضہ کرے گا اور وہاں دجال کو شکست دے گا۔ مذہب اور سیاست کا یہ امتزاج انتہائی مؤثر ثابت ہوا، اور اس کا سب سے بھرپور مظاہرہ دوسرے ہزارے کی پہلی صدی میں دیکھنے کو ملا۔

1033 کی عظیم زیارت آنے والے حالات کی پیش خیمہ ثابت ہوئی۔ 1061 میں کاؤنٹ راجر نے مسلم سسلی پر حملہ کر کے 1091 تک اسے دوبارہ مسیحی دنیا کا حصہ بنا دیا۔ 1085 میں فرانک نائٹس نے ہسپانویوں کے ساتھ مل کر طلیطلہ (تولیدو) دوبارہ فتح کیا۔ پوپ گریگوری ہفتم نے سینٹ پیٹر کے نائٹس کے نام سے ایک فوج بنائی اور 1071 اور 1074 میں ترکوں کی بڑی فتوحات کے بعد ان کی تیاری کا حکم دیا۔ ان نائٹس کا اصل مقصد ترکوں سے نمٹنے کے بعد یروشلم کو دوبارہ فتح کرنا تھا۔ اگرچہ وہ ایسا نہ کر سکے، مگر پچیس سال بعد ایک اور پوپ نے وہ 450 سال پرانا خواب پورا ہوتے دیکھا جب گڈفرے آف بویون کی فتح کے پرچم یروشلم کی فصیلوں پر لہراتے نظر آئے۔

اس فتح پر محض دس سال کے اندر ایک تحریر لکھنے والے راہب رابرٹ نے اسے مسیح کی صلیب کے بعد تاریخ کا سب سے عظیم واقعہ قرار دیا۔ اس کے نزدیک دجال (Anti-Christ) جلد آنے والا تھا اور قیامت سے پہلے کی آخری جنگ شروع ہونے والی تھی۔ دجال واقعی آ گیا، مگر اس کا نام تھا صلاح الدین۔

6

# اللہ کے نام پر صلاح الدین کی جنگی تحریک!

''خدائے بزرگ و برتر! اس کی روح کو اپنی بارگاہ میں قبول فرما اور اس کے لیے جنت کے دروازے کھول دے کہ یہی اس کی آخری آرزو کی تکمیل ہے۔'' (صلاح الدین کے مزار پر کندہ کلمات۔ ان کا انتقال 4 مارچ 1193 کو ہوا)

یہ سب کچھ ایک مخنث کے قصے سے شروع ہوا۔ یہ کہانی سننے میں اگرچہ الف لیلہ کی طرح محسوس ہوتی ہے، مگر حقیقت یہی ہے کہ یہ کوئی افسانہ نہیں۔

آرمینیا کے علاقے تورین کے ایک خوشحال کرد خاندان کا سربراہ نجم الدین کا ایک دوست تھا۔ اس کا نام بہروز تھا جو انتہائی خوبصورت اور پرکشش تھا۔ اس کی پرکشش شخصیت ہی اس کی طاقت بھی تھی اور کمزوری بھی۔ بہروز نے مقامی امیر کی بیوی کو اپنے حسن سلوک سے اس قدر متاثر کرلیا کہ وہ اس کے دام میں آ گئی۔ مگر بدقسمتی سے وہ اس حالت میں پکڑا گیا کہ اس کے کپڑے بھی نہیں تھے۔ امیر نے فوراً ہی اسے مخنث کردیا اور شاید سزا کو دوگنا کرنے کے لیے اسے جلاوطن بھی کردیا۔

نجم الدین نے فیصلہ کیا کہ وہ اپنے دوست کے ساتھ جائے گا۔ دونوں بغداد پہنچے، جہاں عباسی خلیفہ مستعفی کا دربار تھا۔ اس وقت کی نزاکت یا کم از کم ان دونوں دوستوں کا مقصد یہی تھا کہ وہ مصیبت کو موقع میں بدل دیں۔ آج کے مہذب دور کے برعکس اس زمانے میں مخنث لوگوں کا مذاق نہیں اڑایا جاتا تھا، نہ انہیں طعن وتشنیع کا نشانہ بنایا جاتا تھا اور نہ ہی محض ان کی اس کمی کے باعث انہیں کمتر سمجھا

جاتا تھا۔ یہ کمی بعض اوقات ایک فضیلت سمجھی جاتی تھی، خاص طور پر ان عہدوں کے لیے جہاں خاندان اور خواتین سے قریبی تعلقات درکار ہوتے۔ ایسے لوگوں کا ذہن و دماغ شاید اپنے کاموں میں زیادہ توجہ مرکوز کرنے کے قابل ہوتا۔

بہروز کی وہی بدنام زمانہ کشش اب اس کے لیے فائدہ مند ثابت ہوئی۔ وہ خود سلطان کے شطرنج کا ساتھی بن گیا۔ اسے جو انعام ملا وہ بغداد کے شمال میں دریائے دجلہ کے کنارے تکریت شہر میں ایک قلعہ تھا۔ بہروز نے نجم الدین کو اس قلعے کا گورنر مقرر کیا اور نجم الدین نے اپنے بھائی شیر کوہ کو اس خوش نصیبی میں شریک ہونے کے لیے بلا لیا۔

1137 میں نجم الدین کے ہاں تکریت میں ایک بیٹا پیدا ہوا، جس کا نام یوسف ابن ایوب رکھا گیا۔ (بیسویں صدی کے آخری عشرے میں عراقی صدر صدام حسین بھی فخر سے اعلان کیا کرتے کہ ان کی پیدائش بھی تکریت کی ہے۔) یوسف کی پیدائش فوری طور پر کوئی نیک شگون ثابت نہ ہوئی۔ اسی رات اس کے چچا شیر کوہ کا قلعے کے دربان سے جھگڑا ہو گیا۔ معاملہ اتنا بڑھا کہ دربان مارا گیا۔ بہروز نے اس ہولناک واقعے کے بعد دونوں بھائیوں کو قلعے سے نکال دیا۔ وہ موصل روانہ ہوئے، اُس شخص کی ریاست میں جس کی جان نجم الدین نے پانچ برس پہلے بچائی تھی۔

اس وقت موصل اور حلب کا اتابک (ولی عہد کا سرپرست) عمادالدین زنگی تھا۔ سیاہ رنگت والا، گھنی داڑھی والا اور کمزور طاقت کے کئی دعویداروں میں سے ایک مگر وہ دوسروں سے مختلف بھی تھا۔ وہ اپنے سپاہیوں کے ساتھ سوتا تھا اور ایسا مثالی نظم وضبط نافذ کرتا تھا کہ کہا جاتا تھا کہ اس کی فوجیں دو رسیوں کے درمیان سے گزرتی تھیں، تاکہ کھیتوں کو نقصان نہ ہو۔ یہ وہی رہنما تھا جسے ابن الاثیر نے ''مسلمانوں کے لیے خدا کی طرف سے عطا کردہ تحفہ'' کہا۔ وہی رہنما جس نے فلسطین کی عیسائی ریاستوں کے خلاف جوابی کارروائی کی بنیاد رکھی، جو اگلے باون برسوں میں اپنے عروج پر پہنچی اور اس کی انتہا یوسف ابن ایوب میں تھی، جسے دنیا صلاح الدین ایوبی یا سلاحدین کے نام سے جانتی ہے۔

زنگی نے اپنی صلاحیتوں کا اعلان اسی سال کر دیا جب صلاح الدین پیدا ہوا۔ اس نے صلیبیوں کے طاقتور قلعے مونت فیران (جسے عربی میں بارین کہتے تھے) کو فتح کر لیا۔ یروشلم کے بادشاہ فولک اور

اس کے سرداروں کوشکست دے کر قید کرلیا اور رہائی کے بدلے پچاس ہزار دینار تاوان وصول کیا۔ اس فتح نے عیسائی دنیا کو ہلا کر رکھ دیا۔ راہب بازنطینی سلطنت میں نکل پڑے اور عیسائی دنیا کو خبردار کرنے لگے کہ مسلمانوں کا اصل مقصد یروشلم پر قبضہ ہے۔ بازنطینی کنگ جان دوم کومنینس نے موقع سے فائدہ اٹھایا اور خوفزدہ صلیبیوں سے انطاکیہ کا مطالبہ کر دیا۔

1144 میں زنگی نے خطے کی جغرافیائی سیاست کو بدل دیا۔ اس نے ادیسہ کو فتح کرلیا، جو پہلی صلیبی جنگ کے بعد قائم ہونے والی چار ریاستوں میں سے پہلی ریاست تھی۔

زنگی نے جہاد کا اعلان کیا۔ ترک قبائل کے جوشیلے سپاہی چلے آئے، خراسان اور حلب سے سرنگیں کھودنے والے ماہرین بھی پہنچ گئے۔ اس کی فوج نے قلعہ بند شہر کے گردونواح کو تباہ کر دیا، یہاں تک کہا جانے لگا کہ ادیسہ کے قریب پرندہ بھی پر نہیں مار سکتا۔ سرنگیں کھودتے کھودتے ماہرین شہر کی فصیلوں کے نیچے پہنچ گئے۔ لکڑی کے ستونوں کو آگ لگا دی گئی جس سے دیواریں کمزور ہو کر ڈھہ گئیں، اور زنگی نے کرسمس سے دو دن پہلے 1144 کی صبح شہر پر طوفانی حملہ کر کے قبضہ کر لیا۔ باہر سے آئے فرنج صلیبی لوٹے گئے، قید ہوئے اور زنجیروں میں جکڑ دیے گئے۔ مگر زنگی نے مقامی مشرقی عیسائیوں جیسے شامیوں اور آرمینیوں کے ساتھ اچھا سلوک کیا اور کہا کہ یہ لوگ یورپ کے فرانکوں کی طرح اجنبی نہیں، بلکہ اسی سرزمین کا حصہ ہیں۔ (مسلم مورخین زنگی کی تعریف میں رطب اللسان ہیں، مگر یہ حقیقت نظرانداز کر دیتے ہیں کہ وہ کبھی کبھی شراب کا جام بھی اٹھا لیتا تھا)۔

ادیسہ کی یہ شکست پورے یورپ کو ہلا کر رکھ دینے والی تھی۔ ایک دلچسپ حکایت اس فتح کے اثرات کو ظاہر کرتی ہے۔ سسلی کے بادشاہ راجر دوم کے دربار میں مسلمان بھی موجود تھے۔ ایک دن دریا کی طرف دیکھتے ہوئے اس کے ایک مسلمان بزرگ نے ایک جہاز کو آتے دیکھا، جو راجر کی طرابلس بھیجی گئی مہم کی فتح کی خبر لے کر آیا تھا۔

راجر نے اس بزرگ کی طرف دیکھا جو قریب ہی اونگھ رہا تھا اور ہنس کر کہا: ''کیا تم نے سنا؟'' ''نہیں،'' بزرگ نے جواب دیا۔ ''وہ کہہ رہے ہیں کہ ہم نے طرابلس میں مسلمانوں کو شکست دی ہے۔ اب محمد اپنے لوگوں کی کیا مدد کر پائے گا؟'' بزرگ نے جواب دیا: ''وہاں نہیں تھا۔ وہ تو ادیسہ میں تھا،

جسے مسلمان ابھی فتح کر چکے ہیں۔‘‘

درباریوں نے اس پر ہنسنا شروع کر دیا، مگر راجر نے یاد دلایا کہ یہ بزرگ ہمیشہ سچ بولتے ہیں۔ کچھ دن بعد ادیسہ کی شکست کی خبر باضابطہ طور پر بھی پہنچ گئی۔ عیسائی علما نے اس صدمے کی لہر کو پورے یورپ میں پھیلا دیا۔

1146 کے ایسٹر کے موقع پر فرانس کے لوئس ہفتم اور اس کی حسین ملکہ ایلینور آف ایکویٹین ویزلے میں سینٹ برنارڈ آف کلیر وو کے سامنے جھک گئے۔ برنارڈ نے ان سے وعدہ کیا کہ اگر وہ اس مہم کا حصہ بنیں، جو بعد میں دوسری صلیبی جنگ کہلائی، تو جنت میں انہیں دائمی جگہ ملے گی۔ 25 سالہ ایلینور کے لیے یہ جنگ الہامی تو ثابت نہ ہوئی۔ اس کے شوہر نے اس پر الزام لگا دیا کہ وہ اپنے چچا ریمونڈ آف انطاکیہ کو ورغلا رہی ہے اور اسے قید کر دیا۔ بعد میں ان کی شادی ختم کر دی گئی، بظاہر اس لیے کہ وہ کوئی بیٹا پیدا نہ کر سکی۔

ایلینور نے 1152 میں انگلینڈ کے بادشاہ ہنری دوم سے شادی کی اور اپنے ساتھ ایکویٹین کی ریاست بھی لے گئی۔ عرب مورخین کے نزدیک لوئس ہفتم کا اس صلیبی جنگ میں کوئی خاص کردار نہ تھا۔ دمشق پر شدید حملہ جرمن شہنشاہ کونراڈ سوم نے کیا۔ اس موقع پر بھی صلیبی اپنی فتح کے قریب پہنچ کر فیصلہ کن مقابلے میں ناکام ہوئے۔ زنگی اپنی عمر کے ساٹھویں سال میں دوسری صلیبی جنگ تک زندہ نہ رہ سکا۔ 1146 کو ستمبر کی ایک رات وہ نشے میں دھت سو گیا۔ کچھ دیر بعد شور سے آنکھ کھلی تو اس نے دیکھا کہ اس کا غلام جو ایک مخنث تھا، اس کا جام پی رہا ہے۔ اگلے دن کی سزا کے خوف سے کانپتے غلام نے مسلمانوں کے اس عظیم رہنما کو قتل کر دیا۔

زنگی کا جانشین اس کا دوسرا بیٹا نورالدین محمود تھا، جو اس وقت 29 برس کا تھا۔ وہ اپنے والد سے زیادہ پرہیزگار اور زیادہ پُرعزم تھا۔ وہ ایمان کے روایتی ضابطے کے مطابق زندگی گزارتا، اپنے لیے سادہ مگر دوسروں کے لیے فراخ دل تھا۔ اس زمانے میں جب دوسرے مسلم حکمران مصالحت اور احتیاط کو ترجیح دیتے تھے، نورالدین کی نظر میں جہاد ہی سب کچھ تھا۔

یروشلم کی صلیبی ریاست کا اصل اتحادی تو دمشق کا حکمران انور تھا، اسی لیے جب جولائی 1148 میں

دوسری صلیبی جنگ ادیسہ کے دروازے کے بجائے اچانک انور کے اپنے شہر دمشق تک آ پہنچی تو وہ سخت حیران رہ گیا۔ پورے علاقے کے مسلمان دمشق کے دفاع کے لیے متحد ہو گئے۔ جب فرانکوں کو خبر ملی کہ نورالدین خود بھی آ رہا ہے تو وہ حیران و پریشان دمشقیوں کے سامنے سے خود ہی غائب ہو گئے۔ نورالدین نے ایک شاندار منبر تعمیر کروایا تھا جو مسجد اقصیٰ کی آزادی کے انتظار میں تھا۔ اس کے دربار کا ایک نوجوان ایک دن اس منبر کو وہاں نصب کرنے والا تھا۔

یہ نوجوان صلاح الدین ایوبی تھا۔ اس نے اپنے استاد سے ایک اور عزم سیکھا: کہ جہاد کی کامیابی کے لیے شام اور مصر کا اتحاد ضروری ہے۔ جب تک عرب طاقتیں تقسیم رہیں گی، یروشلم کی صلیبی ریاست کو کوئی خطرہ نہیں۔ اسی لیے فرانکوں کی پالیسی یہی تھی کہ وہ ان دونوں خطوں کو تقسیم رکھے۔

1163 میں نورالدین نے شیرکوہ کو جو زنگی کی فوج میں بھی خدمات انجام دے چکا تھا، مصر پر حملے کی ذمہ داری سونپی۔ 26 سالہ صلاح الدین جو اس وقت اس مہم کے حق میں نہیں تھا، اپنے چچا کے ساتھ قاہرہ گیا۔ وہاں زوال پذیر شیعی فاطمی سلطنت نے شیرکوہ اور صلاح الدین کو پانچ سال تک یروشلم کی مدد سے روکے رکھا۔ آخر کار 8 جنوری 1169 کو قاہرہ فتح ہوا اور شیرکوہ نے خود کو مصر کا حکمران قرار دیا۔ مگر صرف دو ماہ بعد اس کی موت واقع ہوگئی۔ کہا جاتا ہے کہ اسے زہر دے کر مارا گیا۔ نورالدین نے سمجھا کہ ایک 32 سالہ نوجوان اس کا فرمانبردار رہے گا، چنانچہ اس نے صلاح الدین کو مصر کا بادشاہ مقرر کر دیا۔ مگر صلاح الدین کے اپنے عزائم اور جنگی حکمت عملیاں تھیں۔ 1174 میں نور الدین نے صلاح الدین کے خلاف لشکر جمع کرنا شروع کر دیا، مگر 15 مئی کو دل کا دورہ پڑنے سے وہ چل بسا۔ 1175 میں صلاح الدین نے خود حملہ کیا۔ وہ دمشق تک پہنچا اور نورالدین کے کم عمر جانشین کو معزول کیا اور شام و مصر کا سلطان اور مقدس مقامات کا محافظ قرار پایا۔ صلاح الدین کو معلوم تھا کہ وہ کیا چاہتا ہے۔ بعد میں اس نے کہا کہ جب اللہ نے اسے مصر دیا، تو اس کی وجہ صرف یہ تھی کہ وہ یروشلم کو آزاد کرا سکے۔ وہ اس مشن کے لیے تیار تھا جسے صدیوں سے ایک مجاہد کی تلاش تھی۔

صلیبی جنگوں کا آغاز باقاعدہ طور پر 25 نومبر 1095 کو ہوا، جب پوپ اربن اول نے ایک پرہجوم اجتماع میں جس میں نائٹس، پادری اور عام لوگ شامل تھے، اعلان کیا کہ جو کوئی بھی مسلمانوں کے

خلاف اس مقدس جنگ میں حصہ لے گا اس کے تمام گناہ معاف کر دیے جائیں گے۔

پوپ نے کہا کہ ترک مسلمان ''ملعون نسل ہے، جو خدا سے مکمل طور پر دور ہو چکی ہے'' اور یہ عیسائیوں کا فرض ہے کہ 'اس گندی نسل کو ہمارے علاقوں سے ختم کر دیا جائے۔' جب ترکوں کی نجاست کو بازنطینی سرزمین سے صاف کر دیا جائے گا تو مسیح کا لشکر یروشلم کی طرف بڑھے گا اور نجات دہندہ کی قبر کو کفار سے آزاد کرائے گا۔ حاضرین کے ہجوم نے جوش و خروش سے بآواز بلند نعرہ لگایا کہ '' Deus hoc vult! (دیوس ہوک وولٹ!)'' (خدا یہی چاہتا ہے!)۔

مارچ 1096 تک امراء سے لے کر لٹیروں، پادریوں اور کسانوں تک تقریباً ایک لاکھ لوگ پانچ مختلف لشکروں کی صورت میں روانہ ہو چکے تھے۔ معاشرے کے ہر طبقے کو اس مقدس جنگ سے ترغیب ملی۔ اسی خزاں میں اتنی ہی یا اس سے بھی زیادہ تعداد کے لوگ پانچ مزید لشکروں میں شامل ہو گئے۔ بازنطینی بادشاہ الیکسئس کومنینس اول نے 1095 میں ترکوں کو اناطولیہ سے نکالنے کے لیے مدد مانگی تھی، جس سے وہ فوجیوں کا ایک دستہ متوقع کر رہا تھا۔ مگر جب مدد کے نام پر ہزاروں کا لشکر قسطنطنیہ پہنچا تو وہ خوفزدہ ہو گیا اور جلدی سے انہیں ترکوں کی طرف بھیج دیا۔ تاہم توقعات کے برعکس اس لشکر نے سلجوقیوں کو شکست دی، فلسطین پہنچا اور دو ریاستیں قائم کیں: ادیسہ اور انطاکیہ۔ اس سے پہلے 1099 میں وہ ایک نظریہ کی دیوار پر تھے: یروشلم۔

15 جولائی 1099 کو رمضان کے مقدس مہینے میں، گڈفرے آف بویون کی فوج کا ایک سپاہی شمالی برجوں سے گھس آیا اور اس کے پیچھے ایک پیاسا اور مشتعل لشکر بھی داخل ہو گیا۔ یہ لشکر ایمان کی شدت اور خون کی پیاس سے بھرا ہوا تھا۔ تین دن تک مسلمانوں اور یہودیوں کا بے دریغ قتلِ عام ہوا، چاہے وہ مرد ہوں یا عورتیں۔ دس ہزار کے قریب مسلمان جو مسجد اقصیٰ کی پناہ میں سمجھے جاتے تھے، وہاں ہی ذبح کر دیے گئے، یہودی اپنے کنیسہ میں اسی انجام سے دوچار ہوئے۔

ایک چشم دید گواہ ریمونڈ آف آگیلز، فخر سے لکھتا ہے کہ ''سروں، ہاتھوں اور پیروں کے ڈھیر لگے ہوئے تھے...... اگر میں سچ کہوں تو آپ کے لیے اس پر یقین کرنا مشکل ہو جائے گا۔ بس اتنا کہنا کافی ہے کہ ہیکل اور سلیمان کے ایوان میں گھوڑے اپنے گھٹنوں اور لگام تک خون میں ڈوبے ہوئے

تھے۔ دراصل یہ خدا کا انصاف اور شاندار فیصلہ تھا کہ اس جگہ کو کافروں کے خون سے بھر دیا جائے، کیونکہ اس نے ان کی توہین بہت عرصے تک برداشت کی تھی۔‘‘

ان سڑتے جسموں کو کرسمس تک نہیں ہٹایا گیا۔ ان کی بدبو آج بھی نو سو سال بعد محسوس ہوتی ہے۔ اسلامی دنیا کے عظیم خلیفہ المستظہر نے اس قیامت خیز تباہی کے جواب میں صرف ایک کمیٹی بنائی تھی۔

بچ نکلنے والے چند لوگ اور علاقے کے ڈرے سہمے مسلمان روتے ہوئے اور دکھی دل کے ساتھ دمشق اور بغداد میں پناہ گزیں ہوئے۔ قاضی ابوسعد الحرّوی نے ان کو ہجرت کی یاد دلا کر تسلی دی اور کہا کہ جس طرح پہلے مسلمان مکہ سے نکل کر واپس لوٹے تھے، اسی طرح اب مسلمان پھر یروشلم میں فتح کے ساتھ لوٹیں گے۔ وہ ایک وفد کے ساتھ خلیفہ کے پاس گیا، جس نے محض رسمی ہمدردی ظاہر کی اور پھر اپنی بدانتظامی میں مگن ہو گیا۔ قاضی نے افسوس سے لکھا کہ اب ایمان والوں کے ہاتھ کمزور ہو چکے ہیں۔ اب صرف شاعر ہی باقی رہ گئے تھے، جو قوم کی روح کو جھنجھوڑ سکتے تھے، جیسے بیسویں صدی کے ایک اور دورِ زوال میں علامہ سر محمد اقبال نے کیا۔ یوں ہی مظفر الابیواردی لکھتے ہیں:

’’آنسو بہانا وہ کمزور ہتھیار ہے
جب تلواریں جنگ کے شعلے بھڑکا رہی ہوں
اے اہلِ اسلام، تمہارے پیچھے وہ لڑائیاں ہیں
جہاں سروں کے مینار تمہارے قدموں میں گرتے ہیں
کیا تم آرام کی چھاؤں میں غافل سو سکتے ہو
جبکہ زمانہ اتنا ہولناک ہو کہ ہر نیند اڑ جائے؟
جب تمہارے شامی بھائی صرف گھوڑوں کی پیٹھ یا
گدھوں کے پیٹ پر ہی سو سکتے ہیں
کیا غیر تمہاری ذلت کو کھائیں اور
تم لطف کی زندگی میں مگن رہو؟
جب خون بہہ چکا ہو اور نازنین لڑکیاں

شرم کے مارے چہرہ چھپائے بیٹھی ہوں
جب سفید تلوار کی نوکیں خون سے سرخ ہوں
اور برچھیوں کا لوہا خون میں ڈوبا ہو
جب تلوار کی آواز سن کر بچوں کے بال سفید ہو جائیں
تو جو اس جنگ سے منہ موڑے، وہ ندامت سے دانت پیس رہا ہوتا ہے
یہ جنگ ہے اور دشمن کی تلوار کھلی ہے
تیار ہے کہ پھر سے انسانوں کی گردنوں میں دھنسے
یہ جنگ ہے اور مدینہ میں آرام کرنے والا

یوں پکار اٹھا:

'اے ہاشم کے بیٹو!
میں اپنی قوم کو دیکھتا ہوں
کہ دشمن کے سامنے وہ نیزہ اٹھانے میں سست ہے
میں دیکھتا ہوں کہ ایمان کمزور ستونوں پر قائم ہے
موت کے ڈر سے مسلمان جنگ کی آگ سے بچ رہے ہیں
اور اس حقیقت سے آنکھ چرا رہے ہیں
کہ موت ہر حال میں آ کر رہے گی
کیا عرب بہادری دکھانے سے پیچھے ہٹیں گے
جبکہ ایرانی جانباز بھی بے حسی کا شکار ہو جائیں؟''

آخر کار عرب مجاہدین اور ایرانی بہادروں کو صلاح الدین نامی اپنا قائد ایک کرد کی شکل میں ملا۔ 1183 میں صلاح الدین نے صفر کے مہینے میں حلب کے 'قلعۂ خاکستری' (Gray Castle) کو فتح کر کے عرب طاقت کو ایک پرچم تلے متحد کرنے کا اپنا مشن مکمل کیا۔ ایک نوجوان قاضی محی الدین نے اس موقع پر ایک پرانا مقولہ اشعار کی صورت میں قلمبند کیا، جو بہت مشہور ہوا:

’’جو شخص صفر کے مہینے میں قلعۂ خاکستری فتح کرے گا، وہ رجب میں یروشلم بھی فتح کرے گا۔‘‘

جب صلاح الدین نے مسلمانوں کو ایک سلطنت میں حقیقی جہاد کے پرچم تلے یکجا کرلیا، تو وہ مرض جس نے مسلمانوں سے یروشلم چھین لیا تھا، اب عیسائیوں میں زور پکڑنے لگا: یعنی اختلاف اور انتشار۔ سب سے بڑا اختلاف یہی تھا کہ مسلمانوں سے صلح کی جائے یا جنگ کی جائے۔ یہ بحث عام لوگوں سے لے کر حکمرانوں تک پہنچی۔ سماجی سطح پر وہ سخت جان صلیبی جذبہ اب ختم ہو چکا تھا۔ دوسری اور تیسری نسل کے عیسائی آبادکار آرام و آسائش کے عادی ہو چکے تھے۔ ان میں سے کئی جن کی مائیں مشرق سے تھیں خود کو اب مشرقی سمجھنے لگے تھے۔ وہ ایسی چیزیں اپنا رہے تھے جنہیں پہلے حقارت کی نظر سے دیکھا جاتا تھا، جیسے غسل کرنا، صابن استعمال کرنا، عربی بولنا، مقامی موسیقی سننا، کفیہ پہننا اور عورتوں کا بازار میں خریداری کے دوران نقاب اوڑھنا۔ یہ تبدیلی محض سہولت کی وجہ سے تھی، تبدیلی عقیدہ کے سبب نہیں۔ یورپی مردوں نے مقامی عورتوں سے شادیاں بھی کیں اور یوں ایک مخلوط نسل پیدا ہوئی، جسے پولینز (poulains) کہا گیا۔ مسئلہ اس وقت زیادہ سنگین ہوگیا جب یہ اختلاف اعلیٰ سطح کے فیصلہ سازوں تک پہنچا۔ شکاری باز جیسے لوگ ہمیشہ مستقل مقدس جنگ کے حامی تھے، جبکہ ’فاخروں‘ کا خیال تھا کہ علاقے کے زمینی حقائق مصالحت کا تقاضا کرتے ہیں۔ عرب مجموعی طور پر صلیبیوں کی ہر چیز کو حقارت کی نظر سے دیکھتے تھے، سوائے ان کے جذبۂ شجاعت کے۔ صلیبیوں کے پاس کوئی فن، کوئی علم یا کوئی تہذیب نہیں تھی، البتہ ان کے پاس مضبوط قلعے، قلعہ نما چرچ اور تصادم کی ایک تہذیب ضرور تھی۔ پادریوں نے باقاعدہ زرہ بکتر پہن لی اور امراء نے راہبوں کا لباس اوڑھ لیا۔ ہسپتال کے نظم (Order of the Hospital) کی ابتدا بیماروں کی دیکھ بھال کے لیے ہوئی تھی۔ 1113 میں پوپ نے اس حکم کو ایک فرمان کے ذریعے روم کے براہ راست ماتحت کر دیا اور 1136 میں انہیں ہتھیار اٹھانے کی اجازت دے دی۔ یہی حکم ناکام دوسری صلیبی جنگ میں اہم کردار ادا کر رہا تھا۔

1119 میں زائرین کی حفاظت کے لیے ٹیمپل کا نظم (Order of the Temple) قائم کیا گیا،

جس کا پیغام سینٹ برنارڈ آف کلیر وو سے آیا تھا۔ اس کا کہنا تھا کہ 'مسیح کے لیے کسی مشرک کو قتل کرنا عظمت کی راہ ہے۔' یہ نائٹ۔ راہب knight-priests ایک تاریخی اصطلاح ہے، خاص طور پر صلیبی دور کے تناظر میں۔ اس سے مراد ایسے لوگ ہیں جو بیک وقت راہب (priest) بھی تھے اور سپاہی (knight) بھی۔ وہ مذہبی عقیدے اور عسکری خدمات دونوں کے لیے وقف ہوتے تھے۔) سچے عیسائی 'جہادی' تھے۔ وہ فقر اور عفت کے عہد کے ساتھ ساتھ میدان جنگ میں سب سے پہلے حملہ آور ہوتے اور سب سے آخر میں پسپا ہوتے۔ یہی وہ عیسائی ہتھیاروں کی اصل طاقت تھے۔

ان شکاری بازوں میں ریئنالڈ آف شاتلین سب سے زیادہ خطرناک تھا۔ قیادت انتشار کا شکار تھی۔ کمسن بادشاہ بالڈون چہارم کو جذام ہو گیا اور مارچ 1185 میں اس کی موت ہو گئی۔ اس کا بیٹا بالڈون پنجم اگلے ہی سال مر گیا۔ اس کے بعد گائے آف لوسگنن نے ایک ایسی خانہ جنگی کے بعد اقتدار سنبھالا جس کی متحمل کوئی بھی صحت مند ریاست نہ ہو سکتی تھی۔

مارچ 1187 میں صلاح الدین ایوبی نے جہاد کا اعلان کر دیا۔ اس سے پہلے اس نے ٹرپولی کے ریمونڈ کے ساتھ ایک صلح نامہ طے کیا تھا جو مسلمانوں سے صلح کے حامیوں (فاخروں) میں شمار ہوتا تھا، مگر شاتلیون نے اس معاہدے کو توڑ دیا۔ 1186 میں اس نے حج پر جانے والے قافلوں پر حملہ کر کے زائرین کو یا تو قتل کر دیا یا قید کر لیا۔ جب اسے صلح کی یاد دہانی کرائی گئی تو اس نے طنزیہ انداز میں کہا کہ ''اپنے محمد کو بلاؤ، وہ تمہیں بچا لیں گے!'' جہاد کے اعلان پر مسلمانوں کا جوش و خروش دیکھنے کے قابل تھا۔ طاقت کے ساتھ ساتھ صلاح الدین نے ایک شاندار حکمت عملی بھی اپنائی۔ وہ یروشلم کی صلیبی سلطنت کے نائٹس کو ان سے کہیں بہتر سمجھتا تھا۔ ان کی سب سے مشہور حطین کی فتح حکمت عملی اور ہتھیار دونوں کی کامیابی تھی۔ جب صلاح الدین نے جلیل کے مشرق (East of Galilee) میں 25 ہزار کے قریب سپاہیوں کو اکٹھا کیا تو یروشلم کے بادشاہ گائی نے 'سچی صلیب' (True Cross) کو مقدس مقبرے سے منگوایا۔

اس صلیب کو جنگ میں محض بیس بار استعمال کیا گیا تھا اور وہ بھی صرف اس وقت جب حالات انتہائی خطرناک ہو جاتے۔ 1 جولائی کو صلاح الدین کی فوج لوبیہ کے میدان میں جمع ہوئی، جہاں اس نے

فیصلہ کن معرکہ لڑنے کا ارادہ کیا۔ اس کا مقصد یہ تھا کہ شدید گرمی میں نائٹس (knights) کو کھلے میدان میں لا کر الجھا دے۔ اس لیے اس نے خطرہ مول لے کر اپنی فوج کو دو حصوں میں تقسیم کیا اور خود ایک ممتاز دستے کی قیادت کرتے ہوئے طبریہ جا پہنچا۔ اس نے شہر پر قبضہ کر لیا اور قلعے کے باہر انتظار کرنے لگا۔ گھیرے میں آئی ہوئی کاؤنٹیس ایشیوا نے جو ریمونڈ کی بیوی تھی، یروشلم میں مدد کی درخواست کی۔ خود ریمونڈ نے اپنے ساتھیوں کو خبردار کیا کہ یہ دشمن کا جال بھی ہو سکتا ہے، مگر 'شکاری بازوں' نے اس پر الزام لگایا کہ وہ مسلمانوں کا حمایتی ہے۔

شورائے جنگ میں فیصلہ 'شکاری بازوں' کے حق میں ہوا، لیکن حطین کی پہاڑیوں پر یہ فیصلہ ان کے خلاف ثابت ہوا۔ یہ وہی جگہ تھی جہاں مسیح نے 'پہاڑی کا خطبہ' دیا تھا اور فرمایا تھا کہ ''زمین کے وارث وہ ہوں گے جو عاجز ہیں۔'' 3 جولائی کو عیسائی فوج طبریہ کو بچانے کے لیے نکلی۔ صلاح الدین نے انہیں گھیرے میں لے لیا، طبریہ کی جھیل کا تازہ پانی ان پر بند کر دیا اور اپنی سوار فوج کے ذریعے دونوں اطراف سے انہیں پریشان کرتا رہا۔ اگلے دن دوپہر کو اس نے دشمن کے سامنے سوکھی گھاس رکھوا کر آگ لگا دی۔ تب تک دشمن کے حوصلے پوری طرح پست ہو چکے تھے۔

جب بادشاہ گائی نے اپنے سپاہیوں سے سچی صلیب کی حفاظت کا مطالبہ کیا تو انہوں نے انکار کر دیا۔ صلاح الدین کی سوار فوج نے ٹیمپلریوں کو بری طرح شکست دی، اور باقی فوج بے دفاع ہو گئی۔ مسلمانوں نے فیصلہ کن فتح حاصل کر لی۔ کاؤنٹ ریمونڈ اس لیے بچ نکلا کہ صلاح الدین نے اس کے لیے راستہ کھول دیا تھا۔

4 جولائی کو صلاح الدین کا سترہ سالہ بیٹا، الافضل بھی اس کے ساتھ تھا۔ مایوس صلیبی اب اپنے بادشاہ گائی کے خیمے کے ارد گرد بلند مقام پر بے جگری سے لڑ رہے تھے۔ دونوں بار نوجوان الافضل خوشی سے چیخ پڑا کہ 'ہم جیت گئے!' مگر صلاح الدین نے اسے خاموش کر دیا۔ اس نے کہا کہ جب تک بادشاہ کا خیمہ نہیں گرتا تب تک فتح کا اعلان نہیں ہوگا۔ جب خیمہ گرا، تو صلاح الدین گھوڑے سے اترا، خوشی سے روتے ہوئے اللہ کے حضور سجدہ ریز ہو گیا۔ 'سچی صلیب' (True Cross) مسلمانوں کے قبضے میں آ گئی۔ بادشاہ گائی اور شاتلیون دونوں قیدی بنا لیے گئے۔ صلاح الدین

ایک مسند پر بیٹھا تھا جب انہیں اس کے سامنے لایا گیا۔ اس نے گائی کو اپنے برابر بٹھایا اور شربت پیش کیا۔ پھر سلطان اپنی فوج کا معائنہ کرنے باہر نکلا، واپس آیا اور اپنے انعامی قیدیوں کو دوبارہ بلایا۔ اس نے شاتلیون کو اسلام قبول کرنے کی پیشکش کی۔ جب اس نے انکار کر دیا تو صلاح الدین نے اپنی شمشیر اس کے کندھے پر رکھی اور اپنے خادم کو حکم دیا کہ اس کا سر قلم کر دے۔ بادشاہ گائی خوف سے کانپتے ہوئے گھٹنوں کے بل گر گیا۔ صلاح الدین نے اسے اٹھنے کو کہا اور کہا: 'سچے بادشاہ آپس میں ایک دوسرے کو قتل نہیں کرتے۔ شاتلیون نے تو بس اپنی ہٹ دھرمی کی قیمت چکائی ہے!'

اب یروشلم کا راستہ صاف تھا۔ عکہ، بیروت اور صیدا ایک ایک کر کے گر گئے۔ صرف صور (Tyre) نے مزاحمت کی اور صلاح الدین نے ساحلی شہر کو نظر انداز کر دیا جو ایک فیصلہ تھا جس پر مسلمان بعد میں بہت پچھتانے والے تھے۔ اس کا مقصد یروشلم کو گھیر لینا اور پورے علاقے سے عیسائیوں کی چھوٹی چھوٹی بستیاں ختم کرنا تھا۔ 19 ستمبر کو صلاح الدین نے عسقلان سے روانگی اختیار کی اور یروشلم کی طرف اپنے آخری سفر کا آغاز کیا۔ فوج کا بس ایک خواب تھا: مسجد اقصیٰ سے مؤذن کی آواز سننا۔

26 ستمبر کو یروشلم پر حملہ شروع ہوا۔ صلاح الدین کے درباری اور اس مہم کے مورخ عماد الدین نے اس مہم کی منظر کشی اپنے مخصوص دلکش انداز میں کی:

> ''اسلام نے یروشلم کو ایسے چاہا جیسے کوئی دلہن کے لیے جان کی بازی لگا دے، اسے ایسی برکت دی جو اس کے دکھوں کو دور کر دے اور اس کے غمگین چہرے کو خوشی سے بھر دے۔ جب چٹان (قبۃ الصخرہ) سے دشمن کے خلاف مدد کی پکار بلند ہوئی، تو اس کا فوری جواب دیا گیا، ایک بازگشت جو اس کے آسمان میں روشنی کے چراغ روشن کر دے، ایمان کو اس کے وطن اور مسکن میں واپس لائے اور ان لوگوں کو مسجد اقصیٰ سے نکال دے جنہیں خدا نے اپنی لعنت کے ساتھ نکالا تھا۔''

1099 میں صلیبیوں کا محاصرہ پانچ ہفتے تک جاری رہا تھا۔ اس بار یہ محاصرہ صرف سات دن میں مکمل ہوا۔ صلاح الدین نے شمالی فصیل پر سینٹ اسٹیفن کے دروازے کے گرد حملہ شروع کیا۔ یہ

وہی جگہ تھی جہاں اٹھاسی برس پہلے گڈفرے آف بویون آیا تھا۔ 29 ستمبر کو فصیل میں شگاف پڑ گیا۔ یروشلم کا پادری ہراکلیئس جو نابلس کی ایک کپڑا فروش عورت کے ساتھ کھلم کھلا رہتا تھا، اس نے اس شگاف کی حفاظت کے لیے گارڈز کو دولت کی پیشکش کی، مگر کوئی تیار نہ ہوا۔ خواتین اپنے بچوں کے بال کاٹنے لگیں، گویا شہادت کی تیاری کر رہی ہوں۔ مدافعین کے پاس البتہ ایک آخری ہتھیار تھا: مقدس مقامات۔ قبۃ الصخرہ اور مسجد اقصیٰ کو تباہ کرنے کی دھمکی نے صلاح الدین کو نرم کر دیا۔ (1098 میں مسلمان بھی ایسی ہی تجویز پر غور کر چکے تھے، مگر انہوں نے فیصلہ کیا کہ صلیبیوں کے حملے سے پہلے کسی چرچ کو ہاتھ نہیں لگایا جائے گا، اگرچہ صلیبیوں نے بعد میں مسلمانوں کا قتل عام کیا)۔ بالآخر معاہدہ طے پایا کہ ہر عیسائی مرد کو دس سنہری بیزنٹ (bezant)، عورت کو پانچ اور بچے کو ایک ادا کرنا ہوگا۔ اس کے بعد وہ لوگ شہر چھوڑ کر جا سکتے تھے۔

2 اکتوبر 1187 کو یا اسلامی کیلنڈر کے مطابق 27 رجب 583 ہجری کو صلاح الدین ایوبی یروشلم میں داخل ہوئے۔ یہ وہ دن تھا جب مسلمان مسجد اقصی سے نبی کریم ﷺ کے معراج کا جشن مناتے ہیں۔ صلاح الدین ایوبی نے اپنا وعدہ پورا کیا۔ ایک بھی عیسائی کو قتل نہیں کیا گیا۔ ہراکلیئس جب اپنا رتھ دولت سے بھر کر لے آیا تو مسلمان حیران رہ گئے، جبکہ کئی غریب عیسائی صرف اس لیے غلامی کا شکار ہو گئے کہ ان کے پاس فدیہ ادا کرنے کو کچھ نہ تھا۔ یہ بات مشہور ہے کہ جب صلاح الدین نے کئی خاندانوں کو ایک دوسرے سے جدا ہوتے ہوئے دیکھا تو وہ رو پڑے۔ تب انہوں نے سیکڑوں کو بغیر فدیہ کے آزاد کر دیا۔ رسول اللہ ﷺ کا فرمان ہے کہ "جب کوئی سخی لڑکھڑاتا ہے تو اللہ اس کا ہاتھ تھام لیتا ہے۔" صلاح الدین کی سخاوت بے مثال تھی۔ انہوں نے شہید فوجیوں کی بیواؤں اور قیدیوں کی بیویوں کو رہا کر کے ان کے ساتھ تحائف بھی دیے۔ ان کے بھائی الملک العادل نے اپنی جنگی خدمات کے بدلے ہزار عیسائی مانگے اور فوری طور پر انہیں آزاد کر دیا۔ انہوں نے کہا کہ عیسائی دنیا بھر میں اس کے رویے کو یاد رکھیں گے اور اپنے اعمال سے اس کا موازنہ کریں گے۔ اس دوران علما نے مسلمانوں کو یاد دلایا کہ ابھی صرف 'چھوٹا جہاد' (جہاد اصغر) مکمل ہوا ہے، جبکہ 'بڑا جہاد' (جہاد اکبر) یعنی 'نفس کی اصلاح اور اللہ کے انصاف والے راستے پر ثابت قدم رہنے کی جدوجہد' اب شروع ہوئی ہے۔

صلاح الدین نے مشرقی عیسائیوں کو صلیبی جنگوں کا ذمہ دار نہیں ٹھہرایا اور شامی و آرمینیائی عیسائیوں کو یروشلم میں رہنے کی اجازت دی۔ کچھ جذباتی لوگوں نے 'چرچ آف دی ہولی سپلکر' کو تباہ کرنے کا مطالبہ کیا، مگر صلاح الدین نے عیسائیوں کے کسی بھی مقدس مقام کو ہاتھ لگانے کی اجازت نہ دی۔ چرچ کو صرف تین دن کے لیے بند کیا گیا۔ انہوں نے یہودیوں کو دوبارہ شہر میں بسنے کی دعوت دی، اور ان کا نام یہودی دنیا میں عزت و احترام سے لیا گیا۔ جب انہوں نے عسقلان کو تباہ کر دیا، کیونکہ وہ دو شہروں کا دفاع نہیں کرنا چاہتے تھے، تو عسقلان کے یہودیوں کو یروشلم میں گھر دیے گئے اور انہیں اپنا عبادت خانہ (کنیسہ) بنانے کی اجازت دی گئی۔

صلاح الدین نے شعوری طور پر خلیفہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے طرزِ عمل کی پیروی کی اور بغیر خون خرابے یا تباہی کے یروشلم کو فتح کیا۔ 20 اگست 636ء کو یرموک کی لڑائی میں بازنطینی فوج کی شکست کے بعد شہنشاہ ہراکلیئس کو اندازہ ہو گیا کہ وہ اس علاقے کو برقرار نہیں رکھ سکتا۔ وہ یروشلم آیا، 'سچی صلیب' کو اٹھایا اور شام سے ہمیشہ کے لیے رخصت ہو گیا۔ جولائی 637ء میں مسلمان یروشلم کی فصیلوں پر پہنچے۔ پہلا محاصرہ سات مہینے تک چلا۔ بطریق سوفرونیوس نے اپنی بساط کے مطابق کوشش کی مگر فروری میں ہتھیار ڈالنے پر مجبور ہو گیا۔ اس بات پر اختلاف ہے کہ کیا عمر رضی اللہ عنہ خود یروشلم کی فتح کے وقت وہاں موجود تھے یا نہیں، مگر وہ اسلام کے تیسرے مقدس شہر میں ضرور تشریف لائے تھے۔ جب بازنطینی پادریوں نے انہیں سفید اونٹ پر سوار ایک پرانا اور پیوند زدہ لباس پہنے دیکھا تو انہیں محسوس ہوا کہ وہ 'ریاکاری' کر رہے ہیں۔ یروشلم کی تاریخ خون سے بھرپور ہے۔ اسلامی فتح سے پہلے بھی اور بعد میں بھی۔ مگر اس بار طاقت کی منتقلی یروشلم کی تاریخ کی سب سے پرامن تھی۔ اس فتح کے بعد کوئی قتلِ عام نہیں ہوا، نہ کوئی املاک تباہ ہوئیں اور نہ کسی کو زبردستی مسلمان بنایا گیا۔

اس کے برعکس جب عمر رضی اللہ عنہ بطریق سوفرونیوس کے ساتھ 'چرچ آف دی ہولی سپلکر' کی سیر کر رہے تھے تو اذان کی آواز سنائی دی۔ بطریق نے خلیفہ کو وہیں نماز پڑھنے کی دعوت دی، مگر انہوں نے انکار کر دیا۔ انہوں نے کہا کہ اگر وہ وہاں نماز پڑھیں گے تو مسلمان اس چرچ کو مسجد میں بدل

دیں گے۔ عمر رضی اللہ عنہ نے حکم دیا کہ اس چرچ یا قسطنطین کے مقبرے میں کبھی کوئی مسلمان نماز نہ پڑھے اور وہاں مسجد نہ بنائی جائے۔ عیسائیوں اور یہودیوں کو قرآن کے قانون کے مطابق 'ذمی' کا درجہ دیا گیا اور اس وقت عیسائی یروشلم میں اقلیت نہ تھے۔ انہیں آزادی دی گئی اگرچہ مکمل برابری نہیں دی گئی اور ان پر فی خاندان سالانہ ایک دینار جزیہ عائد ہوا۔ اگرچہ حضرت عمر کے بعد آنے والے حکمران اتنے دوراندیش نہ تھے اور جزیہ بعد میں اکثر توہین آمیز اور ظالمانہ بن گیا۔ عمر رضی اللہ عنہ نے عیسائی پابندی بھی ختم کی اور یہودیوں کو دوبارہ یروشلم میں بسنے کی اجازت دے دی۔ انہوں نے طبریہ سے ستر یہودی خاندانوں کو بلایا اور انہیں حرم کے جنوب مغربی حصے میں اس مقام پر آباد کیا جو کبھی یہودی ہیکل کی جگہ تھی۔

عمر یا صلاح الدین جیسی شرافت اور فراخدلی یروشلم کی فتح کے وقت ہر فاتح کے حصے میں نہیں آئی۔ خود صلاح الدین کا رویہ مثالی تھا، مگر ان کے سپاہیوں نے مالِ غنیمت کا مطالبہ کیا اور چونکہ انہیں لوٹ مار کی اجازت نہیں ملی تھی، اس لیے وہ غلام بنانے کے لیے بے چین تھے۔ عورتیں ہمیشہ کی طرح سب سے زیادہ متاثر ہوئیں اور انہیں کنیز بنا لیا گیا، جبکہ بعض مسلم مبلغین نے اس عمل کو فخر کے ساتھ بیان کیا۔ اسی لیے عیسائی دنیا کا وہ مرثیہ جو یورپ بھر میں گونجا، بڑا معنی خیز تھا کہ 'راخل پھر رو رہی ہے جس کا بانجھ پن اس کی کوکھ کی شرمندگی بن گیا ہے۔' ان زیادتیوں کے باوجود صلاح الدین کے شاندار کردار اور ان کی دانشمندانہ حکمت عملی کی اہمیت کم نہیں ہوتی۔ انسانی خوبیوں میں انہوں نے سب سے زیادہ سخاوت اور دلیری کو اہمیت دی۔ وہ اکثر وہ آیت پڑھا کرتے تھے، جن میں اللہ نے نبی کریم ﷺ کی سخاوت کی تعریف کی ہے اور پھر نبی ﷺ کا یہ فرمان دہراتے کہ ''اللہ بہادری کو پسند فرماتا ہے، چاہے وہ سانپ کے قتل ہی میں کیوں نہ ہو۔''

اس موقع پر صلاح الدین نے سب سے بڑا اعزاز اس شخص کو دینے کا فیصلہ کیا جسے وہ جمعہ کے دن مسجد اقصیٰ میں پہلا خطبہ دینے کے لیے منتخب کرنے والے تھے۔ عربی مؤرخین لکھتے ہیں کہ جب انہوں نے حلب کے 32 سالہ قاضی محی الدین کا نام لیا تو اس اعزاز کے انتظار میں بیٹھے عمر رسیدہ علماء کے چہرے شرم سے پسینے میں ڈوب گئے۔ یہ وہی نوجوان تھا جس نے حلب کے بعد ایک نظم لکھی

تھی۔ اس کی تقریر جو آج تک یاد کی جاتی ہے، جس میں اس نے کافروں سے انتقام لینے کی بات کرنے میں کوئی جھجک نہیں دکھائی تھی، مگر اس کا بنیادی پیغام یہ تھا کہ فتح تلوار کی دھار یا گھوڑوں کی تیزی یا جنگی ہنر سے نہیں، بلکہ اللہ کی مدد سے آئی ہے۔ اس نے صلاح الدین کو 'سلطان الاسلام' قرار دیا تھا۔ اور وہ آج بھی 'سلطان الاسلام' کے لقب سے معروف ہیں، جیسا کہ فلسطین کے کسی بھی میدان جنگ سے آنے والی ٹیلی ویژن کی جھلک سے واضح ہو جاتا ہے۔ یہ کتنی عجیب بات ہے کہ وہ شخص جس نے یہودیوں کو یروشلم میں دوبارہ بسایا تھا، آج اسرائیل کے خلاف جہاد کی علامت بن چکا ہے۔ لیکن شاید یہ اتنا ہی حیران کن ہے جتنا یہ حقیقت کہ 'خلیفۃ اللہ داؤد' (David) کی غلیل آج فلسطینی بچوں کا ہتھیار بن چکی ہے، ان فوجوں کے خلاف جو اپنے جھنڈے پر داؤد کے ستارے کو اٹھائے ہوئے ہیں۔

صلاح الدین کا تیسری صلیبی جنگ کے ساتھ فیصلہ کن مقابلہ آج بھی ایک زندہ حقیقت ہے، ایک ایسے علاقے میں جو اپنی یادوں کا انتخاب بڑے احتیاط سے کرتا ہے۔ 1181 میں اپنی وفات سے پہلے پوپ الیگزینڈر سوم وہ پہلا شخص تھا جس نے یورپی شہزادوں کو مقدس سرزمین میں اس نئی طاقت یعنی صلاح الدین کے ابھرنے کی تنبیہ کی تھی۔ لیکن کسی نے اس پر توجہ نہیں دی۔ اس وقت مغرب کی دو عظیم طاقتیں انگلینڈ اور فرانس تھیں، اور ان کے شاہی خاندانوں کا طرزِ عمل کم از کم کہنے کو تو 'انوکھا' تھا۔ بازنطینی جنہوں نے 800ء میں پوپ لیوسوم کی طرف سے شارلیمانے کی تاجپوشی کو اس لیے مسترد کر دیا تھا کہ فرانکوں کا ہیرو ان پڑھ تھا، اب خود دوسرے خاندانوں سے مدد کی بھیک مانگ رہے تھے، تاکہ ترکوں کے مسلسل حملوں سے اپنی سلطنت کی سرحدیں بچا سکیں۔

اس دوران جب صلاح الدین مصر و شام کو متحد کر کے فلسطین کو آزاد کرا رہے تھے، انگلینڈ اور فرانس میں کیا ہو رہا تھا؟ فرانس کے لوئس ہفتم جو دوسری صلیبی جنگ کے دوران 'دھوکہ کھائے شوہر' کے طور پر بدنام ہوئے، اس نے بالآخر 1165 میں اپنی تیسری بیوی ایڈیل آف شیمپین سے 45 سال کی عمر میں ایک وارث پایا۔ اس لڑکے کا نام فلپ آگسٹس رکھا گیا اور لوگوں نے اسے 'خدا کا عطیہ' قرار دیا، کم از کم اس لیے کہ سب کو یقین تھا کہ اس کے باپ کے پاس ایسی کوئی قوت باقی نہیں رہی تھی!

اگر یہ پیرس کی چہ مگوئیاں تھیں تو دوسرا پہلو زیادہ سنجیدہ تھا: کیپیٹین خاندان کے اس وارث نے پلانتاجنیٹ خاندان کے اس خواب کو توڑ دیا کہ وہ انگلینڈ کے ساتھ ساتھ فرانس کا بھی تاج اپنے سر لے سکیں۔فرانس میں فلپ کی پیدائش پر جشن منایا گیا، انگریزوں کا مذاق اڑایا گیا اور دعائیں کی گئیں کہ وہ بڑا ہو کر ہیری دوم اور اس کے وارثوں کو اکوئٹین سے نکال دے۔

انگلینڈ میں فلپ کی پیدائش پر افسردگی چھا گئی۔شاہی نجومیوں نے آسمان میں دو دمدار ستارے دیکھے اور کہا کہ یہ کسی بادشاہ کی بربادی یا موت کی علامت ہیں۔فلپ اپنے سب سے مشہور ُمدمقابل ٗ بچہ رچرڈ سے آٹھ سال چھوٹا تھا۔ایلیانور جو پر ہیز گار لوئس کو وارث نہ دے سکی، چالیس کی دہائی میں ہنری کے ساتھ اپنی تولیدی زرخیزی کے جھنڈے گاڑ چکی تھی۔اس نے پانچ بیٹے پیدا کیے جن میں سے پہلا شیر خوارگی ہی میں مر گیا، جبکہ رچرڈ اس کا دوسرا زندہ بچ جانے والا بیٹا اس کا سب سے چہیتا تھا۔

دونوں شاہی خاندانوں نے اپنی سیاست کو محبت بھرے تعلقات کے درمیان حائل نہیں ہونے دیا۔ ایلیانور کے بیٹے رچرڈ اور سوتیلے بیٹے فلپ ایک دوسرے کے چہیتے بن گئے۔اس دور کے معروف مؤرخ اور ویلز کے آرچ ڈیکن، جیرالڈ آف ویلز، نے اس تعلق کو بڑی صاف گوئی سے بیان کیا: دونوں ایک ہی پلیٹ میں کھاتے اور ایک ہی بستر پر سوتے تھے۔ 1161 میں فلپ کی خوبصورت سوتیلی بہن الیئس کی شادی رچرڈ سے طے کی گئی۔اس وقت رچرڈ کی عمر صرف چار سال تھی مگر شہزادوں کی شادیاں ہمیشہ سیاسی اتحاد کے لیے کی جاتی تھیں۔الیئس کو انگریزی آداب سیکھنے کے لیے انگلینڈ بھیج دیا گیا، تاکہ وہ رچرڈ کے لیے تیار ہو سکے۔اس دوران جب رچرڈ فلپ کے بستر پر تھا، الیئس نے رچرڈ کے والد ہنری کے بستر میں جگہ بنا لی۔ ہنری نے ایلیانور کو قید خانے بھیج کر الیئس کے لیے جگہ خالی کر دی۔ایلیانور کا پہلا شوہر اسے زنا کے الزام میں قید کر چکا تھا اور اب اس کا دوسرا شوہر اپنے ہی زنا کے باعث اسے قید کر رہا تھا۔معاملات اور بھی پیچیدہ تب ہوئے جب فلپ رچرڈ کے بھائی جیفری کے عشق میں مبتلا ہو گیا، حالانکہ جیفری کو دھوکہ دہی، ریاکاری اور منافقت کے لیے بدنام کیا جاتا تھا۔سیاسی سطح پر فلپ نے اصرار کیا کہ رچرڈ کو الیئس سے شادی کا وعدہ پورا کرنا چاہیے، کیونکہ وہ فرانس کے جیزور قلعے کو حاصل کرنا چاہتا تھا جو اس شادی کے معاہدے کا حصہ

تھا۔ یہی وہ قلعہ تھا جہاں دونوں شاہی خاندان اکثر ایلُم کے درخت تلے ملاقات کرتے تھے۔ رچرڈ کو اپنی مستقبل کی بیوی کے عاشقوں سے کوئی فرق نہیں پڑتا تھا، مگر وہ اس بات پر ناراض تھا کہ اسے تخت کا وارث نہیں بنایا جا رہا ہے۔ ہنری نے اپنے بیٹوں کے درمیان خانہ جنگی کو ہوا دی جو تین سال تک جاری رہی اور 1183 میں بڑے بیٹے کی موت پر ختم ہوئی۔ رچرڈ کی سب سے بڑی رکاوٹ ختم ہو چکی تھی، مگر اس کا باپ اب بھی تلخ اور ضدی تھا۔ 1186 میں تیسرے بیٹے جیفری کی موت ایک حادثے میں کچلے جانے سے ہوئی۔ فلپ اس قدر غمگین ہوا کہ اس نے دھمکی دی کہ وہ خود کو جیفری کے ساتھ دفن کر دے گا۔ اس کے بعد وہ اپنا غم ہلکا کرنے کے لیے دوبارہ رچرڈ کے پاس لوٹ آیا۔

اسی کے بعد اس خاندان کی آنکھیں کھلیں یا شاید یوں کہیے کہ انہیں حقیقت نظر آئی۔ نومبر 1187 میں صور کے آرچ بشپ یوسائیاس سیاہ بادبان والی کشتی پر سوار ہو کر یورپ روانہ ہوا تا کہ وہاں کے حکمرانوں کو مقدس سرزمین میں ہونے والے واقعات کی بری خبر دے سکے۔ اس وقت پوپ گریگوری ہشتم تھا، جس نے یورپ پر زور دیا کہ وہ اپنی آپسی لڑائیوں کو چھوڑ کر مسلمانوں کے خلاف ایک اور صلیبی جنگ کی تیاری کرے۔ گریگوری دو ماہ کے اندر فوت ہو گیا، مگر کلیمنٹ سوم نے اس مشن کو آگے بڑھایا۔ اس نے یوسائیاس کو انگلینڈ بھیجا تا کہ وہ مسلمانوں کو جنہیں اس نے 'حضرت اسماعیل کی ناقابل بیان اولاد' کہا تھا، ان کے خلاف ایک اور صلیبی جنگ کی قیادت کے لیے راضی کرے۔

یوسائیاس دسمبر میں فرانس میں رچرڈ سے ملا۔ شہزادہ اس کے سامنے جھک گیا اور صلیب کا نشان پہن لیا۔ یورپ کا پہلا شہزادہ جس نے تیسری صلیبی جنگ میں شامل ہونے کا اعلان کیا۔ یوسائیاس کی متاثر کن تقریر کے بعد ہنری اور فلپ نے بھی اس کی تقلید کی اور صلیب کے سامنے جھک گئے۔

ہنری گھٹنوں سے بہت جلدی کھڑا ہو گیا۔ اس کا خیال تھا کہ وہ اپنے حصے کا فرض ادا کر چکا ہے، جب اس نے تھامس بیکیٹ کے قتل کے کفارے کے طور پر ٹیمپلرز اور ہاسپٹالروں کو خون بہا کی رقم ادا کی تھی۔ وہ جلد ہی سوال کرنے لگا کہ آخر وہ مسیح کی عبادت کیوں کرے، جب مسیح اس کی اپنے بیٹے کے خلاف جنگ میں اس کا ساتھ نہیں دے رہا؟ جب ہنری اور فلپ کی دوبارہ ملاقات جیزور کے ایلُم کے درخت کے نیچے ہوئی تو عقیدت پھر سے تلخی اور دشمنی میں بدل چکی تھی۔ غصے میں فلپ نے وہ

ایلُم کا درخت کٹوا دیا اور ہنری نے اعلانِ جنگ کر دیا، لیکن یہ جنگ صلاح الدین کے خلاف نہیں بلکہ فلپ کے خلاف تھی۔ وہ رچرڈ کے فلپ کے ساتھ تعلق پر چیخنے لگا اور اپنے بیٹے کو کوسنے لگا۔ 1188 میں ان دونوں شاہی عاشقوں نے ہنری کے خلاف متحد ہو کر بغاوت کر دی۔ شکست خوردہ ہنری تنہائی اور کرب میں مر گیا۔ روایت ہے کہ جب رچرڈ اپنے باپ کی لاش کے قریب پہنچا تو ہنری کی ناک سے خون بہنے لگا، مگر اب رچرڈ بادشاہ بن چکا تھا اور مقدس جنگ کے لیے تیار تھا۔

اس کی تاجپوشی کی ضیافت میں صرف مردوں کو مدعو کیا گیا۔ انگلینڈ کے یہودیوں کے خلاف ایک خونی مہم چلائی گئی جو صلیبی جنگ کے لیے فضا تیار کرنے کا آغاز تھی۔ کہا جاتا ہے کہ رچرڈ کو یہودیوں کے دانت آہستہ آہستہ نکالنے کی کہانیاں سن کر خوشی ہوتی تھی۔ اس نے انگلینڈ میں وہ ٹیکس نافذ کیا جو ’صلاح الدین ٹیکس‘ کے نام سے مشہور ہوا۔ کہا گیا کہ ہر فرد کی آمدنی کا دسواں حصہ تین سال تک ادا کیا جائے سوائے ان لوگوں کے جو خود صلیبی جنگ میں شریک ہو جائیں۔ شاید یہ اتفاق نہیں تھا کہ ایک مسلمان کے نام پر مسیحیوں نے جزیہ جیسا ٹیکس عائد کر دیا تھا۔

جولائی 1190 میں رچرڈ اول اور فلپ دوم اپنی فوجوں کے ساتھ برگنڈی کے میدانوں میں ملے۔ فلپ اب بھی غیر شادی شدہ تھا، مگر رچرڈ سے چھ سال چھوٹا ہونے کے باوجود وہ دس برس سے فرانس کا بادشاہ تھا۔ رچرڈ پورے یورپ کا ہیرو بن چکا تھا۔ دونوں نے الگ الگ راستے اختیار کیے، مگر یہ طے پایا کہ سسلی میں اکٹھے ہوں گے اور پھر ’الزام لگانے والی قوم‘ کے خلاف مشترکہ حملہ کریں گے۔

بہاء الدین ان مسلم جذبات کو بیان کرتا ہے جب فلپ 20 اپریل 1191 کو چھ جہازوں کے ساتھ اترا اور رچرڈ 8 جون کو اس کے پیچھے آیا۔ ’اس کے (رچرڈ کے) آنے کا مسلمانوں پر گہرا اثر ہوا: وہ پچیس جہازوں کے ساتھ آیا، جو آدمیوں، ہتھیاروں اور ساز و سامان سے لدے ہوئے تھے اور فرانکوں نے رات بھر اپنے خیموں میں آگ جلا کر خوشی منائی ... اس کے آنے سے مسلمانوں کے دلوں میں خوف بیٹھ گیا، مگر سلطان نے اس گھبراہٹ کا مقابلہ ہمت اور اللہ پر اعتماد کے ساتھ کیا۔‘ صلاح الدین نے اس متحدہ یورپی طاقت کے خلاف جہاد کا اعلان کرتے ہوئے کہا:

”مسلمانوں کی غیرت کہاں ہے؟ اہلِ ایمان کا فخر اور جوش کہاں گیا؟ وہ سست اور

غافل ہو چکے ہیں... اگر خدا نہ کرے اسلام نے اپنی طاقت کھو دی، اس کی شان ماند پڑ گئی اور اس کی تلوار کند ہو گئی، تو پھر مشرق و مغرب، قریب و دور کوئی نہ رہے گا، جو اللہ کے دین کے لیے جوش دکھائے یا حق کے مقابلے میں باطل کو للکارے۔ یہی وہ وقت ہے جب سستی کو جھاڑ پھینکیں اور قریب و دور سے ہر اس شخص کو پکاریں جس کی رگوں میں خون دوڑ رہا ہے... خدا نے چاہا تو کافر ہلاک ہوں گے اور اہل ایمان کو یقینی نجات ملے گی۔''

رچرڈ اور صلاح الدین کے درمیان سولہ ماہ تک جاری رہنے والا جنگی مقابلہ رومانس سے بھرپور تھا اور اس سے زیادہ رومانوی کوئی منظر نہ تھا جتنا صلیبی جنگ کے آخری معرکے کا۔ صلاح الدین کی فوج نے یافا کے باہر رچرڈ کے کیمپ پر حملہ کیا اور اگرچہ رچرڈ کے پاس بہت کم سپاہی تھے، اس کے دل میں وہی شیر جیسی جرأت باقی تھی۔ اس کی بہادری اور مہارت نے خود صلاح الدین کو بھی حیران کر دیا۔ جنگ کے دوران رچرڈ کا گھوڑا مارا گیا اور وہ بے بس ہو گیا۔ صلاح الدین نے اپنے بھائی الملک العادل سے کہا کہ دو عربی گھوڑے رچرڈ کو تحفے میں دے دو، کیونکہ ایسا عظیم بادشاہ پیدل لڑنے کے لائق نہیں۔ رچرڈ نے صلاح الدین کے دیے ہوئے گھوڑے پر سوار ہو کر اس دن کو تو بچا لیا، مگر صلیبی جنگ کو بچا نہ سکا۔ 6 جولائی 1192 کو بیت نوبا سے پسپائی کے بعد یہ جنگ عملاً ختم ہو گئی، جب یروشلم بالکل سامنے تھا اور فوج کا حوصلہ بہت بلند تھا۔ مگر رچرڈ کا حوصلہ جواب دے گیا۔ اسے یہ بھی یقین ہو چکا تھا کہ صلاح الدین کو اس کی ہر چال کا پہلے سے علم ہوتا ہے۔ اس کی انٹیلی جنس اتنی اعلیٰ تھی کہ لگتا تھا رچرڈ کی کونسل میں کوئی اندرونی جاسوس موجود ہے۔ یہ شخص جو بھی تھا تاریخ کا سب سے فیصلہ کن جاسوس بن گیا۔

اگرچہ رچرڈ یروشلم پر حملے کے لیے تیار تھا، مگر اس نے اپنی کمان سے استعفیٰ دے دیا۔ فلپ پہلے ہی فرانس لوٹ چکا تھا۔ یوں یہ سب کچھ ایک مایوس کن انجام پر ختم ہوا۔ برگنڈی کے ڈیوک ہیوگ نے ایک گیت بنایا جس میں رچرڈ کی مردانگی پر سوال اٹھایا گیا، تو جواب میں رچرڈ نے بھی ایک طنزیہ گیت لکھا۔ یافا کے بعد رچرڈ شدید بیمار ہو گیا اور جب اس کے سامنے صلاح الدین کے ساتھ

معاہدہ پڑھ کر سنایا گیا تو وہ تپ دق میں مبتلا تھا۔ دو عظیم لوگوں کے درمیان آخری مکالمہ ان کی اصل شخصیت کی عکاسی کرتا ہے۔ رچرڈ نے صلاح الدین کو پیغام بھیجا کہ وہ صرف تین سالہ جنگ بندی کے عرصے کے لیے واپس جا رہا ہے اور پھر پہلے سے بھی بڑی فوج کے ساتھ واپس لوٹے گا۔ صلاح الدین نے جواب دیا کہ اگر اسے اپنی سلطنت کھونی ہی پڑے تو وہ چاہے گا کہ اس کا حریف رچرڈ جیسا دلیر اور باعزت بادشاہ ہو۔

اکتوبر میں رچرڈ آخری جہاز سے روانہ ہوا اور دوسری بار تاجپوشی سے پہلے کئی عجیب و غریب جوکھموں کا سامنا کیا۔ صلاح الدین بمشکل اس موسم سرما کو گزار پایا۔ فروری میں وہ بیمار پڑا اور 4 مارچ 1193 کو اس کا انتقال ہو گیا۔ اس کا خواب پورا ہو چکا تھا۔ اس نے نہ صرف یروشلم کو فتح کیا تھا، بلکہ اسے اسلام کے لیے محفوظ بھی کر دیا تھا۔ بہاء الدین لکھتے ہیں کہ 'ان کی وفات کا دن اسلام اور مسلمانوں کے لیے وہ غم کا دن تھا جو خلافت راشدہ کے دنوں کے بعد کبھی نہیں آیا تھا۔' ان کے جنازے کا خرچ قرض لے کر پورا کیا گیا، کیونکہ ان کے پاس کوئی ذاتی دولت نہ تھی۔ مسلمان اس کے لیے روئے اور یاد کیا کہ نبی ﷺ کی وفات کے وقت بھی ان کے پاس صرف ہتھیار، ایک سفید خچر اور خیبر کی وہ چھوٹی سی زمین تھی جو تحفے میں دے دی گئی تھی۔ جنازے کی نماز امام محی الدین ابن الزکی نے پڑھائی، وہی نوجوان قاضی جو صلاح الدین کی یروشلم فتح کے بعد مسجد اقصیٰ میں پہلا جمعہ پڑھانے کے لیے منتخب ہوا تھا۔

اللہ! محمد! صلاح الدین! یہ پیغام یروشلم کے قدیم شہر میں واقع ایک چھوٹی اور سادہ مسجد 'الخانقاہ' کے ایک کمرے میں کندہ ہے، جہاں 1187 کی عظیم فتح کے بعد صلاح الدین قیام کرتے ہیں۔ صلاح الدین نے نبی ﷺ کے بعد سب سے کامیاب جہاد کی قیادت کی تھی۔

7

# یورپ کی سرحد پر اسلام کی دستک

''جس چیز کو تم مرد ہو کر نہ سنبھال سکے، اس پر عورت کی طرح نہ رویا کرو۔''

[عائشہ کی ماں، جب اس نے غرناطہ کے زوال پر آہ بھری]

جو چاہو وہ نہ کرو، نہ ہی وہ کرو جو کر سکتے ہو، بلکہ وہ کرو جو تمہارے مفاد میں ہو۔ اگر کبھی کسی سرکاری دفتر جاؤ، تو اندھے بن کر داخل ہو اور بہرے بن کر باہر نکلو۔'

[یہ دو اقوال یونانی شہزادے الیگزینڈر ماوروکورڈیٹو نے عثمانی سلطنت کی خدمت کے دوران 'کتاب الفرائض' میں لکھے، بحوالہ: فلپ مینسیل کی کتاب City of the World's Desire Constantinople: (کونسٹن ٹینوپل: شہر جو دنیا کو عزیز تھا) (1453-1924، جان مرے، 1995)]

غرناطہ میں کہا جاتا ہے کہ زندگی میں اس سے زیادہ دردناک کوئی چیز نہیں کہ الحمرا میں آنکھیں بند ہو جائیں۔ جب صحرا کے عربوں نے اسپین فتح کیا تو انہوں نے کہا کہ وہ جنت میں پہنچ گئے ہیں۔ الحمرا کے قلعے کی فصیلوں سے جو سیرا نیواڈا کی چوٹی پر ہے، باہر دیکھیں تو فطرت کی تخلیق کردہ جنت نظر آتی ہے اور اندر دیکھیں تو انسان کی بنائی ہوئی جنت۔ جو لوگ الحمرا کی کہانی سے رومانس کو نکال دیتے ہیں وہ محرومی کے شکار ہیں۔ یادداشت ہمیشہ خشک حقیقت سے زیادہ زرخیز ہوتی ہے۔

آخری مسلم حکمران بوعبدل کو اس کی رعایا 'الزوغیبی' یعنی بدنصیب کہتی تھی۔ کچھ اسے 'الرے چیکو' یا لڑکا

بادشاہ بھی کہتے تھے۔لڑکے تو بدل جاتے ہیں، مگر قسمت ہمیشہ نہیں بدلتی۔اس کے والد ابن حسن نے بڑھاپے میں عیسائی قیدی زریا سے عشق کرلیا۔الحمرا کے باغات میں سائپرس کے درختوں والے صحن میں رہنما آج بھی اس گوشے کی نشاندہی کرتے ہیں جہاں بادشاہ اپنی محبت سے ملنے جاتا تھا۔ابن حسن کی بیوی عائشہ کو ایک اور شاہی شادی سے خاص فرق نہ پڑتا، مگر اسے زریا کے دو بیٹوں کی فکر تھی۔وہ اپنے بیٹے بوعبدل کے لیے سلطنت چاہتی تھی۔ایک کم عمر بیوی ہمیشہ بادشاہ کے کان کے قریب ہوتی ہے۔ 1482 تک ابن حسن اور بوعبدل آمنے سامنے آ گئے۔ناصر خاندان اس لڑائی سے کبھی نہ سنبھل سکا۔ 1483 میں بوعبدل قشتالیوں کا قیدی بنا، جنہوں نے اسے اس کے والد کے خلاف ایک مہرے کے طور پر استعمال کیا۔ 1485 میں انہوں نے رونڈا پر قبضہ کرلیا۔اگلے برسوں میں لوجا، مالاگا، باجا اور المیر ابھی ہاتھ سے نکل گئے۔ 1491 میں قشتالیوں نے اسپین کے آخری مسلم قلعے الحمرا کا محاصرہ کرلیا۔دسمبر میں ہتھیار ڈالنے کی شرائط طے ہوگئیں۔ 1 جنوری 1492 کو عیسائی فوجیں الحمرا میں داخل ہوگئیں۔

2 جنوری 1492 کی صبح بوعبدل نے الحمرا کی چابیاں حوالے کردیں۔وہ ایک پہاڑی کی چوٹی پر جسے آج 'ال سسپائر و دل مورو' یا 'مور کی آخری آہ' کہا جاتا ہے، رکا اور آنکھوں میں آنسو لیے آخری بار الحمرا کو دیکھنے کے لیے مڑا۔اس کی ماں عائشہ نے کہا: 'جس چیز کو تم مرد ہو کر نہ سنبھال سکے، اس پر عورت کی طرح نہ رویا کرو۔'

لیکن تاریخ کے اتار چڑھاؤ کے سامنے ایک لڑکا بادشاہ کہاں ٹھہر سکتا تھا؟ عیسائی مورخین نے 'ریکونکوئسٹا' کے آغاز کو 722 میں کوواڈونگا کی جنگ سے جوڑ دیا، جو مسلمانوں کی 711 میں گواڈالیت کی فتح کے گیارہ سال بعد لڑی گئی تھی۔یہ تاریخ حقیقت سے زیادہ دل بہلانے والی تھی۔مسلمانوں کے اسپین سے اخراج کی اصل تاریخ 1085 ہے، جب طلیطلہ الفانسو ششم کے ہاتھ سے نکل گیا۔

یہ اسپین سے فلسطین تک کلیسا کے عروج کا زمانہ تھا۔ 1150 تک مسلمانوں نے دریائے گواڈیانا اور لزبن کے شمال کا تمام علاقہ کھو دیا تھا۔اسی دوران جب زنگی اور نورالدین فلسطین میں جہاد کے جذبے کو تازہ کر رہے تھے، مراکش کے الموحدین نے اسپین میں عیسائیوں کی پیش قدمی کو روکنے

کے لیے مداخلت کی۔ فرق یہ تھا کہ اسپین میں اس ابتدائی جوش کو سنبھالنے والا کوئی صلاح الدین موجود نہیں تھا۔ الموحدین کی طاقت صدی کے آخری عشروں تک محدود رہی۔ 1191 میں انہوں نے الکاسر دو سال کو قبضے میں لے کر لزبن کو دھمکی دی مگر اسے حاصل نہ کر سکے۔ 1195 میں انہوں نے قشتالہ کے الفانسو ہشتم کو شکست دی اور 1197 میں میڈرڈ کی طرف بڑھے مگر پھر نا کام رہے۔ کلیسا کی تشویش بڑھتی گئی۔ اسپین کو باضابطہ طور پر صلیبی جنگ کا علاقہ قرار دیا گیا۔ پوپ انوسنٹ سوم نے فرانس کے ہر بشپ کو حکم دیا کہ وہ قشتالہ کی مدد کے لیے جائے۔ ساتھ ہی 1179 اور 1215 کی لیٹرن کونسلوں نے عیسائیوں کو مسلمانوں اور یہودیوں کے گھروں میں کام کرنے یا ان سے تجارت کرنے پر پابندی لگا دی، اور خلاف ورزی کی صورت میں جلاوطنی اور املاک کی ضبطی کی دھمکی دی گئی۔ (1227 میں پوپ گریگوری نہم نے عیسائی علاقوں میں اذان دینے پر پابندی لگا دی۔)

1212ء میں الفانسو ہشتم نے ارغون اور نوارا کے لشکروں کے ساتھ لاس ناواس دے تولوسا (Las Navas de Tolosa) کی جانب پیش قدمی کی اور 16 جولائی کو الموحدین کو مکمل طور پر شکست دی۔ 1236ء میں فرنینڈ وسوم نے قرطبہ، جو اندلس کا صدر مقام اور اسپین کا عظیم خزانہ تھا، فتح کر لیا۔ یہ کامیابی ایک ایسے محاصرے کے بعد حاصل ہوئی جس کی بنیاد جنوری میں عیسائی کرائے کے فوجیوں کی بغاوت بنی۔ محاصرہ 29 جون تک جاری رہا، جب شہر نے ہتھیار ڈال دیے۔ اگلے ہی دن عظیم مسجد کو کلیسا میں تبدیل کر کے وہاں عبادت کا آغاز کر دیا گیا۔ 22 دسمبر 1248ء کو قشتالہ کے بادشاہ فرنینڈ و نے فاتحانہ انداز میں اشبیلیہ میں داخلہ لیا۔ ہر مسلمان کو پیشگی حکم دیا جا چکا تھا کہ وہ شہر چھوڑ دے اور اس وقت اسپین کا بیشتر حصہ ارغون، قشتالہ یا پرتگال کے زیر نگیں تھا۔ ان فتوحات کی گونج اتنی بلند تھی کہ آخری صلیبی جنگ کی قیادت کرنے والے فرانس کے بادشاہ لوئیس نہم نے 5 جون 1249ء کو مصر کے سلطان ایوب کو ایک خط میں دھمکی دی کہ 'ہم نے تمہارے لوگوں کو اسپین میں بیلوں کے ریوڑ کی طرح بھگا دیا۔ ہم نے مردوں کو قتل کیا، عورتوں کو بیوہ بنایا اور لڑکیوں اور لڑکوں کو قید کر لیا۔ کیا یہ سبق تمہارے لیے کافی نہیں تھا؟' اندلس میں اسلام کی آخری چمک اب بھی باقی تھی۔

1237ء میں محمد بن یوسف بن نصر نے غرناطہ میں اپنی حکومت کی بنیاد رکھی۔ ان کا کوئی معروف نسب

نہ تھا۔ ڈھائی صدی سے زیادہ عرصے تک نصری سے معروف خاندان نے غرناطہ سے لے کر جبرالٹر تک ایک وسیع علاقے پر حکمرانی کی اور اس دوران مسلم اسپین کی شاندار ترین فنون لطیفہ اور تعمیرات کو اپنے پیچھے چھوڑ دیا۔ اس شان وشوکت کی تہہ میں ایک حقیقت پسندانہ شعور موجود تھا جس نے اس خاندان کو بچائے رکھا۔ 1246ء سے نصری خاندان نے قشتالہ کو سالانہ خراج دینا شروع کر دیا۔ اس حقیقت پسندی کو محمد دوم کے بنائے ہوئے مضبوط قلعوں کی زنجیر نے مزید تقویت بخشی، جنہوں نے غرناطہ کی خودمختاری کو محفوظ رکھنے اور اسے دیومالائی داستانوں کا موضوع بنانے میں اہم کردار ادا کیا۔ چھپی ہوئی دولت کی کہانیوں نے جن کی حفاظت ایک دیو کرتا تھا، نپولین کے سپاہیوں کو آمادہ کیا کہ وہ اسپین پر اپنے حملے کے دوران سات منزلہ مینار کو دھماکے سے اڑا دیں۔ وہ کچھ نہ پا سکے لیکن ملبہ اس دروازے پر جا گرا جس سے بوعبدل روانہ ہوا تھا، اور یوں وہ دروازہ ہمیشہ کے لیے بند ہو گیا۔

محمد پنجم نے اس خاندان کی سب سے شاندار تخلیق کو مکمل شکل دی۔ یہ پہاڑی قلعے میں محلوں، دفاتر اور باغات کا عظیم مجموعہ تھا جسے الحمرا کہا جاتا ہے۔ اس کے شاندار دروازے کی محراب پر ایک بڑا ہاتھ پتھر پر کندہ ہے اور اس کے نیچے ایک چابی بنی ہوئی ہے۔ ہاتھ عقیدہ کی علامت ہے اور چابی ایمان کا دروازہ کھولتی ہے۔ ایک واحد جملہ بانی محمد اول کا شعر سینکڑوں جگہوں پر نقش ہے۔ اندرونی دیواروں، محرابوں اور باغات کا رخ کرنے والی دیواروں پر بھی 'ولا غالب الا اللہ' (یعنی اللہ کے سوا کوئی فاتح نہیں) کی تحریر موجود ہے، تاکہ کوئی حکمران اس کو کبھی فراموش نہ کرے۔ جب غرناطہ فتح ہوا تو پورے یورپ میں کلیساؤں کی گھنٹیاں خوشی سے بجنے لگیں۔

وہ دروازہ جس سے اسلام نے مغرب کے راستے یورپ میں داخلہ لیا تھا، سات سو برس سے زائد کے بعد بالآخر بند ہو گیا۔ تاہم، ایک اور دروازہ قسطنطنیہ مشرق میں کھل چکا تھا۔

1204ء میں جب صلاح الدین ایوبی نے یروشلم فتح کیا تھا، اس کے سترہ سال بعد قسطنطنیہ کو مسلمانوں نے نہیں، بلکہ حیران کن طور پر چوتھی صلیبی جنگ کے حملہ آوروں نے لوٹا۔ اس بار اس جنگ کی ترغیب وینس اور جینوا کی سازشوں نے دی تھی۔ فرانک شہسوار جو مقدس سرزمین جانے کے لیے وینس پہنچے تھے، چالاک ڈوج کی تدبیر سے قسطنطنیہ کی جانب موڑ دیے گئے۔ وہاں انہوں نے

قتل و غارت گری، لوٹ مار اور عصمت دری کی۔ ابن الاثیر بیان کرتے ہیں کہ ایک طوائف کو پادری کے تخت پر بٹھا دیا گیا اور شرابی فرانک فوجیوں نے خانقاہوں میں عیسائی راہبات کی عصمت دری کی۔ اس دوران بلجیم کے بالڈون کو ایک ویران سلطنت کا شہنشاہ قرار دے دیا گیا۔ بازنطینی 1261ء میں واپس آئے، لیکن وہ دوبارہ کبھی اپنا اعتماد بحال نہ کر سکے۔ عثمان نے جن کی نسل کو عثمانی کہا جاتا ہے، 1299ء میں اناطولیہ کے شمال مغربی علاقے میں اپنی سلطنت قائم کی اور بورصہ کو اپنا پہلا دارالحکومت بنایا۔ 1366ء میں مراد اول نے دارالحکومت کو یورپ کے شہر ادیرنہ منتقل کر دیا۔ اگلے تیس برسوں میں عثمانیوں نے بلغاریہ اور سربیا کو شکست دی، جو قسطنطنیہ کے ممکنہ دعویدار سمجھے جاتے تھے۔ بایزید نے جو 1389ء سے 1402ء تک حکمران رہا، قسطنطنیہ کا محاصرہ کیا، لیکن شہر کی ان مشہور دیواروں نے اس کا راستہ روک دیا جو گولڈن ہارن کی بندرگاہ سے بحیرہ مرمرہ تک پھیلی ہوئی تھیں اور پھر شہر کے گرد گھومتی تھیں۔

1402ء میں عثمانی سلطنت کو ایک اور ترک وسط ایشیا کے عظیم سپہ سالار تیمور لنگ کے ہاتھوں پسپائی کا سامنا کرنا پڑا۔ اس نے بایزید کو شکست دے کر قید کر لیا۔ تاہم تیمور کی موت کے بعد عثمانیوں کی توسیع کی خواہش دوبارہ زندہ ہوئی۔ مراد دوم نے جو 1421ء میں سلطان بنا، قسطنطنیہ پر دوسرا حملہ کیا۔ اس کا بیٹا اس سے بھی بہتر کارنامہ انجام دے گیا۔

محمد دوم کی والدہ یا تو یہودی تھیں یا عیسائی غلام، کیونکہ ترک امراء عموماً حاملہ غلاموں سے نکاح کر لیتے تھے۔ اس کے والد کا خواب اس کی زندگی کا جنون بن گیا۔ محمد کو اکثر مذاق کا نشانہ بنایا جاتا، خاص طور پر اس کے اپنے وزیر اعظم کی طرف سے جو اس خواب کو جوانی کی نادانی قرار دیتے تھے۔ محمد نے ایسی نصیحتوں کو نظر انداز کر دیا۔ اس نے بوسفورس پر روملی حصاری کا قلعہ تعمیر کر کے قسطنطنیہ پر حملے کی تیاری کی، تاکہ رسد کے راستے محفوظ رہیں۔ مئی 1453ء میں محمد نے جہاد کا اعلان کیا۔ اس نے اپنی فوج کو مجاہدین یعنی اللہ کے سپاہی کہہ کر مخاطب کیا اور انہیں نبی اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی پیش گوئی یاد دلائی کہ ایک دن قسطنطنیہ مسلمانوں کے ہاتھ آئے گا۔

29 مئی 1453ء کو اس کی فوج نے خون کی بارش کی طرح خون بہایا اور لاشیں نہر میں تیرتے تربوزوں

کی طرح سمندر کی جانب بہنے لگیں، جیسا کہ ایک مبصر نیکولو باربرو نے بیان کیا ہے۔ آخری بازنطینی شہنشاہ قسطنطین دوم اپنی زندگی اور سلطنت کے خاتمے تک لڑتا رہا۔ تقریباً 30 ہزار عیسائی یا تو غلام بنا دیے گئے یا فروخت کر دیے گئے۔ سلطان محمد سفید گھوڑے پر سوار ہو کر چھٹی صدی میں جسٹنین کے تعمیر کردہ عظیم کلیسا 'آیا صوفیہ' کی طرف بڑھا۔ اس نے کلیسا کے دروازے پر اتر کر مٹی کی ایک مشت اٹھائی، اپنے عمامے پر ڈالی اور کلمہ شہادت پڑھا: 'اللہ کے سوا کوئی معبود نہیں اور محمد اس کے رسول ہیں'۔ اسی لمحے وہ کلیسا مسجد میں تبدیل ہو گیا۔ محمد نے خاندان عثمان کی کامیابی کے لیے دعا کی۔

وہ صرف 20 برس کا تھا۔ اس کے پہلے فیصلوں میں سے ایک فیصلہ اس وزیر اعظم کو قتل کرنے کا حکم دینا تھا جس نے قسطنطنیہ کا خواب دیکھنے پر اس کا مذاق اڑایا تھا۔

استنبول جو اس کا ترکی نام ہے، اسلام کا شہر نہیں کہلاتا۔ یہ دراصل یونانی زبان کے ایک فقرے eis teen polin کی بگڑی ہوئی شکل ہے، جس کا مطلب ہے 'شہر کی طرف'۔ ترک کسان کے لیے دارالحکومت کا سفر بلاشبہ ایک بڑا واقعہ تھا۔ محمد نے اس تحریف کو مزید بگاڑ کر 'اسلامبول' یا 'اسلام کا شہر' کی اصطلاح وضع کر لی۔ قسطنطنیہ کو اسلام کی طاقت کا نیا مرکز بننا تھا، وہ جگہ جہاں سے غازی یا اللہ کے سپاہی دوبارہ عیسائی یورپ کی طرف پیش قدمی کر سکیں۔ اپنی فتح کے دو سال کے اندر ہی اس فتح مند سلطان کا خواب روم پر قبضے کا بن چکا تھا۔ اپنے پوتے سلیم کی طرح محمد بھی خود کو ایک نیا سکندر سمجھتا تھا اور اس نے مقدونیہ کے سکندر کی سوانح حیات جسے آریان نے لکھا تھا، ہر روز سنی۔ قرآن میں سکندر کا ذکر قدیم ہیرو کے طور پر آیا ہے اور یہ ایک جائز نمونہ ہے جسے اسلامی مجاہد اپنا آئیڈیل مان سکتا ہے۔

علما نے محمد کو یاد دلایا کہ یہ فتح اللہ کی عطا ہے۔ اس نے اس سے اختلاف نہیں کیا بلکہ اسے خاندان عثمان کے لیے اللہ کی برکت کی علامت سمجھا۔ واعظین نے کہانیاں بیان کیں کہ سفید لباس میں ملبوس اولیاء کرام جن کی قیادت نبی الیاس کر رہے تھے، محمد کی فوج کے ساتھ اس دن لڑے جب قسطنطنیہ فتح ہوا۔ اس الٰہی مدد کی تصدیق کے لیے اور اس کارنامے کو نبی اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی قسطنطنیہ کی پیش گوئی سے جوڑنے کے لیے ابوایوب انصاری کا مزار دریافت ہوا، جو ان دیواروں کے ساتھ تھا

جو 669ء میں فتح کے باوجود قائم رہیں۔ ابوایوب انصاری نبی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے صحابی تھے اور بازنطینی دارالحکومت کے دوسرے محاصرے کے دوران اموی فوج کے سالاروں میں شامل تھے۔ 1459ء میں محمد نے ان کے مزار پر ایک مسجد تعمیر کروائی جو زیارت گاہ بن گئی۔ آج بھی اس علاقے کو ایوب کہا جاتا ہے اور یہ ایک معتبر مقام سمجھا جاتا ہے۔ 1470ء میں ایک دوسری مسجد مکمل ہوئی جو کلیسا آف ہولی اپوسلز کی جگہ تعمیر ہوئی۔ اس مسجد میں نبی اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی قسطنطنیہ سے متعلق پیش گوئی سنہرے حروف میں کندہ ہے۔

توپ کاپی کے حرم کی پرلطف داستانیں، جن میں غلاموں، لونڈیوں، طاقت کے پجاری خوجوں، پروٹوکول میں جکڑے سلطانوں اور خوف میں مبتلا رشتہ داروں کا احاطہ ہوتا ہے، ہمیں اس حقیقت سے غافل نہیں کرسکتیں کہ یہ نظام مؤثر تھا اور ریاست اپنے آپ کو فخر کے ساتھ اسلامی کہتی تھی۔ کوئی سلطان مفتی کے فتویٰ کے بغیر جنگ کا اعلان نہیں کرتا تھا۔ ہر جمعہ جب سلطان دارالحکومت میں موجود ہوتا تو وہ جلوس کی شکل میں مسجد میں نماز جمعہ کے لیے جاتا۔ عید میلاد النبی ہر سال تزک واحتشام اور رنگارنگ روشنیوں کے ساتھ منائی جاتی تھی، یہاں تک کہ 1841 میں ایک زائر یہ دیکھ کر حیرت سے کہہ اٹھا کہ یہ رات تو گویا اس کی کہانیوں جیسی لگتی ہے۔ اس زائر کا نام ہانس کرسچن اینڈرسن تھا۔

ریاستی تقریبات میں سب سے اہم موقع سلطان کے بیٹوں کی ختنے کی تقریب کا ہوتا تھا۔ اس کی ابتدا 32 سالہ سلیمان نے 27 جون 1530 کو کی تھی، جب اس کے تین بیٹے مصطفیٰ، محمد اور سلیم ختنے کے عمل سے گزرے۔ اس موقع پر سلطنت کے معززین اور وفادار غیر ملکی شہزادے موجود تھے۔ امراء کے لیے شان وشوکت، عوام کے لیے تماشا، دانشوروں کے لیے شاعری اور مدارس کے طلبہ کے لیے قرآن کی تلاوت کے مقابلے منعقد ہوتے۔ وقت کے ساتھ یہ تقریب مزید شاندار ہوتی گئی: محمد ثالث کی ختنے کے بعد ختنہ میں کٹی چمڑی کے لوتھڑے کو زریں طشتری میں اس کی ماں کو پیش کیا گیا، جبکہ دادی کو استرا نما چھری دی گئی اور استرا چلانے والے کو تین ہزار سونے کے سکے، سونے کا پیالہ، قیمتی کپڑے اور آخر میں سلطان کی ایک بیٹی سے نکاح کا شرف بخشا گیا۔ وہ کوئی عام حجام ہرگز نہیں تھا۔

سلیم اول کی فتوحات کے بعد سلطان کے حصے میں خلافت بھی آئی اور وہ دو مقدس مقامات کا خادم بھی بن گیا۔ شیخ الاسلام یعنی مفتی اعظم سلطنت کے سب سے طاقتور افراد میں شمار ہوتا تھا۔ وہ علماء کا سربراہ تھا اور اعلیٰ سیاست میں بھی بھرپور کردار ادا کرتا تھا، کیونکہ موقع کی مناسبت سے اس کے فتوے کے ذریعے سلطان کو معزول بھی کیا جا سکتا تھا۔ سب سے عجیب مثال 1622 میں دیے گئے فتوے کی تھی، جس نے عثمان دوم کو حج پر جانے سے روک دیا، حالانکہ حج دین کے پانچ ستونوں میں سے ایک ہے۔ حج کی اجازت نہ دینے کی وجہ یہ بیان کی گئی کہ اس کی غیر موجودگی سے سلطنت میں بدنظمی پیدا ہو سکتی ہے۔ حقیقت یہ تھی کہ عثمان کے مقاصد مذہبی نہیں تھے۔ وہ حج کے سفر کے دوران ایک عرب فوج تیار کرنا چاہتا تھا، تاکہ ایلیٹ گارڈ (élite guard) ینی چری (Janissaries) کو چیلنج کر سکے۔ ینی چری نے عظیم مفتی اور صدر اعظم کے ساتھ مل کر عثمان کے خلاف بغاوت کر دی تھی۔ 9 مئی کو ینی چری کے سپاہیوں نے 'قانون کے نام پر' عثمان کو گرفتار کیا اور اسے سات برجوں میں لے جا کر گلا گھونٹ کر مار ڈالا۔ اس کی موت اس حد تک تکلیف دہ تھی کہ اس کے خصیے کو دبا کر اسے موت کے گھاٹ اتار دیا گیا تھا۔

بہت سے وزراء اعظم اور دیگر وزراء قرآن کی طاقت اور اس کی رہنمائی سے فیصلے کیا کرتے تھے۔ وہی 'قدیم طریقے' جن کی رہنمائی سے سلطنتیں حاصل ہوئیں اور انہیں برقرار رکھا گیا۔ انتظامی معاملات اور کبھی کبھار معاشی پالیسی میں بھی قرآن کی تعلیمات سے رہنمائی لی جاتی تھی۔ قانون شریعت پر مبنی تھا۔ بعض اوقات کچھ قوانین شریعت کی ہدایات سے بھی آگے نکل جاتے، جیسے مختلف برادریوں کے لیے مخصوص لباس کا ضابطہ۔ صرف مسلمانوں کو سبز یا سفید عمامے پہننے کی اجازت تھی، جبکہ عیسائیوں اور یہودیوں کے لیے ہلکے اور گہرے نیلے اور زرد رنگ کی پگڑیاں مخصوص کی گئی تھیں۔ بعض قوانین مزید سخت ہو جاتے تھے۔ مثلاً 1580 میں مراد سوم نے حکم دیا کہ غیر مسلموں کا رویہ عاجزی اور فروتنی کا ہونا چاہیے، اس لیے وہ مسلمانوں جیسے کپڑے نہ پہنیں، مساجد کے قریب یا بلند عمارتوں میں نہ رہیں، اور غلام خریدنے سے بھی باز رہیں۔

آنے والا مراد (جو مراد سوم کا بیٹا نہیں بلکہ تقریباً نصف صدی بعد کا سلطان تھا) کم عمری میں تخت نشین

ہوا اور بلوغت کی کوئی علامت ظاہر کرنے سے گریز کیا۔ اس کی والدہ والیدے کوسم ( Valide Kösem Sultan) کو سلطنت کی تاریخ کی سب سے طاقتور خاتون کہا جاتا ہے۔ اس نے اس کے نام پر سلطنت کی حکمرانی سنبھالی۔ اس کی سب سے بڑی فکر یہ تھی کہ اگر سلطنت میں نرمی آ گئی تو یمن ہاتھ سے نکل سکتا ہے، جو مکہ مکرمہ کا دروازہ ہے۔ کسی بھی سلطان کے لیے مقدس شہروں کا ضائع ہونا ناقابل برداشت تھا۔

یہ سب اس بات کی علامت نہیں کہ عوام پر کوئی سخت گیر اسلام نافذ کیا گیا یا غیر مسلموں کو حکومت یا فوج سے نکال دیا گیا۔ حقیقت اس کے برعکس تھی۔ سلطنت عثمانیہ کی کامیابی اس بات میں پوشیدہ تھی کہ غیر مسلموں کو شامل رکھا جائے۔ اسپین کی تفتیشی عدالت (انکوویزیشن) سے نکالے گئے یہودیوں کو سلطنت میں پناہ دی گئی اور وہ خلافت کے خاتمے تک امن سے آباد رہے۔ ایک محتاط اندازے کے مطابق یہودی آبادی تقریباً دس فیصد رہی، جو انیسویں صدی (مسلم سلطنتوں کے لیے مشکل دور) میں گھٹنے لگی۔ 1914 میں قسطنطنیہ کی آبادی میں 22 فیصد آرتھوڈوکس عیسائی، 25 فیصد آرمینیائی باشندے اور 4 فیصد یہودی شامل تھے۔

فاتح سلطان محمد ثانی نے عیسائیوں کو اسپین کی طرح ملک بدر کرنے کی کوئی کوشش نہیں کی، بلکہ چرچ کے لیے جگہ فراہم کی۔ وقت اور استحکام کے ساتھ بازنطینی شراب خانوں کی واپسی بھی یقینی ہوگئی، اگرچہ یہ کہنا مشکل ہے کہ وہ کبھی ختم بھی ہوئے تھے یا نہیں۔ سلطان محمد ثانی خود کوئی متقی پرہیزگار شخص نہیں تھا، بلکہ اس نے مصور جینٹائل بیلینی کو اپنے نجی کمروں کے لیے شہوانی تصویریں بنانے کا حکم دیا (بیلینی نے فاتح کا ایک شاندار پورٹریٹ بھی بنایا)۔

تاہم اس کا بیٹا بایزید ثانی نہایت متقی تھا۔ اس نے والد کی شہوانی تصویریں ہٹوا دیں اور کچھ عرصے کے لیے شراب خانوں کو بند کرا دیا، مگر وہ دوبارہ کھل گئے۔ زیادہ تر سلاطین شراب اور عورتوں کا شوق رکھتے تھے، اور بعض تو اپنی لذتیں کم سن لڑکوں تک لے گئے۔ سلیمان عالیشان نے ایک بار شراب پر پابندی کا حکم دیا، لیکن خود اس سے دستبردار نہیں ہوا۔ اس کا پوتا سلیم دوم اس معاملے میں حد سے گزر گیا۔ لوگ اسے پیار سے عموماً 'نشیڑی' (drunk) کہتے تھے اور کہا جاتا ہے کہ وہ نشے کی

حالت میں غسل کرتے ہوئے پھسل کر موت کا شکار ہوا۔

عام لوگوں کے لیے ایک نہایت سادہ مشروب 'بوزا' ہوا کرتا تھا، جو ایک طرح کی بیئر تھی۔ ہنگری کا سفیر اوجیئر ڈی بوسبیک جو 20 جنوری 1555 کو قسطنطنیہ پہنچا، سلطان سلیمان کے دور میں عام لوگوں کی زندگی کا ذکر اپنی کتاب 'ترکش لیٹرز' (Sickle Moon Books, 2001) میں کرتا ہے۔ وہ لکھتے ہیں:

''ترک لوگ اس قدر سادہ اور کفایت شعار ہیں کہ اگر ان کے پاس روٹی، نمک، تھوڑا سا لہسن یا پیاز اور ایک طرح کا کھٹا دودھ ہو جسے وہ یوغورت کہتے ہیں، تو وہ کسی اور چیز کی خواہش نہیں کرتے۔ ان کی رسمی دعوتیں بھی عموماً کیک، بن اور دیگر میٹھی اشیاء تک محدود رہتی ہیں اور کئی طرح کے چاول کے پکوان کے ساتھ بھیڑ کا گوشت یا مرغی شامل کی جاتی ہے۔ لیکن ایک مشروب ایسا ہے جسے بیان کرنا ضروری معلوم ہوتا ہے۔' یہ مشروب 'عرب شربت' تھا، جو کشمش پیس کر دو دن تک خمیر اٹھا کر تیار کیا جاتا اور پھر برف کے ساتھ نوش کیا جاتا تھا۔ سفیر کے مطابق اس کا اثر سر اور پاؤں پر شراب جیسا ہوتا تھا۔ سب سے اہم بات یہ تھی کہ یہ شریعت کے دائرے میں آتا تھا۔''

مغربی یورپ کے لوگ ترکوں کی شہوت پرستی اور عیاشی کی کہانیاں بنا کر پیش کرتے، خاص طور پر ان کے ہم جنس پرستی کے رواج پر حیران ہوتے اور حرم کی کہانیوں سے شاید حسد بھی محسوس کرتے۔ وینس نے اپنے لڑکوں کو چودہ سال کی عمر تک قسطنطنیہ بھیجنے سے منع کر دیا تھا کہ کہیں وہ 'ترک بیماری' میں مبتلا نہ ہو جائیں۔ کہا جاتا ہے کہ سلطان محمد ثانی نے 'ڈراؤلا' کی بنیاد بننے والے ولاد کے بھائی رادو کو پہلے اپنا معشوق بنایا، پھر اسے ولاچیا کا شہزادہ مقرر کر دیا۔ فلپ مینزل اپنی کتاب 'قسطنطنیہ، شہرِ آرزو 1453-1924' (جان مرے، 1995) میں دلچسپ نکتہ پیش کرتے ہیں کہ جہاں وینس کے لوگ قسطنطنیہ میں بڑی تعداد میں آباد ہو گئے تھے، وہاں کوئی عثمانی مسلمان کبھی وینس میں آباد نہیں ہوا۔ وہ یہ بھی بتاتے ہیں کہ اٹھارہویں صدی کے آخر میں برطانوی سفارت خانے کے قریب سب سے مشہور طوائف خانہ قائم تھا۔

اسی عرصے میں یورپ کے ذہن میں ترک کی ایک عجیب اور خوفناک تصویر بن گئی تھی۔ ایک فاسق اور بدکردار ''ساراسن-ترک مسلمان''، جس کا حرم، خواجہ سرا اور مشرقی رقص اس کی فوجی طاقت کے ساتھ مغرب کے دماغ پر سوار تھا۔ ایڈورڈ سعید اپنی کتاب ''اورینٹل ازم'' (پینتھیون، نیویارک، 1978) میں اس ذہنی کیفیت کو یوں بیان کرتے ہیں کہ ''یہ اتفاق نہیں ہے کہ اسلام دہشت، بربادی اور وحشیوں کے انبوہ کی علامت بن گیا۔ یورپ کے لیے اسلام ایک دائمی صدمہ تھا۔ سترہویں صدی کے اختتام تک 'عثمانی خطرہ' یورپ کے ساتھ وابستہ رہا اور عیسائی تہذیب کے لیے مستقل خطرہ بن گیا۔ وقت کے ساتھ یورپی تہذیب نے اس خطرے اور اس سے منسلک محبت، عظیم واقعات، کردار، فضائل اور برائیوں کو اپنی تہذیب کے تانے بانے میں شامل کرلیا۔''

جیسا کہ سیموئل چیو اپنی مشہور کتاب 'دی کریسنٹ اینڈ دی روز' میں بیان کرتے ہیں، صرف نشاۃ ثانیہ کے دور کے انگلینڈ میں ہی ایک اوسط درجے کے تعلیم یافتہ اور باشعور شخص کو عثمانی اسلام کی تاریخ اور یورپ پر اس کے حملوں کے کئی تفصیلی واقعات نہ صرف معلوم تھے بلکہ وہ لندن کے اسٹیج پر بھی یہ مناظر دیکھ سکتا تھا۔ اس سے ثابت ہوتا ہے کہ یورپ میں اسلام کے بارے میں جو کچھ جانا اور سمجھا جاتا رہا، وہ ان عظیم اور خطرناک قوتوں کی ایک محدود جھلک تھی، جن کی نمائندگی اسلام یورپ کے ذہن میں کرتا آیا تھا۔

سلیم کا سب سے بڑا اعزاز 'خادم الحرمین' کا لقب تھا، جو اس کے جانشینوں نے بھی برقرار رکھا، اگرچہ بیسویں صدی میں برطانوی اثر ورسوخ کی وجہ سے یہ غیر اہم ہوگیا۔ اس دور میں نہ اسلام میں اس کا کوئی ہمسر تھا اور نہ عیسائی دنیا میں۔ ہندوستان میں مغل سلطنت کی عظمت صرف ایک دہائی بعد پروان چڑھنے لگی تھی۔ مراکش کو اسپین سے نکال دیا گیا تھا اور ایرانی اپنی سرزمین میں محدود تھے۔ تمام عظیم شہر دمشق، بغداد، قاہرہ اور تین مقدس شہر (یروشلم، مکہ اور مدینہ) عثمانی سلطنت کا حصہ بن چکے تھے۔ سلطان 'زمین پر خدا کا سایہ' ظل اللہ فی الارض (Zill Allah Fi Al-Ard) کہلایا جاتا تھا۔ یہ ایک ایسا دعویٰ تھا جس پر روایتی علماء نے اعتراض تو کیا لیکن وہ اس کے خلاف کچھ کر نہیں پائے۔

جیسا کہ بوسبیک اپنے خطوط میں بیان کرتے ہیں، سلیمان عالیشان (66-1520) کی تین بڑی

خواہشات تھیں: اپنی عظیم مسجد کی تکمیل، قسطنطنیہ میں پانی کی فراہمی کو بہتر بنانے کے لیے رومی آبی گزرگاہوں کی بحالی، اور ویانا کی فتح۔ بوسبیک اس گھبراہٹ کو بھی بیان کرتا ہے جو یورپ کو اس ''خدا کے قہر'' کی ایک اور نشانی کے طور پر محسوس ہوتی تھی، جیسی قدیم زمانے میں اتیلا کی یلغار اور حالیہ دنوں میں تیمور کے حملے کی صورت میں دیکھی گئی:

> ''سلیمان اپنی اور اپنے آباؤ اجداد کی شاندار فتوحات سے متاثر ہو کر خوف کے ساتھ ہمارے سامنے کھڑا ہے۔ وہ دو لاکھ گھڑسواروں کے ساتھ ہنگری کے میدانوں پر چھا جاتا ہے، آسٹریا کو دھمکیاں دیتا ہے اور جرمنی کے باقی علاقوں کو خطرے میں ڈال دیتا ہے۔ اس کے ہمراہ ان تمام قوموں کے لشکر ہیں جو یہاں سے لے کر ایران کی سرحد تک آباد ہیں۔ وہ بجلی کی طرح اپنے راستے میں آنے والی ہر چیز کو تباہ کر دیتا ہے۔ وہ تجربہ کار اور تربیت یافتہ لشکر کا سردار ہے، جس کی قیادت کے یہ سپاہی عادی ہو چکے ہیں۔ اس کے نام کا خوف دور دور تک پھیلا ہوا ہے۔ وہ ہماری سرحدوں پر شیر کی طرح دھاڑتا ہے، کبھی یہاں، کبھی وہاں، راستہ بنانے کی کوشش کرتا ہے۔''

سفیر کو البتہ یقین تھا کہ بادشاہ فرڈیننڈ 'اپنی وفادار رعایا' اور مجموعی طور پر 'عیسائیت' کی حفاظت کے لیے پوری طرح ڈٹ جائے گا۔ سلیمان کی سلطنت ہنگری سے یمن اور عراق سے الجزائر تک پھیلی ہوئی تھی۔ 1521 میں بلغراد اور 1522 میں رہوڈز اس کے قبضے میں آ چکے تھے، اور اب اس کی نظریں ویانا پر جمی تھیں۔ سلیمان نے اپنی عظیم مسجد کی تعمیر کا آغاز اس وقت کیا جب شہنشاہ چارلس پنجم نے اس کے سامنے خراج پیش کرنے پر آمادگی ظاہر کی۔ حقیقت یہ ہے کہ سلیمان نے اس اعزاز کو حاصل کرنے کا پورا حق ادا کیا۔

تاہم سلطنت عثمانیہ کے زوال کا 'مرثیہ' اس کی کمزوری سے بہت پہلے ہی لکھا جانے لگا تھا۔ بعض یورپی سفیر جو سمجھ بوجھ میں کمی کو اپنی شدت پسندی سے پورا کرتے تھے، ہر موقع پر جارحانہ رویہ اختیار کرنے کو تیار رہتے۔ 1622 میں انگلینڈ کے سفیر سر تھامس رو نے جو دنیا بھر میں اپنے ملک کی

نمائندگی کر چکے تھے اور ہندوستان میں بھی اپنے وطن کے مفادات کے محافظ تھے، سلطنت عثمانیہ کو بدکرداری کا گڑھ قرار دیا اور کہا کہ اب یہ سلطنت تباہی کے دہانے پر ہے۔ 1639 میں وینس کے سفیر نے وزیر اعظم کو دھمکی دی، جس پر وزیر نے طنزیہ جواب دیا کہ عیسائی دنیا کی مبینہ طاقت محض ایک سراب ہے۔ ترک تو اگلی ایک یا دو صدیوں تک اس بات پر ہنستے رہنے کے قابل تھے۔

آنے والے بحران کی پہلی جھلک 1731 میں ایک نومسلم عیسائی کی زبان سے ظاہر ہوئی۔ 1726 میں ابراہیم متفرقہ نے جو سلطنت کا ایک اعلیٰ عہدیدار تھا، خوشنویسوں کی مخالفت کے باوجود 'کتابت' کی ٹیکنالوجی کے استعمال کی اجازت لینے کے لیے شیخ الاسلام کو قائل کر لیا۔ 1731 میں اس نے محمود اول کے حضور 'سیاست الامم کی عقلی بنیادیں' (Rational Bases for the Politics of Nations) نامی ایک رسالہ پیش کیا۔ اس کا بنیادی سوال یہ تھا کہ جو عیسائی اقوام کبھی کمزور تھیں وہ اب اتنی طاقتور کیسے ہو گئیں کہ کبھی نا قابل شکست سمجھی جانے والی عثمانی افواج کو بھی شکست دے سکیں؟ اس کا حل بعد میں بار بار دہرایا گیا، پہلے تجویز کی صورت میں اور پھر جب سلاطین مزید کمزور ہوتے گئے تو ہدایات کی شکل میں جیسے اصلاحات اور 'جدید' یورپی سیاست و قوانین کی تقلید۔

متفرقہ کی یہ نصیحت ایک ایسے پر آشوب دور میں سامنے آئی جب محمود اول تخت پر ایک عوامی بغاوت کے نتیجے میں بیٹھا تھا۔ اس بغاوت کو علما نے احمد ثالث کی غیر اسلامی فضول خرچی اور مسلم ایران کے خلاف عیسائی روس کے ساتھ کیے گئے معاہدے پر فتویٰ دے کر بھڑکایا تھا۔

قسطنطنیہ کے فاتح، فاتح محمد دوم وہ پہلے شخص تھے جنھوں نے عیسائی دنیا کے پانچویں ستون کے خطرے کو پوری طرح محسوس کیا۔ یہ یورپ کی بڑی طاقتوں کے ساتھ ہاتھ ملا سکتا تھا۔ اس میں سب سے آگے یونانی تھے جو فوری صلیبی جنگ کے لیے سرگرم تھے۔ ہنگری، آسٹریا اور وینس طاقتور ہمسائے تھے، جو صلیبی جنگ کے متحدہ پرچم تلے باآسانی جنگ چھیڑ سکتے تھے۔ جیسا کہ فلپ مینزل لکھتے ہیں کہ ''انیسویں صدی کے ریاستی رہنما جسے 'مشرقی سوال' کہتے تھے (یعنی یورپی طاقتوں کا عثمانی علاقوں پر قبضے کا منصوبہ) اس کی ابتدا 1453 میں ہی ہو چکی تھی۔'' انیسویں صدی میں جب سلطنت عثمانیہ کمزور ہونے لگی تو 'مشرقی سوال' اور بھی شدت اختیار کر گیا۔ اس سے پہلے

کے تین سو برسوں میں اگرچہ عثمانیوں کا جواب ہمیشہ یکساں نہیں ہوتا، لیکن عمومی طور پر کافی ہوتا تھا۔

محمد فاتح کا سب سے پہلا ردعمل اپنے دفاع کو مضبوط کرنا تھا۔ 1455 تک یدی کُلے (سات برج) بحر مرمرہ کے کنارے تعمیر ہو چکے تھے اور بیس سال بعد تک دیواروں کو مزید مضبوط کیا جاتا رہا۔ قسطنطنیہ کے لیے ہمیشہ سب سے مضبوط ہتھیار اس کا دفاع تھا۔

مگر صرف تلوار کافی نہیں تھی۔ اسے ایک ایسی دانشمندانہ پالیسی کی ضرورت تھی جو مسلمانوں، عیسائیوں اور ان کی خلافت کے دور میں فخر سے زندگی گزارنے والے یہودیوں سب کے لیے قابل قبول ہو، عیسائیوں کو خاص اہمیت دی گئی، کیونکہ جغرافیائی سیاست کا یہی تقاضا تھا۔ جب قسطنطنیہ فتح ہوا تو مشرقی چرچ کا کوئی پادری موجود نہ تھا، کیونکہ اس دور میں اس کی روم کے ساتھ صلح کی کوششیں جاری تھیں۔ محمد فاتح نے ایک راہب عالم جارج جینادیوس اسکولاریوس کو تلاش کیا، اسے پادری مقرر کیا اور بازنطینی دور کے چرچ کے تمام حقوق اور مراعات بحال کر دیں۔ اسکولاریوس کی سب سے بڑی خوبی یہ تھی کہ وہ روم کے ساتھ کسی بھی اتحاد کے خلاف تھا۔ 5 جنوری 1454 کو اسے مقدس حواریوں کے چرچ میں باقاعدہ پادری مقرر اور تخت نشین کیا گیا۔ یہ ایک دانشمندانہ فیصلہ تھا۔ اس سے روم کو اس خلا میں اپنا اثر جمانے سے روک دیا گیا جو تیزی سے پھیلتی عثمانی سلطنت کی عیسائی رعایا پر قائم ہوسکتا تھا۔ اس طرح ایک ایسا چرچ دوبارہ زندہ کیا گیا، جو سلطان کے لیے وفاداری، سلطنت کے لیے محصولات، اور روم کے خلاف توازن پیدا کرسکتا تھا۔ محمد نے روم کی طاقت کو ایک 'آرتھوڈوکس چرچ' کے ذریعے روک دیا۔

اس کے ساتھ ساتھ اس نے ایک ہمہ گیر نظام بھی تشکیل دیا، تاکہ ایک اسلامی سلطنت کو محفوظ رکھا جا سکے۔ اس کا سب سے حیرت انگیز نتیجہ ایک ایسے ادارے کی تخلیق تھا جو تقریباً چار سو سال تک سلطنت کی حفاظت کرتا رہا، یہاں تک کہ بالآخر خود ہی ختم ہوگیا۔ یہ مسلم اور عیسائی تعلقات کی سب سے منفرد اور غیر معمولی مثال بھی تھی۔

سلطان عبدالمجید کے الفاظ میں غلامی 'شرمناک اور وحشیانہ' عمل تھا، اگرچہ اس کا یہ کہنا غالباً درست تھا کہ ترکی میں غلاموں کے ساتھ نسبتاً بہتر سلوک کیا جاتا تھا۔ اس نے 1847 میں شہر کی غلام منڈی کو

بند کر دیا، لیکن اس برائی کو مکمل طور پر ختم کرنے کی ہمت نہیں کی۔ وہ منڈی کوئی خوشنما جگہ نہ تھی۔ تاجر چھوٹے بچوں کو بازار میں گھماتے اور ان کی قیمت چلّا چلّا کر بتاتے۔ دانتوں اور جنسی اعضاء کی بے شرمانہ پڑتال، کنواری لڑکیوں کی زیادہ قیمت جیسی تمام کہانیاں سچ تھیں۔ یہ جبری مشقت اور جنسی غلامی تھی۔ نفیس خریدار تو کسی عورت کو گھر لے جا کر یہ تک دیکھتے کہ وہ خراٹے تو نہیں لیتی۔ غلام کہیں پولینڈ جیسے قریب علاقوں سے لائے جاتے اور کہیں سوڈان جیسے دور دراز خطوں سے (جیسا کہ پشکن کے آباؤ اجداد کا تعلق قسطنطنیہ میں خریدے گئے ایک سیاہ فام غلام سے تھا)۔

ظاہری طور پر غلام اپنے لیے آزادی خرید سکتے تھے، لیکن حقیقت میں یہ محض ایک خوش فہمی تھی۔ غلامی کا یہ عالمگیر رواج محض ایک روایت تھی جس کا حقیقی معنی میں کوئی جواز نہیں تھا۔ مفتوحہ مسلم آبادیوں کو بھی اسی انجام کا سامنا کرنا پڑتا، بلکہ بعض اوقات ان کا انجام اس سے بھی زیادہ ہولناک ہوتا تھا، اگر یہ مانا جائے کہ موت غلامی سے زیادہ تکلیف دہ ہے۔ شکست کے ان بھیانک نتائج نے یقیناً فتح کی جستجو کو مزید شدید کر دیا ہوگا۔ جنگ کے زمانے میں غلام بنانا ہمیشہ سے مال غنیمت کا حصہ سمجھا جاتا تھا۔ یہ خوش آئند بات رہی کہ غلامی کا یہ سلسلہ جنگوں کا سلسلہ ختم ہونے سے کہیں پہلے ہی دم توڑ گیا۔

البتہ ایک راستہ ایسا بھی تھا جو بعض اوقات اسلامی تاریخ میں حیران کن نتائج پیدا کر دیتا تھا، جیسے ہندوستان کی 'غلام خاندان' کی سلطنتیں یا مصر کے مملوک۔ اسلام قبول کرنے سے غلامی سے نکلنے کا موقع مل جاتا تھا، اور کبھی کبھار مساوی مواقع بھی فراہم ہوتے، اگرچہ مکمل مساوات ہمیشہ ممکن نہیں ہوتی تھی۔ (جیسا کہ پہلے ذکر کیا گیا، ابراہیم متفرّقہ نے بھی اسلام قبول کر کے غلامی سے نجات حاصل کی تھی)۔ نئے مسلمان جو مضبوط سماجی رشتوں یا فوجی مزاج رکھنے والے گروہوں سے تعلق رکھتے تھے، کبھی کبھار زوال پذیر سلطنتوں پر قبضہ کرنے کا موقع بھی پا لیتے تھے۔ جیسا کہ اکثر مسلم سلطنتوں کی روایت تھی، عثمانی خاندان نے طبقاتی امتیازات کی زیادہ پروا نہیں کی۔ غلاموں کو محل کے حساس ترین عہدوں پر فائز کیا جاتا اور انہیں درحقیقت زندگی اور موت کا مالک بنا دیا جاتا۔ پہلے سلاطین کے بستروں کے چاروں کونوں پر چار غلام پہرہ دیتے تھے۔

محمد فاتح نے غلامی کے رواج کو ایک تخلیقی رخ دیا۔اس نے غلاموں کو سلطنت کے محافظوں میں بدل دیا۔اس نے 'ینی چری' یا 'نئے سپاہیوں' کا ادارہ قائم کیا۔ترک زبان میں 'ینی چری' کا معنی ہی 'نئی فوج' ہے۔ان کے بھرتی کے عمل کو 'دوشیرمے' یا 'جمع کرنا' کہا جاتا تھا،اور یہ واقعی لڑکوں کو جمع کرنے ہی کا عمل تھا۔ایک فرمان جاری ہوتا اور عہدیدار بوسنیا جیسے عیسائی علاقوں میں جا کر آٹھ سے سولہ برس کے عیسائی لڑکوں کو چن لیتے (کبھی ترک لڑکوں کو نہیں چنا جاتا تھا)۔انہیں قسطنطنیہ لایا جاتا،ان کا ختنہ کیا جاتا اور انہیں اسلام قبول کرایا جاتا۔اس کے بعد ان کے نسب اور قابلیت کے مطابق فیصلہ کیا جاتا تھا۔بہترین لڑکوں کو محل کے مدرسے یا کسی پاشا کے گھرانے میں بھیجا جاتا،اور پھر درجہ بدرجہ کچھ لڑکوں کو کھیتوں تک بھیج دیا جاتا تھا۔

چند منتخب لڑکوں کو خاص تربیت دی جاتی تھی،تاکہ وہ ینی چری بن سکیں۔یہ محل کی اشرافیہ محافظ فورس تھی،جو سلطنت کے لیے ہراول دستہ بھی بن گئی۔یہ سات برجوں کی حفاظت کرتی،فصیلوں پر گشت لگاتی اور شہر میں قانون و نظم برقرار رکھتی تھی۔خاندان سے محروم ان نوجوانوں نے اپنی وفاداری سلطان سے بھی بڑھ کر ریاست کو پیش کر دی۔اس کے بدلے ریاست نے انہیں طاقت اور آرام و آسائش دی (محافظ دستے کے ہر یونٹ کا سربراہ اپنی پٹکے میں سوپ کا چمچ لگائے رکھتا تھا)۔ان کی بیرکیں سلیمانیہ مسجد اور گولڈن ہارن کے درمیان تھیں،جبکہ ان کے آغا کا محل شاندار تھا۔ہر تیسرے مہینے منگل کے دن تنخواہ دی جاتی تھی۔سلطان جو خود بھی ینی چری کے 61ویں یونٹ کا رکن شمار ہوتا تھا،اپنی چھوٹی چمڑے کی تھیلی وصول کرتا،مگر وہ سمجھدار تھا کہ وہ تھیلی واپس کر دیتا اور اس کے ساتھ کمانڈر کو ایک بڑا انعام بھی پیش کر دیتا۔جب بھی سلطان بیرکوں کا دورہ کرتا تو شربت پیتا اور خالی پیالہ سونے کے سکوں سے بھر کر لوٹا دیتا۔رمضان کے مہینے میں حرم سے باقلوا بھی آتا تھا۔

سرکاری اعلانات میں ینی چری کی مسلسل تعریف اور خوشامد کی جاتی۔ظاہر ہے یہ تعریف بعض اوقات ان کے سروں پر سوار بھی ہو جاتی تھی۔بیرک کے غصے کی علامت الٹا ہوا پلاؤ کا دیگچہ ہوا کرتا تھا۔ایک بھوکا ینی چری ہمیشہ خطرناک خبر ہوتا تھا۔حتیٰ کہ سلیم دوم کو بھی مشکلات پیش آئیں،جب اس نے انہیں ان کا روایتی بونس نہیں دیا۔مگر یہ سب کچھ ان کی اصل طاقت کا صرف ایک حصہ تھا۔ان کی

قوت اتنی بڑھ گئی کہ انہوں نے سلیمان کو ویانا کے محاصرے (جو اس کا شاندار خواب تھا) سے پیچھے ہٹنے پر مجبور کر دیا اور فارس پر حملہ روکنے پر بھی آمادہ کر لیا۔ 1622 میں وہ عثمان دوم کے ساتھ بھی وہی کر چکے تھے جو ہم جانتے ہیں۔ مراد چہارم کے ساتھ ان کا جھگڑا جاری رہا اور محمود دوم کی اصلاحات کے خلاف بھی بغاوت کر دی۔ یہ اصلاحات دراصل یورپی طرز پر فوج کی تنظیم نو کی کوشش تھیں، جو ان 'قدیم روایات' کو چھوڑنے کے مترادف تھیں۔ محمود نے ایک فتویٰ حاصل کیا جس میں کہا گیا کہ نئی فوجی مشقیں اور یونیفارم عیسائی نہیں بلکہ 'نو مسلم' ہیں۔ صدر اعظم نے بھی یہ وضاحت کی کہ یہ مشقیں قرآن کی تعلیمات کے مطابق ہیں اور علما کی تائید بھی حاصل ہے۔ لیکن جب 11 جون 1826 کو چار تربیت کاروں نے یورپی طرز کی مشقیں شروع کیں تو ہنگامہ برپا ہو گیا۔ 13 جون کو 20 ہزار ینی چری سپاہی سڑکوں پر نکل آئے اور توپ کاپی محل پر حملہ کر دیا۔ وہ نعرے لگا رہے تھے کہ وہ کافروں کے طریقے نہیں اپنائیں گے اور محمدؐ اور اپنے مربی درویش حاجی بکتاش کے نام پر پرانی روایات کو برقرار رکھنے کا مطالبہ کر رہے تھے۔ محمود پر الزام لگایا گیا کہ وہ عیسائی بننا چاہتا ہے، اور یونانیوں نے یہ افواہ خوشی خوشی پھیلائی کہ آیا صوفیہ پر قسطنطین کا صلیب نظر آیا ہے۔ محمود نے توپ خانہ میدان میں اتار دیا۔ 17 جون کو ینی چری کا مکمل خاتمہ کر دیا گیا، چھ ہزار کو موت کے گھاٹ اتار دیا گیا اور پانچ ہزار کو جلاوطن کر دیا گیا۔ یہ اتفاق تھا یا نہیں، لیکن اس کے بعد عثمانی سلطنت کی قسمت کا زوال حتمی ہو گیا۔ مغرب نے وہ سب کچھ دوبارہ حاصل کرنا شروع کر دیا جو مسلم طاقت نے صدیوں تک اس سے چھین لیا تھا۔

انیسویں صدی مسلمانوں کے لیے ایک ہزیمت بھری صدی ثابت ہوئی۔ 1808 ہی میں سربوں کو بغاوت کے لیے اکسایا گیا اور 1830 تک ایک سربیا کی آزاد ریاست قائم ہو چکی تھی۔ 1821 میں یونان نے بھی آزادی کا علم بلند کیا۔ یونانی عوام پر بائرن کی شاعری کا جادو ایسا چھایا کہ وہ سلطنت عثمانیہ کی غلامی سے نجات حاصل کرنے کا خواب دیکھنے لگے اور پوری شدت کے ساتھ آزادی کا مطالبہ کرنے لگے۔ 1833 میں یونان آزاد ہو گیا۔ قفقاز میں روس نے ترک اثر و رسوخ والے علاقوں میں اپنے قدم جما لیے۔ 1839 میں برطانیہ نے عدن پر قبضہ کر کے اپنے ہندوستانی بحری راستوں پر کنٹرول کو مضبوط کیا۔ عدن وہ مرکز بنا جہاں سے برطانیہ نے عرب جزیرہ نما میں اپنی

کارروائیاں شروع کیں، اور بالآخر امارات خلیج (ابوظہبی، دبئی، شارجہ) کے ساتھ معاہدے کیے۔ جب آپ کمزور ہوتے ہیں تو ہر طرف سے آپ کے وجود پر حملے ہونے لگتے ہیں۔ فرانس نے الجزائر پر قبضہ کرلیا۔ برطانیہ کے ہندوستانی تجربے کے برعکس، یہاں فرانس نے پہلے دارالحکومت پر قبضہ کیا، ملک پر بعد میں۔ فرانس کو جہاد کا سامنا اس وقت کرنا پڑا جب عبدالقادر (83–1808) نے علماء دین اور دیہاتیوں کی حمایت سے فرانسیسی قبضے کے خلاف جہاد کا علم بلند کیا۔ اگرچہ وہ بالآخر شکست کھا گیا اور 1847 میں دمشق جلا وطن کر دیا گیا، مگر وہیں وہ فرانسیسی باشندوں کے ساتھ خوشگوار تعلقات قائم رکھے اور بالآخر وہیں اس کی موت واقع ہوئی۔

1860 میں لبنان میں خانہ جنگی بھڑک اٹھی، اور دمشق میں عیسائیوں پر حملے کے بعد یورپی طاقتیں مداخلت کے لیے میدان میں آگئیں۔ مسلمانوں، دروز اور عیسائیوں کے درمیان طے پانے والے معاہدے کے نتیجے میں لبنان کے لیے ایک خصوصی نظام قائم کیا گیا۔ اسی عشرے میں تیونس کو بھی وہی تجربہ سہنا پڑا جسے آج کل عالمی بینک کا نسخہ کہا جاتا ہے۔ غیر ملکی قرضے بڑھنے لگے تو 1869 میں ایک بین الاقوامی مالیاتی کمیشن بنایا گیا، جس کا مقصد مالیاتی اصلاحات، امن وامان کی بحالی اور تعلیم میں سرمایہ کاری تھا۔ 1881 میں فرانس نے تیونس پر قبضہ کرلیا۔ مقاصد سب پر عیاں تھے، یعنی مالی استحکام، سرحدوں کا تحفظ اور اٹلی کو تیونس کی 'فلاح وبہبود' کے نام پر زیادہ سرگرم ہونے سے روکنا۔

ادھر ماسکو بھی دیگر مقامات پر اپنا دائرہ بڑھا رہا تھا۔ یورپی طاقتوں کی باہمی رسہ کشی کی وجہ سے ترکی مکمل تباہی سے بچ گیا۔ پیٹر اعظم کا خواب تھا کہ قسطنطنیہ کو دوبارہ عیسائیت کے لیے حاصل کرے، اور زار الیگزینڈر اول نے شہر کو 'اپنے گھر کی چابی' قرار دیا تھا۔ 1853 میں نکولس اول نے سینٹ پیٹرزبرگ میں برطانوی سفیر سے وہ جملہ کہا جو آنے والی پوری صدی میں گونجتا رہا: ''ہمارے ہاتھ میں ایک بیمار آدمی ہے، ایک بہت بیمار آدمی۔'' وہ ترکی کا حوالہ دے رہا تھا اور چاہتا تھا کہ یورپی طاقتیں آپس میں معاہدہ کر کے سلطنت عثمانیہ کو تقسیم کرلیں اور قسطنطنیہ کو ایک آزاد شہر قرار دیں۔ روسی توہینوں سے ترکی کے مدارس (اپنے وقت کے طالبان) کے طلبہ سڑکوں پر نکل آئے، اور عبدالمجید نے 4 اکتوبر 1853 کو روس کے خلاف جنگ کا فتویٰ حاصل کرلیا۔ لیکن یہ ایک ایسی جنگ تھی جسے

عثمانی خاندان تنہا نہیں لڑ سکتا تھا۔ برطانیہ اور فرانس جو اس خطے کو اپنے مستقبل کے انعام کے طور پر دیکھ رہے تھے، ترکی کے ساتھ مل گئے اور یوں وہ جنگ برپا ہوئی جسے کرائمیا کی جنگ کے نام سے جانا جاتا ہے۔ 1856 تک اس اتحاد نے روس کو شکست دے دی اور عبدالمجید نے توپ کاپی محل کو چھوڑ کر ایک نیا محل بنالیا۔

تاہم، انگلینڈ اور فرانس کی صف میں جگہ پانے کی ایک قیمت بھی تھی۔ 1856 میں پہلی بار 1453 کے بعد قسطنطنیہ میں شاہی فرمان کے تحت چرچ کی گھنٹیاں بجانے کی اجازت دی گئی۔ کئی مسلمانوں کے لیے یہ دن سوگ کا دن بن گیا۔ 1877 تک بلغاریہ کو خود مختاری مل چکی تھی، جبکہ کریٹ کو 1898 میں ایسی ہی مراعات حاصل ہو گئیں (اور 1913 میں وہ یونان کا حصہ بن گیا)۔ قسطنطنیہ کی کمزوری اب دل تک اتر چکی تھی۔ اس پر بیرونی قرضوں کا بھاری بوجھ تھا اور اس کی آمدنی پر قرض دہندگان کی سخت نگرانی تھی۔ بلقان کی جنگوں کے دوران جب بلغاریہ کی فوج قسطنطنیہ کی فصیلوں تک جا پہنچی تو دنیا بھر کے مسلمانوں کے دل دہل گئے۔

اس وقت دنیا کی سب سے بڑی مسلم آبادی سلطنت عثمانیہ میں نہیں، بلکہ برطانوی سلطنت کے تحت ہندوستان میں آچکی تھی۔ اپنے خلیفہ کی بے بسی دیکھ کر ہندوستانی مسلمانوں نے ڈاکٹر ایم اے انصاری کی قیادت میں بلقان کی جنگوں کے دوران ترکی کے لیے ایک طبی مشن روانہ کیا۔ 1912 کا یہ مشن وہ لہر بن گیا جو صرف دس سال میں طوفان کی شکل اختیار کر گیا۔

دس سال بعد 1922 میں وہی خلافت جس نے ہندوستانی مسلمانوں کے دلوں کو گرمایا تھا، دم توڑنے لگی۔ 10 نومبر 1922 کو محمد فاتح اور سلیمان عالیشان کے وارثین کو شاید سب سے زیادہ ذلت آمیز منظر دیکھنا پڑا۔ شاہی بینڈ نے ان کا ساتھ چھوڑ دیا۔ 16 نومبر کو خلیفۃ المسلمین اور سلطان ترکی محمد واحدالدین نے برطانوی فوج کے کمانڈر جنرل سر چارلس (ٹم) ہیرنگٹن کو خط لکھا:

> ''محترم، میری زندگی استنبول میں خطرے میں ہے۔ میں برطانوی حکومت کی پناہ چاہتا ہوں اور درخواست کرتا ہوں کہ جلد از جلد استنبول سے کسی اور جگہ منتقل کر دیا جائے۔''

17 نومبر کی صبح 8 بجے آخری خلیفہ محمد ششم اپنے بیٹے ارتغرل، اپنے خادم اور بینڈ ماسٹر کے ساتھ (جو بینڈ کے برعکس ان کے ساتھ ہی رہا) اور برطانوی گرینیڈیئر گارڈز کی حفاظت میں اور جانے کے دروازے سے سردیوں کے طوفان میں محل سے روانہ ہوا۔ برطانوی فوج نے اسے ایک لانچ تک پہنچایا، جہاں وہ ملایا سے جہاز پر سوار ہو کر مالٹا روانہ ہو گیا۔ وہ 1926 میں سان ریمو میں وفات پا گیا۔ قرض دہندگان نے اس کی میت کو دو ہفتے تک دفن نہیں ہونے دیا۔

اس کے بعد ایک اور خلیفہ باقی تھا مگر سلطان نہیں تھا۔ کمال اتاترک اس وقت تک خود کو اتنا طاقتور نہیں سمجھتا تھا کہ خلافت کو ختم کر سکے۔ عبدالمجید دوم محض ایک رسمی علامت کے طور پر 1924 تک خلیفہ رہا۔ 3 مارچ 1924 کو خلافت کو ختم کر دیا گیا۔ خلیفہ کو حکم دیا گیا کہ وہ صبح سویرے روانہ ہونے کے لیے سامان باندھ لے۔ وہ صبح ساڑھے پانچ بجے روانہ ہوا اور گیارہ بجے چتلجا ریلوے اسٹیشن پہنچا۔ اس اسٹیشن پر واحد شخص جس نے ہمدردی کا اظہار کیا وہ اسٹیشن ماسٹر تھا، جو ایک یہودی تھا۔ اس نے عثمانی خاندان کا شکریہ ادا کیا کہ انہوں نے ان یہودیوں کی جان بچائی تھی جنہیں اسپین سے نکال دیا گیا تھا۔ آدھی رات کو اورینٹ ایکسپریس پہنچ گئی۔ خلیفہ کو سوئٹزرلینڈ کا ویزا اور دو ہزار پاؤنڈ دیے گئے، تاکہ وہ دنیا میں اپنا راستہ بنا سکے۔ تقریباً 469 برس تک عثمانی خاندان نے دنیا کے توازن کو سنبھالا اور اسلام کی تقدیر کو سنوارا۔ اب ان کا جوش وجذبہ صرف ہندوستان میں باقی رہ گیا تھا۔

انیسویں صدی مسلمانوں کی ایک اور عظیم سلطنت ہندوستان کی مغل سلطنت کے لیے بھی تباہ کن ثابت ہوئی۔ اکبر، جہانگیر اور شاہ جہاں کے عہدِ عروج میں مغلوں کو یہ زعم تھا کہ وہ خود کو عثمانیوں سے برتر سمجھتے ہیں، جبکہ قسطنطنیہ کے ترک اس دعوے کو محض ایک گستاخانہ دعویٰ قرار دیتے تھے۔ ایک طویل صدی کے زوال کے بعد 1857 میں برطانیہ نے ایک ایسی جنگ چھیڑ دی، جس نے نہ صرف مغل سلطنت کو دفن کر دیا بلکہ خود ہندوستان اور برطانیہ دونوں کو بھی بدل کر رکھ دیا۔ مغل سلطنت کا اختتام خاموشی کے ساتھ تو ہوا، مگر وہ محبتوں سے خالی ہرگز نہیں تھا۔

# 8

# برصغیر میں جہاد: دہلی پر اسلامی ہلال

'تم پانی پر چلتے ہو؟' لوگوں نے صوفی ابو یزید بسطامی سے حیرت سے پوچھا۔
انہوں نے سکون سے جواب دیا کہ 'پانی پر تو ایک معمولی لکڑی کا ٹکڑا بھی تیرتا ہے۔'
پھر لوگوں نے کہا، 'تم ہوا میں اُڑتے ہو!'
ابو یزید مسکرا کر بولے کہ 'ہوا میں تو ایک پرندہ بھی اُڑتا ہے۔'
'تم ایک ہی رات میں کعبہ تک پہنچ جاتے ہو!'
ابو یزید نے فرمایا کہ 'کوئی جادوگر بھی ایک ہی رات میں ہندوستان سے دماوند تک کا سفر طے کر لیتا ہے۔'
لوگوں نے آخرکار پوچھا کہ 'پھر سچے آدمی کا اصل کام کیا ہے؟'
انہوں نے کہا کہ 'سچا آدمی اپنے دل کو اللہ کے سوا کسی سے وابستہ نہیں کرتا۔'
(ماخذ: 'مسلم سینٹس اینڈ مسٹکس' (Muslim Saints and Mystics) از فرید الدین عطار)

اندلس کے مسلمان کا آخری آہ بھرنا مسلمانوں کی آخری آہ نہیں تھی۔ اسپین نے عربوں سے اپنا بدلہ لے لیا اور پھر جو علاقے دوبارہ حاصل کیے تھے ان کی حفاظت کے لیے اگر ضرورت پڑی تو سفاکی سے بھی دریغ نہ کیا۔ انکووزیشن نے تمام مسلمانوں اور یہودیوں کو کیتھولک سلطنت سے باہر نکال دیا۔ جو باقی رہ گئے، انہوں نے عیسائیت قبول کر لی۔ ان کے پاس کوئی دوسرا راستہ نہیں تھا۔ اسپین

کے یہودیوں نے سلطنت عثمانیہ میں پناہ لی اور خلافت کے زیر سایہ نسبتاً پرامن زندگی گزاری۔ مسلمان شمالی افریقہ میں دوبارہ بس گئے، مگر صرف یادیں ہی ان کا سہارا بنیں، کیونکہ مسلم افریقہ میں اب یورپ کے خلاف دوبارہ لڑنے کی طاقت نہیں رہی تھی۔

البتہ ایک اور براعظم ایشیا اور خاص طور پر برصغیر ہند اور بحر ہند تھا، جہاں اسلام کی قوموں اور عیسائی یورپ کے درمیان اگلا مرحلہ شروع ہونا تھا۔

دوسرے ملینیم کے آغاز میں مسلم طاقتیں ہندوستان کے دل تک جا پہنچی تھیں۔ اسی ملینیم کے وسط میں عیسائی قومیں اس چیلنج کو قبول کرنے کے لیے میدان میں اتر آئیں۔ زبان وہی تھی، مقدس جنگ کی زبان۔

سمندر پر پرتگالی اپنی کرافیلز اور ناؤز کے ساتھ پوپ کی منظوری سے موریوں کے خلاف جنگ کا آغاز کر چکے تھے۔ ساتھ ہی وہ بحر ہند کے مغربی اور مشرقی ساحلوں سے مصالحہ جات اکٹھے کر کے (یا لوٹ کر) یورپ میں زبردست منافع کما رہے تھے۔ اگرچہ یہ تباہی شدید تھی مگر اصل اور بڑے معرکے خشکی پر ہی طے پاتے۔ برطانوی پرتگالیوں کی طرح شدید مذہبی جوش سے تو نہیں، لیکن بہتر وقت کے انتخاب کے ساتھ پہلے مسلم حکومت کو ہٹاتے اور پھر اسے ختم کر کے ہندوستان کی مالا مال سرزمین پر قابض ہو جاتے۔ ہمالیہ اور پامیر کے پار طاقتور روس مشرق کی خالی زمینوں پر اپنی گرفت مضبوط کر رہا تھا اور وسطی ایشیا کی کمزور مگر ضدی مسلم قوموں کو زیر کر رہا تھا۔

مسلمانوں کی سلطنتوں اور ریاستوں کو تباہ کرنے کے بعد کلکتہ اور سینٹ پیٹرزبرگ کے درمیان وہ واحد خودمختار مسلم ملک 'افغانستان' ایک نیا میدانِ کارزار بن گیا، جسے دنیا 'گریٹ گیم' کے نام سے جانتی ہے۔ دو عظیم عیسائی طاقتوں کے درمیان یہ سانپ سیڑھی کا کھیل ایک اسلامی تختے پر کھیلا جا رہا تھا۔ افغانستان اس خطے کی جغرافیائی سیاست میں کبھی 'دروازہ' تو کبھی 'آڑ' بن جاتا تھا۔ دہلی پر حملہ کرنے کی روایتی راہ ہمیشہ خیبر پاس سے گزرتی تھی۔ دہلی کابل کے بغیر ہمیشہ کمزور رہتا تھا۔ انگریز اس حقیقت کو اچھی طرح جانتے تھے، اگرچہ وہ واحد غیر ملکی طاقت تھی جو دہلی تک مشرق کی سمت سے پہنچی۔

مقامی عقیدے کے مطابق ہندوستان آنے والا پہلا عیسائی یسوع مسیح کا حواری سینٹ تھامس تھا، جو اپنے شکوک وشبہات کے لیے مشہور تھا۔ مسلمان بحری راستوں سے گجرات سے لے کر کیرالہ تک

کے مغربی بندرگاہوں پر ان علاقوں میں کئی سو سال پہلے آ گئے تھے جب کہ کوئی مسلم فوج ہندوستان کے قلب میں داخل نہیں ہوئی تھی۔ پہلی مسلم فوجیں گیارہویں صدی میں وسطی ہندوستان کی دولت کی تلاش میں آئیں، اور بارہویں صدی میں یہاں سلطنت کا خواب لیے داخل ہوئیں۔ سب سے پہلے یورپی جہاز جو صلیبی جنگ کی توپوں سے لیس تھے، پرتگال سے آئے۔ پرتگال نے گووا پر تو قبضہ کر لیا لیکن اس کے بعد کوئی بڑا قدم نہ اٹھا سکا کیونکہ ایک اور مسلم سلطنت مغل نے ہندوستان کی تاریخ میں ایک نئی داستان رقم کر دی۔ وہ پہلی عیسائی طاقت جس نے ہندوستان میں مکمل سلطنت قائم کی برطانیہ تھی، جس نے مغل سلطنت کا خاتمہ کیا اور جدید ہندوستان کی تشکیل کی۔

ہندوستان کے قلب میں مسلم فتوحات کی کہانی شاید ایک غلط فہمی سے شروع ہوئی۔ کبھی کسی کی زبان کا تلفظ دوسرے کے لیے زہر بن جاتا ہے۔ قبل از اسلام مکہ کی تین سب سے زیادہ معزز مشرکانہ دیویاں اللات، العزیٰ اور منات تھیں، جنہیں قرآن نے جھوٹے معبود قرار دیا اور ان کے حوالے سے مبینہ 'شیطانی آیات' کا قصہ بھی معروف ہے۔ ایک قدیم عقیدے کے مطابق جب حضور اکرم ﷺ نے خانہ کعبہ کے بت توڑے تو منات کا بت غائب تھا۔ اسے چھپا کر ایک تجارتی جہاز کے ذریعے ہندوستان کے بندرگاہی قصبے 'پربھاس' بھیج دیا گیا، جہاں عرب گھوڑے درآمد ہوتے تھے۔ اس عقیدے کے مطابق بت پرستوں نے وہاں منات کا مندر بنایا اور اس جگہ کو سو-منات یا سومنات کا نام دیا۔ افغان شہر غزنی سے اپنی سلطنت کی بنیاد رکھنے والے جنگجو بادشاہ محمود نے ہندوستان کے قلب میں پہلی جنگ چھیڑی۔ اس کا سب سے مشہور حملہ وہی تھا جس میں اس نے سومناتھ کے مندر کو توڑا اور اتنا خزانہ لوٹ کر لے گیا کہ اپنی لالچ کی آگ کو بجھا سکے۔

اس مہم کے دوران ایک عظیم علمی شخصیت بھی محمود غزنوی کے ہمراہ تھی۔ اک مورخ، ماہر عمرانیات، ماہر نجوم، ماہر فلکیات، ماہر لسانیات اور سائنس دان، جس نے اقلیدس (Euclid) کی تصنیف کا سنسکرت میں ترجمہ کیا اور ہندوستانیوں کے لیے اسطرلاب پر ایک اہم رسالہ تحریر کیا۔ ابوریحان البیرونی(An Account:Al Biruni's India ترجمہ ای۔ ساچاؤ، دہلی، چند، 1964) نے 1026 میں سومناتھ کی تباہی کا ذکر تو کیا ہے، مگر اس دلچسپ اور دعوے سے بھرپور قصے کا کوئی

ذکر نہیں کیا جس میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی زندگی اور ہندوستان کے ایک مندر کے درمیان مبینہ تعلق جوڑا جاتا ہے۔ البیرونی لکھتے ہیں کہ سومناتھ میں ایک جواہرات سے مزین پتھر کے بت کی پوجا کی جاتی تھی۔ منات کے حامی اس بات کو ایک اور ثبوت کے طور پر پیش کرتے تھے۔ اللات انسانی شکل میں ظاہر کی جاتی تھی، العزیٰ ایک مقدس درخت میں نمایاں ہوتی تھی، جبکہ منات پتھر کے مجسمے کی شکل میں پوجی جاتی تھی۔

ہندوستان کی معروف مورخ روملا تھاپر اس بارے میں کہتی ہیں:

'سومناتھ کے بت کو منات کے ساتھ جوڑنے کی کوئی تاریخی حیثیت نہیں ہے۔ اس بات کا کوئی ثبوت موجود نہیں ہے کہ مندر میں منات کی مورتی رکھی گئی تھی۔ پھر بھی یہ کہانی اس واقعے کے بعد کا بیانیہ قائم کرنے میں اہمیت رکھتی ہے کیونکہ یہ محمود کے لیے پیش کی جانے والی مذہبی جواز سازی سے وابستہ ہے۔'

تاہم یہ عقیدہ اپنی جگہ برقرار رہا۔ تیرہویں صدی کے مسلم عالم دین مولانا منہاج السراج 'طبقاتِ ناصری' میں لکھتے ہیں:

''سلطان محمود نے گجرات کے نہروالا (پاٹن) پر چڑھائی کی، سومناتھ سے منات کا بت اٹھا لایا اور اسے چار ٹکڑوں میں توڑ دیا۔ ایک ٹکڑا غزنی کی عظیم مسجد کے مرکز میں رکھا گیا، دوسرا سلطان کے محل کے دروازے پر نصب کیا گیا، جبکہ تیسرا اور چوتھا مکہ اور مدینہ بھیج دیا گیا۔''

سومناتھ واحد مندر نہیں تھا، جسے محمود نے مسمار کیا، مگر وہ اس کی تباہی کو ایک ایسا کارنامہ سمجھتا تھا جسے خلیفہ کے سامنے پیش کرنا لازم تھا۔ روملا تھاپر (Somnath and Mahmud، فرنٹ لائن، 10 اپریل 1999) کے مطابق:

''منات کے ساتھ اس مبینہ تعلق سے محمود کو کافی شہرت ملی۔ وہ نہ صرف ہندو بتوں کو توڑنے والا سب سے بڑا مجاہد بن کر ابھرا، بلکہ منات کو گرا کر اس نے وہ حکم پورا کیا

> جو کہا جاتا ہے کہ خود نبی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے دیا تھا۔ یوں وہ اسلام کا دوہرا علمبردار بن گیا۔ دوسرے مندروں پر بھی اس نے حملے کیے اور ان کے بت توڑے، مگر سومناتھ کو اس کے تمام کارناموں میں خصوصی حیثیت حاصل ہے۔ خلیفہ کو اپنی فتوحات کی خبر دیتے ہوئے محمود نے ان معرکوں کو اسلام کی سربلندی کا عظیم کارنامہ بنا کر پیش کیا۔''

اسلام کا پیغام ہندوستان میں محمود غزنوی کے آنے سے تقریباً تین سو سال پہلے ہی پہنچ چکا تھا۔ 711 میں وہی سال جس میں مسلمان اسپین میں داخل ہوئے تھے، ایک مسلمان فوج سندھ میں داخل ہوئی۔ اس فوج کی قیادت ایک نوجوان سپہ سالار محمد بن قاسم کے ہاتھ میں تھی، جو عراق کے گورنر حجاج بن یوسف کا داماد تھا۔ اس وقت خلیفہ ولید کی حکومت تھی۔ سندھ کے قزاقوں نے سری لنکا سے واپس آنے والے عرب تجارتی جہازوں کو لوٹ لیا اور مسلمان عورتوں اور بچوں کو غلام بنا لیا۔ سندھ کا راجا داہر جو کہ ایک بدھ مت کی اکثریت والی ریاست کا حکمران تھا، اس پر کوئی جوابدہی قبول کرنے کو تیار نہ ہوا اور تاوان دینے سے انکار کر دیا۔ چنانچہ 1712 میں محمد بن قاسم نے داہر کو اس کے دارالحکومت دیبل سے بے دخل کر دیا، لیکن داہر جون میں ایک فیصلہ کن جنگ میں اس وقت مارا گیا جب یونانی آگ کا ایک تیر اس کے ہاتھی کو لگا اور وہ نیچے آ گرا۔ 714 تک موجودہ جنوبی پاکستان کا علاقہ عربوں کے قبضے میں آ چکا تھا، مگر غیر معمولی طور پر اسلام کی توسیع اس علاقے تک محدود رہی اور تین صدیوں تک شمال اور مشرق کے طاقتور ہندو راجاؤں کی مزاحمت کے باعث آگے نہ بڑھ سکی، یہاں تک کہ محمود غزنوی کا ظہور ہوا، جس کے پاس ایک ایسی غیر معمولی فوجی ذہانت تھی کہ اس نے تین دہائیوں کی مسلسل جنگوں میں کبھی شکست نہیں کھائی۔

مسلم بادشاہوں نے افغانستان میں 870 میں اپنی حکومت کی بنیاد رکھی، جب یعقوب بن لیث نے کابل کے ہندو شاہیوں سے شہر چھین لیا۔ یہ ہندو خاندان پشاور کے قریب اپنے دارالحکومت کابل سے لے کر دریائے بیاس تک حکومت کرتا تھا۔ یعقوب نے غزنی شہر کی بنیاد رکھی۔ 977 میں ایک اور ترک غلام جس کا نام سبکتگین تھا، اپنے سسر الپتگین کے تخت پر بیٹھا اور اس نے پڑوسی شاہی راجہ جے پال کو کئی بار شکست دی۔

1008 میں اس کا بیٹا محمود اس خاندان کا پہلا شخص تھا، جس نے دریائے سندھ کو عبور کیا۔ سندھ کے مشرقی علاقوں کے راجہ حضرات تیار بیٹھے تھے۔ پشاور کے شاہی راجہ آنند پال کی قیادت میں ایک عظیم اتحاد بن چکا تھا، جس میں اجین، گوالیار، قنوج، دہلی اور اجمیر کی ریاستیں شامل تھیں۔ ان کا واحد مقصد حملہ آور کو ہندوستان کے دروازے پر ہی روک دینا تھا۔ معاصر رپورٹوں کے مطابق اس جنگی تیاری کا جوش عوام تک بھی پھیل چکا تھا۔ عورتیں اپنے زیورات بیچ کر اور اپنی جمع پونجی دے کر فوج کے لیے مالی مدد فراہم کر رہی تھیں۔ محمود نے اس وقت میدان مارا جب آنند پال کا ہاتھی دہشت سے بدک کر بھاگ گیا۔ اس فتح نے ہندوستان کے دروازے اس کے لیے کھول دیے اور اس کے مشہور مندروں کی دولت اس کے قبضے میں آ گئی۔ محمود نے ان وسائل کو استعمال کر کے غزنی میں ایک ایسا شاندار دربار قائم کیا جو علم، فن اور شاعری کے معیار میں بغداد کا ہمسر بن گیا۔ اس دربار میں البیرونی بھی شامل تھا۔ البیرونی نے ہندوستان کے ریاضی، نجوم، فلسفہ اور فن تعمیر کی حیرت انگیز ترقی کا برملا اعتراف کیا اور کہا کہ مسلمان یہاں کے عظیم تالابوں اور آبی ذخائر کی شاندار کاریگری پر صرف حیرت ہی کر سکتے ہیں۔ تاہم اس نے برہمنوں پر سخت تنقید کرتے ہوئے کہا کہ یہ ''ایسی ہٹ دھرمی ہے جس کا کوئی علاج نہیں۔'' اس کے مطابق ہندوؤں کا خیال تھا کہ ''ان کے سوا کوئی ملک نہیں، ان کے سوا کوئی قوم نہیں، ان کے سوا کوئی راجا نہیں، اور ان کے سوا کوئی علم نہیں۔'' یہی سوچ انہیں ''تکبر، احمقانہ خود پسندی اور اس قدر خودغرضی کی طرف لے گئی کہ وہ اپنے ملک کے دیگر طبقات کو بھی علم میں شریک کرنے کے روادار نہیں رہے تھے، چہ جائیکہ غیر ملکیوں کو شریک کریں۔''

اکتوبر 1024 میں محمود غزنوی سومناتھ کی طرف روانہ ہوا۔ اس نے ملتان اور اجمیر کے راستے سے پیش قدمی کی، جہاں کے راجا نے اس کا سامنا کرنے کے بجائے راہ فرار اختیار کی۔ محمود کی فوج کو زیادہ دشواری پیش نہیں آئی اور وہ بآسانی سومناتھ پہنچ گئی۔ کہا جاتا ہے کہ مندر کی چھت پر چودہ سنہرے گنبد بنے ہوئے تھے، جو قیمتی پتھروں سے مزین چھپن لکڑی کے ستونوں پر قائم تھے۔ مندر کے ایک تاریک کمرے میں جواہرات سے سجا ہوا بھگوان شیو کا لنگم نصب تھا، جس کی ہر سال ہزاروں یاتری عقیدت اور دولت کے ساتھ پوجا کرنے آتے تھے۔ اس بات کو بار بار دہرانا فضول ہے کہ محمود وہاں سے کتنی دولت لے کر واپس آیا، کیونکہ اکثر مؤرخین کے دیے گئے اعداد و شمار دراصل

ان کی مدح سرائی یا غصے کی علامت ہوتے ہیں۔اس فوج کی واپسی کے سفر کا سب سے بڑا مقصد اس مالِ غنیمت کی حفاظت تھا۔

البیرونی شاید بغیر کسی فخر کے لکھتا ہے کہ محمود نے ہندوستان میں کیسی تباہی مچائی:

> ''اس نے ملک کی خوشحالی کو پوری طرح برباد کر دیا اور ایسی حیرت انگیز فتوحات انجام دیں کہ ہندو بکھر کر خاک کے ذرات کی طرح ہو گئے اور لوگوں کی زبان پر پرانی کہانیوں کی طرح باقی رہ گئے۔ ان کی منتشر باقیات آج بھی مسلمانوں کے خلاف دل میں شدید نفرت چھپائے بیٹھی ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ ہندو علوم بھی ان علاقوں سے دور نکل گئے جن پر ہمارا قبضہ ہو چکا تھا، اور وہ ان جگہوں پر پناہ گزین ہو گئے جہاں ابھی ہمارا تسلط قائم نہیں ہوا تھا، جیسے کشمیر، بنارس اور دیگر مقامات۔''

محمود کو ان علاقوں پر حکومت کرنے میں کوئی دلچسپی نہیں تھی، مگر اس نے ہندوستان کے دروازے کی کنجی لاہور میں ایک گورنر کے ہاتھ میں دے دی۔ اس کے جانشین بھی یہی پالیسی اپناتے رہے اور ہندوستان کو محض ایک خزانے کی تلاش کا میدان بنائے رکھا۔ تاہم سومناتھ کی تباہی ہی وہ واقعہ تھا جس نے محمود کو مقبول کہانیوں میں ایک مثالی مسلمان یوانا (غیر ملکی) حملہ آور لوٹ مار کرنے والا اور عصمت دری کرنے والا بنا دیا۔

ایک دوسرا موٴثر بیانیہ اس وقت شروع ہوا جب برصغیر میں وہ عظیم مسلم سلطنت ابھری، جسے دنیا مغل سلطنت کے نام سے جانتی ہے۔ مغل سلطنت کی شہرت ہی وہ کشش تھی جس نے برطانویوں کو ہندوستان کی طرف راغب کیا۔ جیمز اول نے اپنا سفیر سر تھامس رو ہندوستان بھیجا، وہی سر تھامس رو جس کا ذکر ہم قسطنطنیہ کے حوالے سے بھی کر چکے ہیں۔ سر تھامس رو بادشاہ جہانگیر کی شاندار درباری پوشاک دیکھ کر حیران رہ گیا۔ عمامے کے ایک طرف اخروٹ کے سائز کا لعل، دوسری طرف اتنا ہی بڑا ہیرا اور بیچ میں ایک دل سے بھی بڑا زمرد، پٹکے میں موتیوں، لعلوں اور ہیروں کی جھلک، کہنیوں اور بازوؤں پر ہیروں کے زیورات اور گردن میں دیوقامت موتیوں کی مالا۔ فرانسیسی سیاح فرانسوا برنییر نے اندازہ لگایا کہ مغل سلطنت کی آمدنی شاید سلطنت عثمانیہ اور ایران کی مشترکہ آمدنی سے بھی

زیادہ تھی۔ حالانکہ اس عظمت کا آغاز سادہ حالات سے ہوا تھا۔عظیم مغلوں کا بانی بابر ہیرے جواہرات سے زیادہ قلم کو ترجیح دیتا تھا۔

ظہیرالدین محمد کے تین القاب تھے۔ پہلا لقب 'بابر' تھا، جو اس کے وصف کی عکاسی کرتا تھا اور اس کا مطلب تھا 'شیر'۔ دوسرا لقب 'پادشاہ' یا 'بادشاہ' تھا، جو اس کی کامیابی کی علامت تھا۔ تیسرا لقب 'غازی' یعنی خدا کا سپاہی، خود اپنے آپ کو اس وقت دیا تھا جب اس نے اپنی عظیم فتح کے ذریعے سلطنت قائم کی تھی۔

6 دسمبر 1992 کو جذباتی ہندوؤں نے سینئر قومی رہنماؤں کی سرپرستی میں ایودھیا کی ایک مسجد کو منہدم کر دیا، جو 'بابری مسجد' کے نام سے مشہور تھی۔ ان کا دعویٰ تھا کہ یہ مسجد بابر نے اس جگہ بنائی تھی جہاں پہلے بھگوان رام کی جائے پیدائش کی یادگار کے طور پر ایک مندر موجود تھا۔ بابر شاید محتاط سے زیادہ پرہیز گار تھا۔ اپنی سچائی اور دلکش انداز تحریر کے لیے مشہور 'بابرنامہ' میں بابر نے صاف الفاظ میں کہا ہے کہ اس نے صرف گوالیار کے علاقے اروہہ میں موجود بتوں کو بغیر کسی فخر یا گناہ کے احساس کے توڑا تھا۔ اس نے 28 ستمبر 1529 کو اروہہ کی وادی کا دورہ کیا اور لکھا:

> ''یہ بت بالکل ننگے دکھائے گئے تھے، ان کے پوشیدہ اعضا کو بھی نہیں ڈھانپا گیا تھا...... میں نے حکم دیا کہ انہیں توڑ دیا جائے۔'' (اصل ترکی سے ترجمہ: انیٹ سوسانہ بیوریج، 1922)

'بابرنامہ' میں بھگوان رام کے کسی مندر کو مسمار کرنے کا کوئی ذکر نہیں ملتا ہے، نہ بابر کے حکم پر اور نہ ہی اس کی ان فوجوں کے ذریعے جو مشرق کی طرف افغانوں کو زیر کرنے کے لیے بڑھ رہی تھیں، جو دہلی میں اپنی سلطنت کھو بیٹھے تھے، مگر امید کا دامن ابھی نہیں چھوڑا تھا۔ 'بابرنامہ' کے سچے اور بے ساختہ انداز سے صاف ظاہر ہوتا ہے کہ اگر ایودھیا کے کسی مندر کی تباہی جیسا اہم واقعہ پیش آیا ہوتا تو وہ ضرور اس کا ذکر کرتا۔ اگرچہ یہ بات حتمی نہیں، کیونکہ کچھ صفحات وقت کے ساتھ ضائع ہو چکے ہیں، باوجود اس کے کہ بابر کے وارثوں نے اس شاہکار کو 1589 میں ہی فارسی میں ترجمہ کروا دیا تھا۔ اس کے علاوہ بابر کے پوتے اکبر کے دور کے مشہور مؤرخ ابوالفضل نے بھی اس ایودھیا کے حوالے سے

کسی مندر کی تباہی کا ذکر نہیں کیا ہے، جسے وہ 'رام چندر، جو تریتا یگ میں روحانی اور شاہی عظمت کا امتزاج تھا' کے لقب سے یاد کرتا ہے۔ اسی طرح بھگوان رام پر مہا کاویہ 'رام چرت مانس' لکھنے والے عظیم ہندی شاعر گوسوامی تلسی داس نے بھی اس واقعے کا کوئی ذکر نہیں کیا۔

بابر خود بھی بہت زیادہ کٹر مسلمان نہیں تھا۔ 24 اپریل 1519 کے اندراج میں وہ لکھتا ہے:

''دوپہر کی نماز کے وقت شراب کی محفل ہوئی۔'' اور 25 اپریل کو: ''......دوپہر کے وقت ہم نے سوار ہو کر کابل کی طرف روانگی اختیار کی، خواجہ حسن کے ہاں پہنچے تو نشے کی حالت میں سو گئے......''

ایودھیا میں بابر کے زمانے میں جو تین گنبدوں والی مسجد تعمیر کی گئی، اس کے بارے میں سب جانتے ہیں کہ وہ بابر کے ایک امیر میر باقی نے 1528 میں تعمیر کرائی۔ کتبے اس بات کی تصدیق کرتے ہیں کہ یہ مسجد 'فرمان بادشاہ بابر' سے بنی اور 'دوجہاں کے نبی کے نذر شکرانے' کے طور پر تعمیر ہوئی، اور بابر قلندر (جو دنیا میں بڑی کامیابی حاصل کر چکا تھا) کی عظمت کی علامت تھی۔ تاہم اس بات کا کوئی ثبوت موجود نہیں کہ اس مسجد کی تعمیر کے لیے بھگوان رام کی جائے پیدائش پر کسی مندر کو منہدم کیا گیا ہو۔

بابر تمام تر جنگی جوش وخروش کے باوجود، کوئی انتہا پسند شخص نہیں تھا۔ انتہا پسندی دراصل ایک چھوٹی ترک-منگول فوج کے لیے کوئی دانشمندانہ پالیسی نہیں تھی، جو اجنبی ہندوؤں اور بے دخل افغانوں کے درمیان گھری ہوئی تھی۔ کچھ لوگ ایسے ضرور تھے جنہیں آج ہم 'بنیاد پرست' کہیں گے، جو ہندو اکثریتی ہندوستان میں فوری شریعت نافذ کرنے کا مطالبہ کر رہے تھے، لیکن جیسا کہ مؤرخ بمل پرساد لکھتے ہیں کہ ''یہ ترک حکمرانوں کے حقیقت پسندانہ، دانشمندانہ اور فیاض رویے کا ثبوت ہے کہ انہوں نے ان بنیاد پرست آوازوں پر کان نہیں دھرے اور علما کی نصیحتوں یا شریعت کی ہدایات کے برعکس وہی کیا جو ان کے خیال میں ان کی حکومت کے لیے بہتر تھا۔'' (بحوالہ: The Foundations of Muslim Nationalism منوہر، دہلی، 1999)

یہ دعویٰ کہ میر باقی کی مسجد بھگوان رام کی جائے پیدائش پر تعمیر کی گئی، محض ایک عقیدہ ہے، جو بعد میں اودھ کے آخری مسلمان نواب واجد علی شاہ کے دور میں کچھ لوگوں کی طرف سے ہوا دینے پر پختہ

عقیدہ بن گیا۔ اس تعصب کو بھڑکانے والا ہاتھ دراصل انگریزوں کا تھا جو ہندوستان کے مکمل مالک بننے سے محض ایک قدم کی دوری پر تھے۔

بابر کی اصل لڑائی ہندوستان کے مفاد کے لیے ایودھیا میں کسی مندر پر نہیں، بلکہ آگرہ کے قریب میدان جنگ میں تھی۔ اس نے اپریل 1526 میں پانی پت کی لڑائی میں افغان حکمران ابراہیم لودھی کو شکست دے کر دہلی پر قبضہ کیا۔ اور محض ایک سال بعد خانوا کی لڑائی میں فتح حاصل کر کے وہ ہندوستان کا حقیقی بادشاہ بن گیا۔

محمد شریف نام کے ایک نجومی نے پیش گوئی کی تھی کہ بابر شکست کھائے گا۔ شاید وہ ستاروں کی بجائے مغل کیمپ کا عمومی ماحول دیکھ رہا تھا۔ مغلوں کے خلاف ایک طاقتور اتحاد میدان میں آیا، جس کی قیادت رانا سانگا کر رہا تھا۔ راجپوتوں کے مؤرخ کرنل جیمز ٹوڈ (Annals and Antiquities of Rajasthan، لندن، آکسفرڈ یونیورسٹی پریس، 1920) کے مطابق رانا سانگا کی فوج میں '80 ہزار گھڑسوار، سات اعلیٰ درجے کے راجا، نو راؤ، اور راول وراوت کے لقب رکھنے والے ایک سو چار سردار شامل تھے، جب کہ پانچ سو جنگی ہاتھی بھی ان کے پاس موجود تھے'۔

ان کے مقابلے میں بابر کے پاس تقریباً اتنی ہی تعداد تھی جتنی اس نے پانی پت کی لڑائی میں جمع کی تھی، تقریباً 12 ہزار سپاہی۔ ابتدائی جھڑپوں میں راجپوت اتحاد نے کامیابی حاصل کی۔ اس اتحاد میں میوات کے حسن خان اور شکست خوردہ لودھی خاندان کے محمود خان بھی شامل تھے، جو دہلی کو دوبارہ حاصل کرنے کے خواب دیکھ رہے تھے۔ ان سب حالات کی وجہ سے مغل کیمپ میں مایوسی کی فضا پیدا ہو گئی تھی۔

26 فروری 1527 کو بابر نے دو جہادوں کا اعلان کیا: ایک 'مشرکوں' کے خلاف اور دوسرا اپنے نفس کے خلاف روحانی تطہیر کے لیے۔ اس نے شراب نوشی ترک کر دی اور اللہ تعالیٰ کے حضور توبہ کی۔ اس کے خادموں نے سونے چاندی کے برتن توڑ ڈالے: ''انہوں نے شرم وذلت کے اظہار کے طور پر وہ تمام صراحیاں، پیالے اور دوسرے سونے چاندی کے برتن توڑ ڈالے جو اپنی تعداد اور چمک دمک میں آسمان کے ستاروں کی طرح چمکتے تھے۔ ان سب کو چکنا چور کر دیا گیا، اور ان شاء اللہ عنقریب

بت پرستوں کے معبود بھی اسی طرح ریزہ ریزہ کر دیے جائیں گے۔''

اس کے بعد بابر نے تمام امراء اور بہادروں کو بلا کر کہا کہ ''بدنام زندگی سے بہتر ہے عزت کے ساتھ موت! اللہ تعالیٰ نے ہمیں ایسا نصیب اور ایسی خوش بختی عطا کی ہے کہ ہم شہادت کے ساتھ مریں یا اس کے دین کی خاطر لڑتے ہوئے دشمن کو ہلاک کر دیں۔ اس لیے ہر شخص کو قرآن پاک پر قسم کھانی چاہیے کہ وہ دشمن سے منہ موڑنے یا اس خونریز معرکے سے پیچھے ہٹنے کا کبھی نہ سوچے جب تک اس کا جسم روح سے جدا نہ ہو جائے۔''

سب نے قرآن پاک پر یہ قسم اٹھائی۔

13 مارچ کو جو ایرانی کیلنڈر کے مطابق نیا سال تھا، بابر نے اپنی فوج کی صف بندی کر دی۔ 17 تاریخ کو صبح نو اور دس بجے کے درمیان جنگ کا آغاز ہوا۔ بابر فوج کے وسط میں تھا، ان مجاہدین کے درمیان جو اللہ کی راہ میں جہاد کر رہے تھے (قرآن مجید میں جہاد کی یہی تعبیر ہے۔ 'بابرنامہ' میں قرآن کی آیات کے ذریعے شہادت کے جذبے اور اہل ایمان کے لیے فتح کے وعدے کا بار بار ذکر ملتا ہے)۔ مغل فوج کے بائیں بازو پر دشمن کا شدید حملہ ہوا، مگر صفیں مضبوط رہیں۔ بابر نے خاص پیادہ دستے کو آگے بڑھنے کا حکم دیا جبکہ 'اپنے عہد کی حیرت انگیز شخصیت' استاد علی قلی کی زیر نگرانی توپچیوں نے رتھوں کی زنجیر کے پیچھے سے توپوں اور بندوقوں کا مؤثر استعمال کیا۔ (یہی حکمت عملی پانی پت کی لڑائی میں بھی آزمائی گئی تھی)۔ پھر فوج کے مرکز سے خود بابر دشمن کی طرف بڑھا:

> ''بابر خود دشمن کی فوج کی طرف بڑھا۔ اس کے دائیں جانب اللہ کی طرف سے فتح و نصرت کی طاقتیں موجود تھیں، جبکہ بائیں جانب شان و شوکت اور تسخیر کی قوتیں اس کا ساتھ دے رہی تھیں۔ پہلی اور دوسری نماز کے درمیانی وقت میں لڑائی اس شدت سے بھڑکی کہ اس کی لپٹیں آسمان کی بلندیوں تک جا پہنچیں۔ فوجِ اسلام کے دائیں اور بائیں بازو ایسے جوش و ولولے سے حملہ آور ہوئے کہ کافروں کے دائیں اور بائیں حصے کو روندتے ہوئے سیدھا ان کے مرکز پر حملہ آور ہو گئے۔''

دشمن نے مغل فوج کے بائیں حصے پر آخری بھرپور حملہ کیا، لیکن 'اجر کی طلب میں سرگرداں مجاہدین' نے ان پر تیر برسائے اور انہیں پیچھے ہٹنے پر مجبور کر دیا۔ آخر کار، 'فتح... وہ خوبصورت عورت جس کی لہراتی زلفوں کو "سَیُعِینُکُمُ اللّٰہُ نَصْرًا عَزِیزًا" (سورۃ الفتح 48:3) نے سجا دیا،'' ہمارے لیے اس خوش نصیبی کو ظاہر کر دیا جو نقاب میں چھپی ہوئی تھی اور اسے حقیقت کا روپ دے دیا۔ بے وقوف ہندوؤں نے جب اپنی حالت نازک دیکھی تو '' وہ روئی کی طرح بکھر گئے اور پروانوں کی مانند اِدھر ادھر منتشر ہو گئے'' (کَالْفَرَاشِ الْمَبْثُوثِ... کَالْعِهْنِ الْمَنفُوشِ)(سورۃ القارعہ 101 :4/5)۔

بابر نے اس فتح کے بعد 'غازی' یعنی 'اللہ کے سپاہی' کا لقب اختیار کیا اور ایک قطعہ لکھا جس کا اردو ترجمہ یہ ہے:

اسلام کی خاطر میں نے جنگلوں کی خاک چھانی
کافروں اور ہندوؤں سے لڑنے کی ٹھانی
شہادت کے شوق سے دل کو آمادہ کر لیا
میں غازی بن گیا شکر ہے خدا کا

خانوا کی لڑائی بڑی اہمیت کی حامل تھی۔ اگر بابر یہ جنگ ہار جاتا تو دہلی کا تخت میواڑ کے رانا سانگا کے قبضے میں چلا جاتا۔ 1162 میں جب محمد غوری نے پرتھوی راج کو شکست دی تھی تب سے دہلی پر مسلم سلاطین اور شہنشاہوں کی حکمرانی جاری تھی۔ اگر بابر کی شکست ہوتی تو یہ سلسلہ منقطع ہو جاتا۔ مگر تقدیر کا فیصلہ کچھ اور تھا۔ دہلی یا آگرہ کا تخت 1858 تک مسلم حکمرانوں کے قبضے میں رہا، جب انگریزوں نے بے بس اور دل شکستہ بہادر شاہ ظفر کو برما جلاوطن کر دیا۔ 1556 اور 1761 میں پانی پت کی جنگوں میں اس روایت کو توڑنے کی دو اہم کوششیں ہوئیں، لیکن دونوں ناکام رہیں۔

بابر کے بیٹے ہمایوں کو چار باتوں کے لیے یاد کیا جاتا ہے۔ پہلی یہ کہ اس نے اپنی سلطنت مشرقی صوبوں کے گورنر اور بہار سے تعلق رکھنے والے افغانی شیر شاہ سوری کے ہاتھوں 1540 میں قنوج کی لڑائی میں کھو دی۔ دوسری یہ کہ 1555 میں اس نے اپنے والد کے دوست اور ایرانی ہم عصر شاہ طہماسپ کی فیاضی سے وہ سلطنت دوبارہ حاصل کی، اتنی آسانی سے جتنی مشکل سے وہ گئی تھی۔

تیسری یہ کہ جب وہ پندرہ برس بعد 23 جولائی 1555 کو دہلی واپس آیا تو اس نے اپنے وعدے کے مطابق ایک مشکی (water carrier) نظام کو، جس نے اس کی جان بچائی تھی، دو گھنٹوں یا دو دن کے لیے بادشاہ بنا دیا۔ آخری بات یہ کہ وہ ہندوستان کے عظیم ترین شہنشاہوں میں سے ایک، اکبر کا باپ تھا۔

اکبر کے درباری مورخ ابوالفضل نے اپنی کتاب 'اکبر نامہ' (جسے انیٹ کے شوہر ایچ۔ بیورج H. Beveridge نے انگریزی میں ترجمہ کیا اور 1907 تا 1929 کے درمیان کلکتہ سے تین جلدوں میں شائع ہوا) میں چاپلوسی کی انتہا کر دی۔ اس نے لکھا کہ بادشاہوں کا بادشاہ 'میٹھی مسکراہٹ' کے ساتھ پیدا ہوا تھا، جو 'عقل مندوں کے دلوں کو شاد کر دیتی تھی'۔ حالانکہ حقیقت یہ تھی کہ جب اکبر پیدا ہوا تب ہمایوں اور اس کی بیوی حمیدہ تو جلاوطنی کی حالت میں تھے۔ اس بچے کو بہت کچھ دیکھنا اور جھیلنا پڑا، اس سے پہلے کہ وہ خود ہنسنے کے قابل ہوتا۔ ہمایوں کی موت کے وقت اکبر کی عمر صرف چودہ برس تھی۔ چار استاد بھی اسے پڑھنا لکھنا نہ سکھا سکے۔ البتہ عبداللطیف نامی ایک استاد اسے صوفی شاعری سے ایسی لازوال محبت دے گیا جو ہمیشہ اس کے دل میں زندہ رہی۔

کم سن بادشاہ کو ہندوستان کی تاریخ کے سب سے انوکھے کرداروں میں سے ایک نے تخت کے لیے چیلنج کیا۔ یہ ایک بدصورت اور کمزور شخص تھا جو نہ تلوار چلا سکتا تھا اور نہ ہی گھوڑے پر بیٹھ سکتا تھا۔ ہندو سماج کے نچلے طبقے سے تعلق رکھنے والا مگر اپنی حقیقی بہادری کی وجہ سے سچا ہیرو تھا۔ اس کا نام ہیم چندر تھا، جو ہیمو کے نام سے معروف تھا۔ اس نے الور کے ایک چھوٹے سے قصبے میں شورہ (saltpetre) کی تجارت سے اپنی زندگی کا آغاز کیا اور مغل سلطنت کے مختصر زوال کے دوران اس قدر تیزی سے ترقی کی کہ ساری انتظامیہ اس کے ہاتھ میں آ گئی۔ لڑائی کے ہنر کی کمی اس نے اپنی قائدانہ صلاحیتوں اور شاندار ذہانت سے پوری کی۔

1556 میں اس نے اکبر کی کمزور فوج کے خلاف پیش قدمی کی۔ دونوں جانب فال نکالی گئی۔ پانی پت جاتے ہوئے ہیمو نے خواب دیکھا کہ اس کا ہاتھی سیلاب میں بہہ گیا مگر مغلوں کی زنجیر نے اسے موت سے بچا لیا۔ مغلوں کی جانب سے احمد بیگ نے جو بھیڑ کی ہڈی میں قسمت کا حال دیکھتا تھا،

اکبر کی فتح کی پیش گوئی کی۔لڑائی ہیمو کے حق میں جا رہی تھی، جبکہ اکبر ایک ٹیلے پر ذاتی محافظوں کے ساتھ کھڑا دیکھ رہا تھا۔مغل فوج تقریباً شکست کے دہانے پر تھی کہ ایک تیر آ کر ہیمو کو لگا۔ابوالفضل کے مطابق یہ اللہ کا 'قہر' تھا، جو کافروں پر نازل ہوا اور جہاد کی فتح ثابت ہوا۔ہیمو کو اکبر کے سامنے پیش کیا گیا، مگر اس نے زنجیروں میں جکڑے قیدی کا سر قلم کرنے سے انکار کر دیا۔اس کے جرنیل 'مجاہد دین' بیرم خان نے بغیر ہچکچاہٹ کے پیش قدمی کی۔

یوں مغل سلطنت کو نئی قوت ملی، لیکن تخت کو بچانے کے لیے ایک اور معرکہ باقی تھا، وہ جس کے میدان میں تاج بھی سرنگوں ہوتے ہیں... محبت کی خوابگاہوں کی فتح۔چودہ برس کی عمر میں اکبر نے اپنے چچا ہندال کی بیٹی رقیہ سے شادی کی۔تیرہ برس اور کئی بیویوں کے باوجود اکبر کے ہاں واحد لازمی وارث بیٹا پیدا نہ ہو سکا۔اس کے جنسی رجحانات یا اس دور کے رسوم و رواج میں کوئی رکاوٹ نہیں تھی۔بلکہ درباریوں کے گھروں میں اس کا بار بار کا آنا جانا ایک مسئلہ بننے لگا تھا۔بدایونی کے نام سے معروف ایک درباری ایسے شکایت کرنے والوں کو یہ مشورہ دیتا کہ یا تو کسی مہاوت (ہاتھی بان) سے دوستی نہ کرو یا گھر کو اتنا وسیع کر لو کہ ہاتھی سما سکے۔اکبر کے تین بچے جن میں ایک بیٹی فاطمہ اور جڑواں بیٹے حسن و حسین (سبھی اہل بیت کے ناموں سے موسوم) بچپن میں ہی وفات پا گئے۔

مایوسی میں اکبر نے ہندوستان کے عظیم صوفی بزرگ خواجہ معین الدین چشتی کے ایک خلیفہ کی مدد لینے کا فیصلہ کیا، جو بارہویں صدی کے آخر میں عراق سے ہندوستان آ کر اجمیر میں آباد ہو گئے تھے۔اکبر نے آگرہ کے قریب ایک گاؤں سیکری میں سلیم چشتی کے دربار کا رخ کیا اور منت مانی کہ اگر بیٹا پیدا ہوا تو وہ پیدل چل کر خواجہ معین الدین چشتی کے مزار پر حاضری دے گا۔اس کی ایک راجپوت بیوی، راجہ بھرمل کی بیٹی حاملہ ہو گئی۔اگست 1569 میں ایک بیٹا پیدا ہوا، جس کا نام سلیم رکھا گیا۔ہندوستان کا بادشاہ ننگے پاؤں آگرہ سے اجمیر تک تین سو کلومیٹر سے زیادہ کا سفر طے کر کے خواجہ معین الدین چشتی کے مزار پر اپنی منت پوری کرنے پہنچا۔

اگر ہندوستان میں اسلام پھیلا تو وہ اکبر کی تلوار کی دھار سے نہیں، بلکہ اس کے صوفی مرشدوں کی روحانی طاقت سے پھیلا۔یہ صوفی بزرگ جیسے کہ خواجہ معین الدین چشتی، وہ ہستیاں تھیں جنہوں نے

اس راستے کو منور کیا۔ ایک بادشاہ جب صوفی کے قدموں میں جھک گیا تو یہ منظر خود گواہ بن گیا کہ دنیا کی کوئی بادشاہی صوفی کی وفاداری خرید نہیں سکتی۔ صوفی کی وفا تو صرف خدا کے لیے مختص ہوتی ہے۔ 'صوفی' کا لفظ عربی کے لفظ 'صوف' سے نکلا ہے، جس کا مطلب ہے 'اون'، وہی سادہ اور کھردرا اونی لباس جوان روحانی بصیرت رکھنے والے مردوں اور عورتوں کی واحد متاع ہوا کرتا تھا۔ ان کی زندگیاں اللہ سے روحانی وصال کی جستجو میں پروئی گئی تھیں، ہر سانس ایک عبادت، ہر نظر ایک راز کی تلاش۔ جیسے قرآن کی وہ آیت جس میں اللہ فرماتا ہے کہ وہ انسان کی شہ رگ سے بھی زیادہ قریب ہے اور اس کے دل کے بھیدوں کو خود اس کے نفس سے بھی بہتر جانتا ہے۔ ان صوفیوں کی حکمت الٰہی نور سے معمور ہوتی تھی، مگر وہ نہ اپنی طاقت کو ظاہر کرتے تھے اور نہ ہی اسے بڑھا چڑھا کر بیان کرتے۔ ان کی نظر صرف محبوب (یعنی اللہ) پر مرکوز رہتی تھی اور دنیا کو وہ بے نیازی کی نگاہ سے دیکھتے تھے۔

صوفی ازل سے ہی اسلامی روایت کا حصہ رہے ہیں۔ حضرت حسن بصریؒ جو پیغمبر اسلام ﷺ کی وفات کے دس سال بعد مدینہ میں پیدا ہوئے، اس روایت کا آغاز سمجھے جاتے ہیں۔ فارسی صوفی شاعر فرید الدین عطارؒ کی فارسی زبان میں لکھی گئی کتاب 'تذکرۃ الاولیا' (انگریزی ترجمہ Muslim Saints and Mystics، مترجم: اے جے آربری، شائع کردہ: راؤٹلیج اینڈ کیگن پال، 1966) میں ایک حکایت صوفیانہ فکر کو خوبصورتی سے اجاگر کرتی ہے۔ نویں صدی کے فارسی صوفی ابو یزید بسطامی فرماتے ہیں کہ 'اللہ تعالیٰ نے مجھے دو ہزار مقامات پر اپنا قرب عطا فرمایا اور ہر مقام پر مجھے بادشاہی دینے کی پیش کش کی، لیکن میں نے انکار کر دیا۔ اللہ تعالیٰ نے پوچھا: ابو یزید، تمہاری خواہش کیا ہے؟ میں نے عرض کیا: میری خواہش یہی ہے کہ میری کوئی خواہش نہ رہے۔'

ہندوستان آنے والے پہلے صوفی منصور الحلاج تھے، جو اتنے متنازع ہوئے کہ انہیں اپنی جان سے ہاتھ دھونا پڑا۔ انہوں نے علما کے صبر کی حد پار کر دی اور اپنے آپ کو 'حق' کہہ کر کفر کی حدوں کو چھو لیا۔ 28 مارچ 913 کو انہیں بے رحمی سے قتل کر دیا گیا اور وہ ایک زندہ داستان بن گئے۔ سندھ اور پنجاب کی ان سرزمینوں میں انہوں نے سفر کیا، جہاں عربوں کی فتوحات ہو چکی تھیں اور وہ اس خطے کی عوامی شاعری میں عشق حقیقی کی علامت بن گئے۔

تاہم ہندوستان میں تصوف کی اصل طاقت کا ظہور خواجہ معین الدین چشتی کے ساتھ ہوا۔ ان کی وفات کے دو یا تین سو برس بعد فارسی میں ریکارڈ کی گئی زبانی روایات اگرچہ معجزوں اور داستانوں سے بھری ہوئی ہیں، مگران سب میں ایک بات مشترک ہے: ان کے روحانی کمال کو مان کرلوگوں کا اسلام قبول کرنا۔ 'سیر الاقطاب' (جسے ڈاکٹر پی ایم کری نے اپنی کتاب The Shrine and Cult of Muin al din Chishti of Ajmer، آکسفرڈ یونیورسٹی پریس، دہلی، 1989، میں حوالہ دیا ہے) میں مہاراجہ اجمیر سے ان کی ملاقات، پنڈت شادی دیو سے مکالمہ اور ہندوستان کے سب سے بڑے جادوگر اجے پال کے ایمان لانے کے قصے بیان کیے گئے ہیں۔ یہ روایات اگرچہ بظاہر حیرت انگیز معلوم ہوتی ہیں، مگر لوگ ان پر یقین بھی رکھتے ہیں۔

خواجہ معین الدین چشتی کو ہندوستان کے شہر اجمیر کی طرف ایک روحانی کشش اس وقت محسوس ہوئی جب وہ مدینہ منورہ میں روضۂ رسول ﷺ پر مراقبے کی حالت میں تھے۔ انہوں نے ایک روحانی خواب دیکھا، جس میں انہیں اسلام کے نور کو عام کرنے کا حکم دیا گیا۔ کئی برسوں پر محیط سفر کے بعد وہ چالیس مریدوں کے ساتھ اجمیر پہنچے۔ مقامی راجہ کو اس کے نجومیوں نے خبردار کیا تھا کہ اگر ایسا کوئی درویش اس کی سرزمین پر قدم رکھے تو اسے فوراً قتل کر دیا جائے، لیکن خواجہ کے داخلے کو کسی نے نہ روکا۔

انہوں نے شہر سے باہر ایک درخت کے سائے تلے پڑاؤ ڈالا، وہی مقام جہاں راجہ کے اونٹ آرام کیا کرتے تھے۔ راجہ کے اونٹ بان نے ان سے جگہ خالی کرنے کو کہا۔ خواجہ کو اس بے ادبی پر رنج ہوا، چنانچہ وہ اٹھ کھڑے ہوئے اور اونٹوں پر بددعا کی کہ وہ کبھی کھڑے نہ ہو سکیں۔ پھر وہ وہاں سے کوچ کر کے اناساگر جھیل کے کنارے جا بسے۔

گوشت کے استعمال پر کچھ مقامی ہندوؤں سے تلخ کلامی ہوئی، جو جلد ہی پرتشدد رخ اختیار کر گئی۔ جب خواجہ نماز میں مصروف تھے تو ان پر حملہ کیا گیا۔ انہوں نے زمین سے مٹی اٹھائی، آیت الکرسی پڑھی اور وہ مٹی حملہ آوروں کی جانب پھینک دی۔ نتیجتاً وہ سب مفلوج اور کمزور ہو گئے۔

یہ لوگ ایک ایسے شخص کے پاس گئے جسے وہ 'دیو' کہتے تھے۔ اس نے مشورہ دیا کہ اس مسلمان یوگی کا مقابلہ صرف کوئی بڑا جادوگر ہی کر سکتا ہے۔ دیو خود خواجہ معین الدین سے ملنے آیا، لیکن ان کی روحانی

ہیبت سے اس قدر متاثر ہوا کہ سراپا لرز گیا۔ جتنا بھی وہ 'رام رام' دہرانے کی کوشش کرتا، اس کے لبوں سے بس 'رحیم رحیم' نکلتا۔ خواجہ نے اسے ایک پیالہ پانی پیش کیا، جو اس نے پیا، اور پھر سجدۂ عقیدت میں گر پڑا۔ وہ مسلمان ہوا اور خواجہ کا مرید بن گیا۔ خواجہ نے اس سے اس کا نام پوچھا۔ اس نے کہا: 'دیو'۔ خواجہ نے اسے 'شادی دیو' یعنی 'خوش نصیب دیو' کا لقب عطا کیا۔

ادھر راجہ نے ایک نمائندہ خواجہ کی خدمت میں اس التجا کے ساتھ بھیجا کہ اونٹوں کو رہائی دی جائے۔ جب خواجہ نے اپنی بددعا واپس لے لی، تو وہ اونٹ فوراً اٹھ کھڑے ہوئے۔ اس کے بعد ہندوستان کا سب سے مشہور جادوگر یوگی اجے پال خواجہ کا مقابلہ کرنے آیا۔ اس کے تمام منتر، آتشی گولے اور زہریلے سانپ ناکام ہو گئے۔ وہ شکست کھا کر مسلمان ہو گیا اور اس کا اسلامی نام 'عبداللہ' رکھا گیا۔ اجے پال نے خواجہ سے اپنی ایک خواہش کا اظہار کیا کہ وہ ہمیشہ زندہ رہنا چاہتا ہے۔ خواجہ معین الدین نے اللہ کے حضور دعا کی جو ایک شرط کے ساتھ قبول کر لی گئی کہ وہ ہمیشہ انسانوں کی نگاہوں سے اوجھل رہے گا۔ روایت ہے کہ اجے پال جو بعد میں عبداللہ کہلایا، آج بھی ہر جمعرات کی رات خواجہ معین الدین چشتی کے مزار پر حاضری دینے آتا ہے۔

خواجہ کا مزار ان کے وصال کے بعد سے ہی خدام و سلاطین دونوں کے لیے مرکزِ عقیدت بنا رہا، مگر اس کی شہرت میں اس وقت کئی گنا اضافہ ہو گیا جب مغل بادشاہ اکبر نے اپنے وارث کی پیدائش پر ننگے پاؤں حاضر ہو کر شکرانہ ادا کیا۔ اکبر نے ان کے نام پر ایک مسجد تعمیر کروائی اور زندگی میں چودہ بار اس مزار پر آیا۔ جہانگیر کو تو یقین تھا کہ اس کی جان خواجہ کی دعا سے بچی ہے۔ بچھتر نامی مغل مصور کی بنائی ہوئی ایک مشہور تصویر میں جو ڈبلن کی چیسٹر بیٹی لائبریری میں محفوظ ہے، خواجہ معین الدین چشتی کو جہانگیر کو شاہی منصب کی علامت پیش کرتے دکھایا گیا ہے۔ شاہ جہاں نے اجمیر کے پانچ دورے کیے اور ایک نہایت خوبصورت مسجد تعمیر کرائی۔ حتیٰ کہ اورنگزیب، جو 'مزار پرستی' سے سخت اجتناب برتنے والا پرہیزگار شخص تھا، اپنے بھائی دارا شکوہ پر فتح کے بعد شکرانے کے طور پر اس مزار پر حاضری دینے آیا۔

یہ کوئی حیرت کی بات نہیں کہ ہندوستان کی خاک میں تلوار سے زیادہ تاثیر ایک درویش کے نعلین میں

چھپی ہو۔ خواجہ معین الدین چشتیؒ 1236 میں وصال فرما گئے، لیکن ان کے فیضان روحانی نے چشتی سلسلے کی صورت میں ایسی جڑ پکڑی کہ صدیاں گزرنے کے باوجود اس کی خوشبو آج بھی محسوس کی جا سکتی ہے۔ سلسلہ چشتیہ سے معروف وابستہ ان کے مریدین نے ہندوستان میں اسلام کے فروغ میں نمایاں کردار ادا کیا۔ قطب الدین بختیار کاکی دہلی میں قیام پذیر ہوئے، لیکن پنجاب میں عوامی سطح پر 'بابا فرید' کے نام سے معروف حضرت فرید الدین گنج شکر کا اثر سب سے زیادہ گہرا رہا۔ ان کا وصال 1266 میں ہوا۔ آج بھی ان سے منسوب قصے اور حکایات عوامی روایتوں میں زندہ ہیں۔ ایک روایت کے مطابق وہ چالیس دن تک ایک رسی سے لٹک کر مراقبے میں مصروف رہے۔ سکھوں کی مقدس کتاب گرو گرنتھ صاحب میں کئی اشعار بابا فرید سے منسوب ہیں۔

ان کے بعد حضرت نظام الدین اولیاء جن کا وصال 1325 میں ہوا، دہلی کے روحانی تاجدار کہلائے۔ آج بھی جدید دارالحکومت کے قلب میں ان کے نام سے منسوب ایک بستی موجود ہے۔ ان کے جانشین حضرت نصیر الدین چراغ دہلوی 1356 میں وفات پا گئے، اور ان کے مرید حضرت گیسو دراز نے چشتی سلسلہ کو جنوبی ہند گلبرگہ تک پہنچایا۔ اگرچہ ان کا یہ سفر مذہبی دعوت کی غرض سے نہ تھا، بلکہ 1398 میں تیمور کی یلغار سے بچنے کے لیے وہ دہلی سے کوچ کر گئے تھے۔

تیرہویں صدی کے وسط میں صوفیا کا ایک اور سلسلہ سہروردیہ منظر عام پر آیا، جو مشرق کی طرف بنگال تک پھیل گیا۔ چودہویں صدی میں بہار میں عظیم صوفی بزرگ حضرت شرف الدین یحییٰ منیریؒ نے فردوسیہ سلسلہ قائم کیا۔ پندرہویں صدی کے اختتام پر سلسلہ قادریہ ہندوستان پہنچا، اور سترہویں صدی کے آغاز میں نقشبندیہ سلسلے نے پنجاب کے شہر سرہند سے اپنے اثرات قائم کیے۔ یہ سلسلہ مغلیہ سلطنت کی سیاست میں بھی شریک رہا، تاہم دیگر صوفی سلسلوں نے نقشبندیوں کی سخت مزاجی اور قدامت پسندی اختیار نہیں کی۔

تصوف کا بنیادی اصول ہم آہنگی ہے اور صوفیا نے دین اسلام کو نفرت یا تشدد کے ذریعے نہیں، بلکہ محبت، رواداری اور حکمت کے ذریعے پھیلایا۔ انہوں نے مقامی سماجی رسومات کو جذب کرنے کا رویہ اختیار کیا۔ مثلاً حضرت شرف الدین منیریؒ نے مسلمان عورتوں کو 'سندور' لگانے کی اجازت دی،

جو کہ شادی شدہ ہندو خواتین کی روایتی شناخت ہے۔ بیسویں صدی میں جب تبلیغی جماعت جیسی اصلاحی تحریکیں سامنے آئیں تو ان کا مقصد ایسے روایتی مظاہر کو اسلامی معاشرت سے ختم کرنا تھا۔

آج جب برصغیر کئی سیاسی، مذہبی اور جغرافیائی تقسیموں کا شکار ہے، تب بھی ایک جذبۂ عقیدت ایسا ہے جو ان تمام دیواروں سے بلند ہے اور وہ ہے خواجہ معین الدین چشتیؒ اور حضرت نظام الدین اولیاءؒ جیسے ولیوں کے مزارات پر حاضری۔ یہاں تک کہ جب کوئی پاکستانی سربراہ مملکت سرکاری دورے پر بھارت آتا ہے تو اجمیر کی حاضری اس کے شیڈول کا لازمی حصہ ہوتی ہے اور کوئی ہندوستانی اس پر اعتراض نہیں کرتا۔ یہ بزرگ عوام کے لیے تھے اور آج بھی عوامی دلوں میں زندہ ہیں۔ ان کا پیغام اس وقت بھی روزمرہ زندگی کی ہم آہنگی کا محافظ رہا، جب حکمران طبقے کی جنگیں تلخی میں بدل گئیں اور درباری مؤرخین کی چاپلوسی سے بھرپور تحریریں ایسی زہریلی لسانی یادگاریں بن گئیں جو ان خوشامدیوں کے مرنے کے بعد بھی نسلوں تک اذیت دیتی رہیں۔

اسلام برصغیر میں آٹھویں صدی کے اوائل میں وارد ہوا اور ایک ایسا پیچیدہ اور متنوع رشتہ قائم ہوا، جس میں جنگ، تہذیب، تمدن، مکالمہ، لباس، اخلاق، ادب، قانون، تصوف، فلسفہ، بدگمانی، اساطیر، تفریق، یکجائی، خواب اور کابوس سب شامل تھے۔ اگرچہ یہ رشتہ جنگ سے شروع ہوا، لیکن اس کا تسلسل جنگ پر قائم نہ رہا۔ جو مسلمان حملہ آور بن کر آئے وہ یہیں کے ہو کر رہ گئے۔ یہ سرزمین ان کی اپنی بن گئی... یہاں تک کہ 1455 میں قسطنطنیہ کی فتح کے دو سال بعد پوپ کی طرف سے جاری کردہ ایک فرمان کے مطابق بنائی گئی حکمت عملی بالآخر چار سو سال کے طویل اور پیچیدہ سفر کے بعد کامیاب ہوئی۔

9

# بحر مقدس: کالی مرچ اور طاقت کی سیاست

کچھ عرصہ قبل مذکورہ شہزادے (شہزادہ ہنری آف پرتگال، المعروف نیویگیٹر) کو معلوم ہوا کہ کبھی بھی یا کم از کم انسانی یادداشت کی حد تک یہ معمول نہیں رہا کہ اس وسیع سمندر میں جنوبی اور مشرقی ساحلوں کی جانب سفر کیا جائے۔ وہ خطہ اہل مغرب کے لیے اس قدر نامانوس تھا کہ ان علاقوں کے باشندوں کے بارے میں کوئی مصدقہ علم نہیں تھا۔

شہزادے کا یقین تھا کہ اگر وہ اپنی محنت، بصیرت اور تدبیر سے اس سمندر کو اس حد تک قابل عبور بنا دے کہ وہاں سے گزرتے ہوئے ہندوستان تک رسائی ممکن ہو جائے جہاں کے باشندوں کے بارے میں کہا جاتا ہے کہ وہ مسیح کے نام کی پرستش کرتے ہیں تو یہ اس کی طرف سے خدا کی رضا کے لیے ایک عظیم خدمت ہوگی۔

اس کے پیش نظر وہ ان اقوام سے تعلقات قائم کرنا چاہتا تھا، تاکہ انہیں مسلمانوں (جنہیں سَرَسِن کہا گیا) اور دین مسیح کے دیگر دشمنوں کے خلاف تعاون پر آمادہ کیا جا سکے۔ ساتھ ہی وہ ان راستوں کے بیچ رہنے والی بعض مشرک یا غیر مسلم اقوام کو فوراً زیر کرنا چاہتا تھا، جنہیں اس کے خیال میں ''محمد صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے پیروکاروں کی (بزعم پوپ) گمراہ کن بدعت سے پاک تصور کیا گیا۔

[ماخذ: پوپ نکولس پنجم کا فرمان، جاری کردہ 8 جنوری 1455ء۔ اس فرمان میں پوپ نے مغرب کی مسیحی طاقتوں اور ہندوستان کی ان اقوام کے درمیان اتحاد کی خواہش ظاہر کی جنہیں وہ غلطی سے غیر مسلم ہونے کے باوجود مسیحی سمجھتا تھا تاکہ بیچ میں موجود 'سَرَسِن' سلطنتوں کو گھیر کر کمزور کیا جا سکے۔]

پندرہویں صدی عیسوی میں ہندوستانی سمندر میں اچانک ایک عظیم بحری بیڑا نمودار ہوا، جو جاوا سے لے کر کالی کٹ اور وہاں سے مشرقی افریقہ کی سب سے دولت مند بندرگاہ مالندی تک جو ممباسا کے شمال اور موغادیشو کے جنوب میں واقع ہے، اپنی زبردست قوت کے ساتھ حکمرانی قائم کر گیا۔ دور سے ان کے بادبان اکٹھے اڑتے بادلوں کی مانند دکھائی دیتے تھے اور ان کے نقارے جس بندرگاہ کے قریب آتے وہاں لرزہ طاری ہو جاتا تھا۔

اس بحری بیڑے کا خزانہ بردار جہاز نو بادبانوں پر مشتمل تھا اور اس کی لمبائی چار سو فٹ تھی۔ اس کے مقابلے میں کولمبس کا مشہور جہاز سانتا ماریا (Santa Maria) صرف پچاسی فٹ کا تھا۔ لیکن یہ بیڑا کسی یورپی قوت کی برتری کا مظہر نہیں تھا۔ یہ قافلہ چین سے روانہ ہوا تھا۔ اس کا سپہ سالار ژینگ ہی (Zheng He) نامی ایک مسلمان تھا۔ اس کے والد ما ہی (Ma He) نے حج ادا کیا تھا اور 1381ء میں منگولوں کے ساتھ جنگ میں قتل کر دیا گیا تھا۔ ان کے دوسرے بیٹے ژینگ (Zheng) کو بیجنگ بھیجا گیا، جہاں شاہی دربار کی خدمت کے لیے اسے مخنث کیا گیا تاکہ 'پاکیزہ' بن کر بادشاہت کی خدمت انجام دے سکے۔ اسے 'سان باؤ' یعنی 'تین جواہرات کا خواجہ سرا' کے لقب سے پکارا جاتا تھا۔ بعض روایات کے مطابق یہ لقب بدھ مت کے ایک مذہبی تصور سے ماخوذ تھا۔

ژینگ نے جانشینی کی جنگوں میں صحیح فریق کا ساتھ دیا اور شہنشاہ ژودی (Zhu Di) کا منظورِ نظر بن گیا۔ اگرچہ شہنشاہ نے سوچا کہ پینتیس برس کی عمر میں ژینگ ایسے خطرناک اور غیر معمولی کارناموں کے لیے کچھ زیادہ عمر کا ہو چکا ہے، مگر چینی کہاوت کے مطابق 'بوڑھا گھوڑا راستہ جانتا ہے' اسے عظیم بحری مہم کی قیادت سونپی گئی۔ ژینگ ہی نے 1405ء سے 1433ء تک چین سے افریقہ تک سات عظیم بحری مہمات کی قیادت کی۔ وہ 1418ء میں مالندی پہنچا۔ اس کے پہلے بیڑے میں تین سو سترہ بڑے چینی جہاز (جنکس) اور ستائیس ہزار افراد شامل تھے۔ دنیا نے ایسا منظر کبھی نہیں دیکھا تھا۔

1433ء تک ژینگ ہی سمندروں پر غالب آ چکا تھا، لیکن افسوس کہ وہ اپنے ہی ملک کے اعلیٰ ترین درباریوں یعنی وزرائے شاہی (مندارین) کا اعتماد حاصل نہ کر سکا۔ شہنشاہ ژودی کی وفات کے بعد ان وزیروں نے پالیسی تبدیل کر دی، مالی امداد روک دی اور چین کو بیرونی دنیا سے کاٹ کر داخلی دنیا

کی جانب موڑ دیا۔ اس تبدیلی کے نتیجے میں ہندوستانی سمندر دوبارہ ان اقوام کے لیے کھل گیا، جن کی مہمات اس وقت ہیر و تصور کی جاتیں اگر وہ ژینگ کے کسی ایک جہاز کے چوتھائی حجم کے صرف تین جہاز روانہ کر پاتیں۔

ژینگ کے مشرقی افریقہ پہنچنے سے تین سال قبل ایک غریب یورپی ریاست نے روم کو بلکہ شاید خود کو بھی حیرت میں ڈال دیا، جب اس نے شمالی ساحل پر ایک مسلمان قلعے پر قبضہ کر لیا۔ پرتگال کے کنگ جان نے اپنے عوام کی نظر میں عزت اس وقت حاصل کی جب اس نے قشتالہ کی بڑھتی ہوئی سلطنت کے سامنے پرتگال کی خودمختاری کا دفاع کیا۔ 1415ء میں چھوٹی کشتیوں کی ایک قطار نے پرتگال اور مسلمان بندرگاہ شہر سُویطہ (Ceuta) کے درمیان پندرہ میل کا فاصلہ عبور کیا۔ سُویطہ کے گورنر نے اس خطرے کو سنجیدگی سے نہ لیا اور جو بربر فوج اس کی مدد کو آئی تھی، اسے بھی واپس بھیج دیا۔ 21 اگست 1415ء کو جب سُویطہ پر قبضہ کیا گیا تو کنگ جان کو صرف آٹھ سپاہیوں کا نقصان اٹھانا پڑا۔ مسلمانوں کا قتل عام کیا گیا، مرکزی مسجد کو گرجا گھر میں تبدیل کر دیا گیا اور کنگ جان نے اعلان کیا کہ چونکہ اس نے کفار کے خون سے اپنے ہاتھ دھو لیے ہیں، اس کے تمام گناہ معاف ہو گئے ہیں۔ پوپ نے بھی اس پر مہر تصدیق لگا دی۔ اس نے اسے صلیبی جنگوں کی ایک فتح قرار دیا۔

جان آف گانٹ کی بیٹی اور انگلستان کی ملکہ فلپّا سے پیدا ہونے والے کنگ جان کے تین بیٹوں (ڈوارتے، پیڈرو اور ہنری) نے سویطہ کی جنگ میں شرکت کی اور وہیں نائٹ کا خطاب پایا۔ ہنری کے نجومیوں نے اس کے درخشاں مستقبل کی پیش گوئی کی تھی، مگر چونکہ وہ سب سے چھوٹا تھا اور تخت سے دور، اس لیے شہرت و جاہ کا حصول ایک دور افتادہ خواب دکھائی دیتا تھا۔ کنگ جان نے اسے وہ ذمہ داری سونپی جو اکثر تیسرے بیٹوں کو مصروف رکھنے کے لیے دی جاتی ہے۔ 1319ء میں پوپ جان بائیسویں (John XXII) کا جاری کردہ ایک سرکاری فرمان یا مراسلہ (جسے لاطینی میں bulla کہا جاتا ہے) کے ذریعے 'آرڈر آف کرائسٹ' کے نام سے ایک مذہبی جنگی جماعت قائم کی گئی تھی، جس کا مقصد عیسائیوں کا مسلمانوں سے دفاع کرنا اور دشمن کے علاقوں میں جنگ چھیڑنا تھا۔ ہنری 1417ء میں اس جماعت کا گرینڈ ماسٹر بن گیا۔

ایک صدی تک پرتگال نے ان بلند بانگ دعووں پر کوئی عملی قدم نہیں اٹھایا۔ ریاست اس قدر غریب تھی کہ اپنے سونے کے سکے بنانے کی استطاعت بھی نہیں رکھتی تھی اور مراکش کے سکے استعمال کرتی تھی۔ سونا ہی وہ واحد کرنسی تھی جسے مشرقی دنیا سے قیمتی اشیاء، مصالحہ جات اور ریشمی کپڑے خریدنے کے لیے تاجر قبول کرتے تھے۔ تجارت نے جو کچھ تھوڑا بہت سونا بچا تھا، وہ بھی نکال لیا اور یوں اس کی قیمتیں آسمان کو چھونے لگیں۔ جب فاتحین سویطہ پہنچے تو وہاں کے مکانات کے معیار پر حیران رہ گئے۔

پچیس سال کی عمر میں ہنری نے الگاروکا رخ کیا جسے نائٹ ٹیمپلرز نے مسلمانوں سے چھینا تھا۔ اس کے بعض قریبی سوانح نگاروں کے مطابق ہنری نے تجرد کا عہد بھی کیا تھا۔ وہ تلاش و جستجو کے شوقین جہازرانوں کا سرپرست بن گیا اور انہیں افریقی ساحلوں کی تلاش میں نکلنے کی ترغیب دینے لگا۔ اگر کچھ اور نہ بھی ملے تو کم از کم لوٹ مار اور غلام تو لائے جا سکتے تھے۔ (ارسطو نے یہ نظریہ پیش کیا تھا کہ افریقی فطری طور پر غلام ہوتے ہیں، لیکن ظلم تو ظلم ہی رہتا ہے چاہے اس کے لیے کتنے ہی فلسفے تراشے جائیں)۔ پہلے سیاہ فام غلام 1441ء میں پرتگال پہنچے۔ یہ وہ دور تھا جب طاقت ہی قانون ہوا کرتی تھی۔ یہاں تک کہ ایک مسلم ملک سعودی عرب نے بیسویں صدی تک غلامی کو برقرار رکھا۔ شہزادہ ہنری لوٹے ہوئے مال کا پانچواں حصہ خود رکھتا تھا، جس میں غلام بھی شامل تھے، جبکہ آرڈر آف کرائسٹ کو اکیسواں حصہ دیا جاتا تھا۔ جب غلام سستے ہوتے تھے تو چودہ غلاموں کے بدلے ایک عربی گھوڑا حاصل ہوتا تھا۔ بعد میں یہ تناسب گھٹ کر چھ غلام فی گھوڑا رہ گیا۔

1437ء میں ہنری نے اپنے مشن کے ایک مشکل مرحلے کی تکمیل کی ٹھانی۔ اس نے طنجہ پر حملہ کیا، مگر طنجہ سویطہ نہیں تھا۔ پرتگالیوں کو شکست ہوئی اور ہنری کا چھوٹا بھائی فرنینڈ وقید ہو گیا۔ مراکشیوں نے پیشکش کی کہ شہزادے کے بدلے بندرگاہ خالی کر دی جائے، لیکن ہنری نے سویطہ چھوڑنے کے خیال کو حقارت سے ٹھکرا دیا۔ فرنینڈ و نے بار بار رہائی کی درخواست کی مگر پانچ سال کی اسیری کے بعد وہ قید ہی میں مر گیا۔ اسے شہید کا درجہ دیا گیا۔

اگرچہ مغرب میں کچھ کامیابیاں حاصل ہوئیں، مگر روم تشویش میں مبتلا تھا۔ منگولوں کے ساتھ اتحاد

کے سب خواب بکھر چکے تھے، کیونکہ ہلاکو خان کے وارثوں نے اسلام قبول کرلیا تھا اور اب وہی 'آفت جان' بن چکے تھے، جنہیں عیسائیت مٹانا چاہتی تھی۔ اسپین میں عیسائی فتوحات کی خوشی اس وقت ماند پڑ گئی جب سلطنتِ عثمانیہ نے ابھرنا شروع کیا۔ 1453ء تک یورپ کی دہلیز پر قائم مسیحی تہذیب کا عظیم نشان 'قسطنطنیہ' عثمانیوں کے ہاتھوں فتح ہو چکا تھا۔ عربوں کی مغلوب خلافت کی جگہ اب عثمانی آ گئے تھے جو 'جھوٹے' دین کے نئے اور فاتح علمبردار سمجھے جا رہے تھے۔ بدترین بات یہ تھی کہ بڑی مسیحی طاقتیں کسی نئی صلیبی جنگ میں دلچسپی نہیں رکھتی تھیں۔ صرف اسپین اور پرتگال ہی وہ ممالک تھے جو نئے کارناموں کے امکانات پر سرگرم تھے، اور وہ بھی اس ممکنہ دولت کی تقسیم پر باہم دست و گریباں تھے جو ان کارروائیوں کے ذریعے حاصل ہو سکتی تھی۔

8 جنوری 1455 کو اگرچہ فرمان میں یہ وضاحت موجود تھی کہ یہ اقدام پرتگالیوں کے کہنے پر نہیں اٹھایا گیا، مگر درحقیقت پسِ پردہ انہی کی ترغیب پر پوپ نکولس پنجم نے رومانس پونٹیفیکس کے عنوان سے ایک حکم نامہ (Bull) جاری کیا۔ اس کے تحت بوژادور کے مشرق میں تمام فتوحات کا حق بادشاہ آفیونسو، اس کے وارثوں اور ہنری کو تفویض کیا گیا اور واضح کیا گیا کہ یہ حق کسی اور کو حاصل نہیں ہوگا، یہاں تک کہ عیسائی جہازوں کو بھی، اگر وہ صرف پرتگالی حدود میں مچھلی پکڑنے کا ارادہ رکھتے ہوں، لزبن سے اجازت لینا ضروری تھا۔ آفیونسو کو یہ مشن سونپا گیا جسے 'سچا سپاہیٔ مسیح' کہا گیا:

> ''تمام مسلمان، مشرک اور مسیح دشمن جہاں کہیں بھی موجود ہوں، ان پر چڑھائی کرو، ان کا پیچھا کرو، انہیں قید کرو، زیر کرو اور فنا کردو۔ ان کی تمام سلطنتیں، ریاستیں، نوابی علاقے، مقبوضات، املاک اور ہر قسم کی منقولہ و غیر منقولہ جائداد پر قبضہ کرلو اور انہیں دائمی غلامی میں جکڑ دو۔''

اس حکم نامے کا سب سے قابل غور پہلو وہ عالمی حکمت عملی تھی جو اس کے پیچھے کارفرما تھی۔ اس میں کہا گیا تھا کہ ہنری:

> ''اپنے اس فرض کو بہترین طور پر اس وقت پورا کرے گا جب اس کی کوششوں اور محنت کے نتیجے میں وہ سمندر اس حد تک قابل سفر بن جائے کہ ان 'ہندیوں' تک پہنچا

جا سکے جن کے متعلق کہا جاتا ہے کہ وہ مسیح کے نام کی عبادت کرتے ہیں۔تب وہ ان سے روابط قائم کر کے انہیں مسلمانوں اور ایمان کے دیگر دشمنوں کے خلاف مدد پر آمادہ کر سکے گا اور ساتھ ہی ان بت پرست اقوام کو بھی تابع بنا سکے گا جو ابھی تک 'محمدی فرقے' کے اثر سے محفوظ ہیں۔''

ایک دوسرا پوپائی فرمان 1456 میں جاری کیا گیا، جس میں 'آرڈر آف کرائسٹ' کے دائرۂ اختیار کو 'ہندیوں تک' توسیع دے دی گئی۔نکولس پنجم کی یہ عالمی سوچ آج بھی واشنگٹن، تل ابیب اور دہلی کے بعض تھنک ٹینکوں میں گونجتی سنائی دیتی ہے، جن کا مقصد یہ ہے کہ مسلمان اقوام کو تین طرف سے گھیر لیا جائے۔

آفیونسو نے 12 ہزار مذہبی جنگجوؤں کی نئی فوج تیار کی اور ایک نیا سکہ جاری کیا جسے 'کروزادو' (cruzado) کا نام دیا گیا۔اگرچہ یہ فوج قسطنطنیہ تک نہیں پہنچ سکی، مگر 1458 میں آبنائے جبل الطارق (Straits of Gibraltar) عبور کر کے سیوٹا کے قریب القصر الصغیر (Alcacer Ceguer) پر قبضہ کر لیا۔آفیونسو نے 1471 میں ایک اہم اور فیصلہ کن کاروباری حکمت عملی اپنائی کہ اس نے دریافت وتلاش کے سمندری سفر جو پہلے ریاست کی سرپرستی میں انجام دیے جا رہے تھے، نجی غلام تاجروں کے سپرد کر دیے تاکہ ان سے مالی منفعت حاصل کی جا سکے۔اس کے ساتھ ہی اس نے حکومت کے خزانے، فوجی طاقت اور بحری وسائل کا رخ ایک نئی مذہبی مہم کی طرف موڑ دیا جس کا ہدف مراکش کی سرزمین تھی۔یوں آفیونسو نے ایک طرف منافع بخش تجارتی امکانات کو نجی شعبے کے حوالے کیا اور دوسری طرف اپنے اقتدار کو مذہبی جنگ کے ذریعے وسعت دینے کی کوشش کی۔

اب پرتگال نے ایک واضح سمت اختیار کر لی تھی۔بادشاہ نے اپنے لیے ایک نیا لقب 'آفیونسو دی افریکن' منتخب کیا۔سمندری کارروائیوں سے اس دعوے کو جائز ٹھہرایا گیا۔اسی سال 1471 میں الفارو اسٹوپس نے خط استوا عبور کیا اور ایک جزیرے کو 'ساؤ ٹومے' کا نام دیا۔اس دوران ہسپانیہ بھی بیدار ہونے لگا۔یہ اندیشہ گہرا ہو چکا تھا کہ کہیں پرتگال ہندوستان کے مصالحہ جات تک پہلے نہ پہنچ جائے۔

یہ خیال عام تھا کہ ہندوستان نہ صرف دنیا کی ایک تہائی آبادی کا مسکن ہے، بلکہ مصالحہ جات کی عالمی پیداوار کا سب سے بڑا مرکز بھی ہے۔ جنوبی ہند کی بندرگاہ کالی کٹ میں مقیم عرب تاجر اس قیمتی تجارت پر مکمل طور پر قابض تھے اور وہی جہاز اکثر استعمال کیے جاتے تھے جن کے ذریعے حجاج کرام کو مکہ معظّمہ لے جایا جاتا تھا۔ کالی کٹ سے یورپ تک مصالحہ جات کی ترسیل کے اگلے مرحلے پر وینس کے تاجر غالب تھے، جنہوں نے اس راستے پر اجارہ داری قائم کر رکھی تھی۔ کالی کٹ میں جو مصالحہ ایک 'ڈوکاٹ' میں دستیاب ہوتا وہی وینس میں 60 سے 100 ڈوکاٹ میں فروخت ہوتا تھا اور مغربی یورپ پہنچتے پہنچتے اس کی قیمت کئی گنا بڑھ جاتی تھی۔

ان مصالحہ جات میں سب سے نمایاں 'کالی مرچ' تھی، جو اس دور کی غذاؤں میں نہ صرف ذائقہ بڑھانے کا ذریعہ تھی، بلکہ صحت بخش اور محافظ کی حیثیت رکھتی تھی۔ اسے نمک کے ساتھ ملا کر گوشت پر مل دیا جاتا، تاکہ سخت سردیوں یا طویل سمندری سفر کے دوران گوشت خراب نہ ہو۔ وقت کے ساتھ مصالحہ جات محض ذائقے تک محدود نہ رہے، بلکہ طب، زیبائش اور طاعون جیسے موذی امراض سے بچاؤ کے لیے بھی ناگزیر بن چکے تھے۔

1478 میں مغربی افریقہ کے ساحل پر پرتگالیوں نے ہسپانوی بیڑے کو شکست دی، جس کے بعد ان دونوں پڑوسی ممالک کے درمیان نئی دنیاؤں کی تلاش اور قبضے کی دوڑ مزید تیز ہو گئی۔ آخرکار یہ تنازعہ جون 1494 میں روم کی مداخلت سے 'معاہدۂ توردیسیلاس' کے تحت حل کیا گیا۔ اس معاہدے میں دنیا کو دو حصوں میں بانٹ دیا گیا۔ ایک لکیر کھینچی گئی جسے 'پوپ کی لکیر' کہا جاتا ہے، اور اس کے مطابق مشرقی علاقہ جات پرتگال کے حصے میں آیا جبکہ مغربی دنیا میں کولمبس کے دریافت کردہ راستے پر سفر اور قبضہ کرنے کا حق اسپین کو دے دیا گیا۔

1496 میں مینوئل نے لزبن کے تخت پر بیٹھتے ہی سب سے پہلے ملک کے داخلی حالات کی طرف توجہ دی۔ اس وقت تقریباً ایک لاکھ یہودی اسپین کی مذہبی عدالت، یعنی انکویزیشن سے بچنے کے لیے پرتگال میں پناہ لے چکے تھے۔ مسلمان بھی بڑی تعداد میں وہاں آباد تھے۔ مینوئل نے حکم دیا کہ دس ماہ کے اندر اندر یہودیوں اور مسلمانوں کو یا تو ملک چھوڑنا ہوگا یا عیسائیت قبول کرنی ہوگی۔

مگر یہ فیصلہ صرف ظاہری طور پر سیدھا سادہ تھا، حقیقت میں معاملہ بہت پیچیدہ تھا۔ قانون کے مطابق پندرہ سال سے کم عمر کے تمام بچوں کو لازماً بپتسمہ دیا جانا تھا، یعنی انہیں زبردستی عیسائی بنایا جانا تھا۔ ایسے میں والدین کو ایک دردناک فیصلہ کرنا پڑا کہ یا تو اپنے ایمان کو بچائیں یا اپنی اولاد کو۔

7 جولائی 1497 کو واسکوڈی گاما نے رات بھر عبادت میں گزاری، اور وہ بھی اسی گرجا میں جو ہنری نے تعمیر کروایا تھا۔ اگلی صبح اس کی قیادت میں تمام مہم جوؤں نے یہ پختہ عہد کیا کہ وہ اس سفر میں ناکام ہونے کے بجائے جان دینا پسند کریں گے۔ سب لوگ ننگے پاؤں، سادہ لباس پہنے ہوئے، ہاتھوں میں شمعیں لیے گھٹنوں کے بل بیٹھے اور رب سے مغفرت طلب کرنے لگے۔ پاپائے روم کا فرمان مقدس بلند آواز میں پڑھ کر سنایا گیا۔ کسی نامعلوم وجہ کے تحت واسکوڈی گاما نے جو سرخ کپڑے پر طلائی صلیب لٹکائے نہایت شاندار انداز میں تھا یہ نذر مانی کہ جب تک وہ کالی کٹ سے واپس نہ آ جائے، اپنی داڑھی نہیں منڈوائے گا۔

سان گیبریئل، سان رافائیل اور بیریو یہ تینوں جہاز جو 'آرڈر آف کرائسٹ' کے تحت روانہ کیے گئے تھے، اپنے بادبانوں پر ایک گہرے سرخ رنگ کی صلیب کا نشان لیے ہوئے لزبن کی بندرگاہ سے روانہ ہوئے۔ یہ صلیب 'آرڈر آف کرائسٹ' کی مذہبی اور فوجی علامت تھی، جو صلیبی جذبے اور مسیحی مشن کی نمائندگی کرتی تھی۔ ان کے جذبے کا عالم یہ تھا کہ وہ 4 ہزار میل سے زیادہ سمندر عبور کر کے آخر کار خشکی تک پہنچنے میں کامیاب ہو گئے۔

ان عرب کافروں سے ان کا پہلا سامنا موزمبیق کے مقام پر ہوا، جو ایک چھوٹی بندرگاہ تھی اور بعد میں ایک پورے ملک کا نام بنی۔ اس بندرگاہ کا گورنر ریاستِ کلوا کا وفادار تھا۔ اس نے گمان کیا کہ یہ سفید فام لوگ تجارت کی غرض سے آئے ہیں، اور اس نے یہ بھی سمجھا کہ شاید یہ ترک ہوں۔ جب وہ جہاز پر آیا اور نہایت ادب سے ان سے قرآن کا نسخہ دیکھنے کی درخواست کی تو پرتگالیوں نے فوری طور پر چالاکی سے کوئی بہانہ گڑھ لیا اور تھوڑی ہی دیر میں وہاں سے روانہ ہو گئے۔ ایسا نرم رویہ ان کی طرف سے کم ہی دیکھنے کو ملتا ہے۔

اس سفر کی پرتگالی روداد سپاہی اور جہاز پر موجود سفرنامہ نگار الوارو ویلیو نے تفصیل سے قلم بند کی ہے۔

دوسری طرف ہندوستانی بیانیہ نہایت مختصر اور بے اعتنائی سے عبارت ہے ... وہ آئے، دیکھا اور تجارت کیے بغیر چلے گئے۔ ویلیو کی تحریر میں اس مقدس جنگ کی بھیانک روح پوری شدت سے جھلکتی ہے۔ واسکوڈی گاما مسلمانوں کو اذیت پہنچانے میں خوشی محسوس کرتا تھا اور ان کے جسموں پر کھولتی ہوئی سور کی چربی ڈال کر تشدد کرتا تھا۔

یہ ایک عجیب تضاد تھا کہ وہ خود ہندوستان ایک مسلمان جہاز ران کی رہنمائی میں پہنچا، جسے بعد میں اس کے ہم مذہبوں نے راستہ دکھانے کے جرم میں بددعا دی۔ احمد ابن ماجد اس راستے پر اس قدر مانوس تھا کہ وہ 'گجرات کا مورِ' کہلاتا تھا۔ وہ ایک غیر معمولی ملاح، ماہرِ فلکیات اور شاعر تھا۔ ممکن ہے وہ سان گیبریئل پر اس لیے سوار ہوا ہو کہ اسے وہاں کی شراب پسند آ گئی تھی، جیسا کہ اس نے خود اعتراف کیا۔

اس نے جہازوں کو دوبارہ شمالی نصف کرے میں پہنچایا (جہاں پہنچنے پر نعرۂ شکر بلند ہوا) اور 'سیف الطویل' نامی مقام سے مشرق کی سمت روانہ ہوا اور صرف 23 دن میں کالی کٹ پہنچ گیا۔ واپسی میں یہی فاصلہ واسکوڈی گاما نے تین ماہ میں طے کیا۔ 18 مئی 1498 کو وہ تاریخ کی طویل ترین سمندری مہم کے بعد کالی کٹ پہنچا۔

راجہ یعنی زامورین سے ملاقات کے راستے میں واسکوڈی گاما اس غلط فہمی میں ایک مندر پر رکا کہ یہ کسی انوکھے عیسائی فرقے کا گرجا ہے۔ غالباً اس نے ماں اور بچے کی مورتی کو حضرت مریم اور عیسیٰ کا مجسمہ سمجھا۔ دراصل وہ کرشن اور دیوکی کے سامنے سجدہ ریز ہوا تھا۔

جب واسکوڈی گاما راجہ مانا وکرما سے ملا تو راجہ نیم دراز ایک پلنگ پر لیٹا تھا، بدن ننگا، پان چباتا ہوا اور سونے کے پیالے میں تھوکتا جا رہا تھا، پیالہ ایک درباری نے تھام رکھا تھا۔ جب واسکو نے غسل کے طشت، مونگا، سرخ ٹوپیاں، شہد کے مرتبان تحفے میں پیش کیے تو راجہ نے انہیں حقارت سے دیکھ کر منہ پھیر لیا۔ پرتگالی کمانڈر کی کنجوسی اس کی جان لے سکتی تھی۔ اگلے دن پرتگالیوں کو گرفتار کر لیا گیا اور صرف اس وقت رہا کیا گیا جب چار نائیر اشراف نے واسکو کی جان کی ضمانت دی۔ کالی کٹ کو واسکوڈی گاما کی زخمی انا کی قیمت چکانی پڑی۔

لزبن واپسی پر واسکوڈی گاما کا شاندار استقبال کیا گیا۔ اسے 20 ہزار سونے کے ’کروزادو‘ بطور انعام دیے گئے۔ بادشاہ مینوئل نے خود کو ’گنی کا حکمران، فتوحات اور جہاز رانی کا مالک، اور حبشہ، عرب، فارس اور ہندوستان کی تجارت پر قابض فرمانروا‘ جیسے خطابات دیے۔ اس نے فرڈیننڈ اور ازابیلا کو لکھا کہ ہندوستان میں عیسائی موجود ہیں اگرچہ ان کا ایمان کمزور ہے، لیکن ان کو مسلمان دشمنوں کے خلاف استعمال کیا جا سکتا ہے۔ اس نے تجویز دی کہ اب اس مقدس جنگ کو پہلے سے زیادہ جوش و خروش سے جاری رکھنا چاہیے۔

8 مارچ 1500 کو 13 جہازوں پر مشتمل ایک پرتگالی بیڑا جس میں 1200 سپاہی شامل تھے (جن میں جرمن اور فلیمش توپچی بھی تھے)، نوجوان اشرافیہ پیڈرو آلواریس کابرال کی قیادت میں ہندوستان کی طرف روانہ ہوا۔ یہ توپوں کے زور پر سفارت کاری (gunboat diplomacy) کی پہلی عملی مثال تھی۔

اس وقت پر مانا وکرما تخت نشین تھا اور اس نے مقامی روایت کے مطابق لنگی زیب تن کر رکھی تھی۔ پرتگالیوں کی جانب سے اسے دو مطالبات پیش کیے گئے۔ پہلا یہ کہ دوستی اور تعاون کا ایک معاہدہ ہو جسے اس نے منظور کر لیا۔ دوسرا یہ کہ تمام مسلمانوں کو ملک بدر کرنے کا حکم دیا جائے، جسے اس نے نہایت سختی اور دوٹوک انداز میں مسترد کر دیا۔ اس انکار کے فوراً بعد کشیدگی بڑھ گئی۔ بندرگاہ میں کابرال نے ایک عرب تجارتی جہاز پر قبضہ کر لیا، جس پر ردعمل کے طور پر خشکی پر موجود عرب تاجروں نے پرتگالی تجارتی مرکز پر حملہ کر دیا۔ اس کے جواب میں یورپی توپیں دھاڑنے لگیں۔ کابرال نے جوابی کارروائی کے طور پر دس تجارتی جہاز ضبط کر لیے، اور ظلم کی انتہا کرتے ہوئے ان کے عملے کو عوام کے سامنے زندہ جلا دیا۔ (ان جہازوں سے حاصل ہونے والے سامان میں تین ہاتھی بھی شامل تھے جنہیں پرتگالی سپاہیوں نے بعد میں کھا لیا)۔

1502 میں واسکوڈی گاما ایک بار پھر روانہ ہوا، اس بار 25 جہازوں اور ’کئی عمدہ توپوں‘ کے ساتھ تھا۔ راستے میں اس نے حاجیوں کا ایک جہاز روکا اور اس میں سوار مکہ کی جانب رخت سفر سات سو مسلمانوں کو زندہ جلا دیا۔ کالی کٹ کر توپوں کے شدید حملے سے تہس نہس کر دیا گیا۔ قیدیوں کے

ہاتھ، کان اور ناک کاٹ کر انہیں جلوس کی صورت میں گھمایا گیا۔ اُن کے پاؤں باندھ دیے گئے، دانت توڑ دیے گئے، پھر انہیں ایک کشتی میں ڈال کر آگ لگا دی گئی۔ مانا وکرما کو پیغام بھیجا گیا کہ وہ ان انسانوں کے گوشت سے 'کری' پکا سکتا ہے۔ جب ایک برہمن مذاکرات کے لیے بھیجا گیا تو اس کے ہونٹ کاٹ دیے گئے اور اس کے کانوں کی جگہ کتے کے کان لگا دیے گئے۔

1503 تک پرتگالیوں نے خود کو اتنا مضبوط سمجھ لیا کہ ایک پڑوسی ریاست کوچین میں پانچ جہازوں کے ساتھ مستقل اڈہ قائم کر لیا۔ یہ ریاست یا تو دوستی کی آڑ میں یا پھر دباؤ کے ذریعے زیرِ نگیں کی گئی تھی۔ مسلمان دنیا میں اس نئی، ظالمانہ اور مہلک طاقت پر ردِ عمل ناگزیر تھا۔ مصر کے سلطان قانصوہ غوری نے یروشلم میں آباد عیسائیوں کے خلاف انتقامی کارروائی کی دھمکی دی۔ کوہ سینا پر واقع سینٹ کیتھرین کی خانقاہ کے پیشوا روم اور لزبن گئے، تاکہ مفاہمت کی کوئی صورت نکل سکے، لیکن مینوئل نے صاف کہا کہ پرتگال تو صرف اپنا 'فرض' ادا کر رہا ہے۔ اور اس 'فرض' میں مکہ کو ویران کرنا اور مدینہ میں 'جھوٹے نبی' کے مزار کو مٹا دینا بھی شامل تھا۔

مسلمان سلاطین عمومی طور پر سمندری جنگوں کو کمتر سمجھتے تھے۔ یہی اکثر بادشاہوں کی سوچ تھی اور انہیں محض 'ہٹی والوں کی لڑائیاں' کہا کرتے تھے۔ لیکن جب عرب سرزمین خطرے میں پڑی تو سلطنت عثمانیہ بالآخر میدان جنگ میں اتر آئی۔

1507ء میں ایڈمرل امیر حسین نے بارہ جہازوں پر مشتمل ایک قافلہ لے کر گجرات کے بندرگاہی شہر دیو (Diu) کا رخ کیا، جس میں 1500 سپاہی اور توپخانے شامل تھے۔ دیو کا گورنر ملک ایاز ایک غیر معمولی پس منظر کا حامل شخص تھا۔ وہ روس میں پیدا ہوا، غلام بنا کر بیچا گیا اور بعد ازاں اسلام قبول کر کے ہندوستان پہنچا، جہاں وہ دربار گجرات کی خدمت میں نمایاں مقام تک پہنچا۔

ملک ایاز نے خفیہ طور پر پرتگالی کمانڈر الفرونسو ڈی المیڈا (Almeida) سے شرائط قبول کر لی تھیں۔ 2 فروری 1509 کو جب امیر حسین کی قیادت میں عثمانی بیڑے نے دیو پر حملہ کیا تو ملک ایاز کا ذاتی بحری بیڑہ محض تماشائی بنا رہا، جبکہ المیڈا کے اٹھارہ جہاز جن پر چالیس توپیں نصب تھیں، سمندر میں بلند بہاؤ پر چلتے ہوئے امیر حسین کے جہازوں پر بار بار حملہ آور ہوئے اور انہیں نیست و نابود کر دیا۔

امیر حسین نے قسطنطنیہ کو رپورٹ بھیجی کہ اسے ایک ایسے شخص نے دھوکہ دیا جو پہلے عیسائی تھا۔

اس وقت تک پرتگالی بادشاہ مینوئل اپنے سلطنتی خطابات میں ایک اور عنوان 'ایستادو دا انڈیا' (Estado da India) یعنی ہندوستانی سلطنت کا اضافہ کر چکا تھا۔ مینوئل جو کچھ صرف القاب کی صورت میں ظاہر کرتا تھا، الفونسو ڈی البوکرک نے اسے حقیقت میں کر دکھایا۔ پرتگال کی دلچسپی زمینی سلطنت کے بجائے ایک سمندری سلطنت کے قیام میں تھی، اور اس وقت اس کی فوری اسٹریٹجک ضرورت مغربی ہندوستان کے اس جزیرے سے وابستہ تھی جو کالی کٹ اور گجرات کے درمیان واقع تھا۔

البوکرک بھی اپنے تمام پیش روؤں کی طرح مسلمان کے خون کا پیاسا تھا۔ اگرچہ مؤرخین اسے عموماً 'عظیم' کے لقب سے یاد کرتے ہیں، مگر حقیقت یہ ہے کہ وہ واحد پرتگالی کیپٹن جنرل تھا جسے کالی کٹ میں شکست کا سامنا کرنا پڑا۔ تاہم، اس عسکری ناکامی کا ازالہ اُس نے 1510ء میں گوا پر قبضے کی صورت میں کیا۔ گوا ایک اہم جزیرہ تھا جو طوفانی موسموں میں بھی محفوظ بندرگاہ مہیا کرتا تھا، اور اسی لیے بحری لحاظ سے بے حد قیمتی سمجھا جاتا تھا۔ اُس وقت یہ علاقہ بیجاپور کی مسلم سلطنت کا حصہ تھا۔ پرتگالیوں کو ایک بار پھر خوش نصیبی حاصل ہوئی، کیونکہ گوا کے بیشتر مقامی سپاہی کسی اور محاذ پر لڑنے کے لیے روانہ ہو چکے تھے۔

گوا پر قبضے کے بعد البوکرک نے اپنے بادشاہ مینوئل کو ایک خط لکھا جس میں اس نے گوا میں چار روزہ قتل عام کی تفصیل بیان کی، جس میں چھ ہزار مسلمان مارے گئے تھے۔ خط میں لکھا تھا:

> ''ہم نے جہاں بھی مسلمانوں کو پایا، ان میں سے کسی ایک کو بھی زندہ نہیں چھوڑا، ہم نے انہیں مساجد میں بھر دیا اور پھر آگ لگا دی... گوا نہایت اہم اور عظیم جگہ ہے اور اب تک مسلمانوں کی آپ کے خلاف بدعہدی اور شرارت کا کوئی بدلہ نہیں لیا گیا تھا۔''

البوکرک نے گوا میں مسلمانوں کو بسنے کی اجازت نہ دینے کا حکم جاری کیا اور ایک پرتگالی افسر روڈریگس ڈیاز (Rodrigues Diaz) کو اس جرم میں پھانسی دے دی کہ اس نے ایک مسلمان قیدی عورت سے تعلق قائم کیا تھا۔ اس کے برعکس ایک اور فیصلہ یہ تھا کہ پرتگالی مردوں کو مقامی عورتوں سے شادی کی اجازت دے دی گئی، بشرطیکہ وہ 'کچھ حد تک سفید فام' ہوں، جس کے دوررس

نتائج بھی نکلے۔ اس پالیسی سے ہندوستان کے تنوع میں ایک نئی پرتگالی و ہندوستانی نسل نے جنم لیا۔

البوکرک نے اپنی زندگی کے آخری برسوں میں ایک عظیم شخصی اور قومی خواب 'مکہ اور مدینہ پر قبضہ اور تباہی' کی تکمیل کی کوشش کی۔ اس نے عدن پر حملہ کیا، مگر شدید جانی و مالی نقصان کے ساتھ پسپا ہونا پڑا۔ وہ 1515ء میں 63 برس کی عمر میں وفات پا گیا۔ یوں ہندوستان میں یورپی نوآبادیاتی عمل کا آغاز گوا سے ہوا، جو بابر کے ہندوستان میں داخل ہونے اور مغلیہ سلطنت کے قیام سے سولہ سال قبل کا واقعہ ہے۔ پرتگالی وجود ہندوستان میں برطانوی راج سے بھی زیادہ عرصہ برقرار رہا، لیکن یہ محض شماریاتی برتری تھی۔ پرتگال نہ تو غیر مسلم ہندوستانیوں کے ساتھ کوئی مؤثر اسٹریٹجک اتحاد قائم کر سکا نہ ہی وہ عثمانی طاقت کو محدود کر پایا، جو ہندوستان اور یورپ کے درمیان پھیلی ہوئی تھی۔

پرتگالی اثر و رسوخ بالآخر صرف گوا تک محدود رہ گیا، جبکہ مغلوں نے تاریخ کی ایک عظیم الشان سلطنت کی بنیاد رکھ دی۔ ہندوستان میں سات سو سالہ مسلم اقتدار کا خاتمہ ایک اور عیسائی طاقت برطانیہ کے ہاتھوں ہوا، بالکل ویسے ہی جیسے مسلمانوں نے اسپین پر تقریباً سات صدیوں تک حکمرانی کی تھی۔

برصغیر میں برطانوی موجودگی کی ابتدا محض تجارتی دلچسپی سے ہوئی تھی، مگر یہ جلد ہی طاقت اور تصادم کی شکل اختیار کر گئی۔ برطانیہ یا کم از کم ایسٹ انڈیا کمپنی نے ہندوستان میں پہلا باقاعدہ جنگی اعلان مغل بادشاہ اورنگزیب کے دور میں کیا، جو چھ عظیم مغل حکمرانوں میں آخری تھے۔ 1686ء میں لندن میں قائم ایسٹ انڈیا کمپنی کے ایک جارح مزاج گورنر سر جوزایا چائلڈ (Sir Josiah Child) نے یہ سمجھا کہ وہ جنگی بحری جہازوں کی مدد سے بنگال میں تجارتی مراعات حاصل کر سکتا ہے۔ ہوسکتا ہے کہ اسے سورت میں کمپنی کے ایک اہلکار نے یہ حوصلہ دیا ہو جو مغل بحریہ کے بارے میں اتنا پراعتماد تھا کہ وہ یہاں تک دعویٰ کرتا تھا کہ 'میں اپنی پاد سے مغلوں کا بحری بیڑہ اُڑا سکتا ہوں'، مگر ایسٹ انڈیا کمپنی کے لیے مغل سلطنت سے پہلی مڈبھیڑ کا یہ باب کچھ زیادہ خوشگوار ثابت نہیں ہوا۔

اس پورے کھیل کی بنیاد ایک بار پھر مرچ پر تھی۔ ڈچ تاجروں نے اچانک کالی مرچ کی قیمت تین شلنگ فی پاؤنڈ سے بڑھا کر آٹھ شلنگ کر دی، جس سے یورپ میں ہلچل مچ گئی۔ 24 ستمبر 1599 کو لندن کے 80 تاجروں نے ایک تجارتی انجمن قائم کی، 30 ہزار پاؤنڈ سرمایہ جمع کیا اور مشرق میں

تجارت کے لیے شاہی فرمان حاصل کرنے کی کوشش کی۔ یہ اجازت نامہ 1600 میں جیمز اول کی طرف سے جاری ہوا۔ بعدازاں سرمایہ کاروں کی تعداد بڑھ کر 217 ہوگئی اور کل سرمایہ 68 ہزار پاؤنڈ سے تجاوز کر گیا۔

1608ء میں ایسٹ انڈیا کمپنی کا پہلا جہاز ہندوستان پہنچا۔ برطانوی تجارتی دلچسپی اب کھل کر ظاہر ہو چکی تھی۔ مغل دربار میں برطانیہ کی پہلی باضابطہ نمائندگی ولیم ہاکنس (William Hawkins) نے کی جو ایک تجربہ کار سفارت کار تھے اور فارسی و ترکی زبان پر عبور رکھتے تھے۔ وہ 28 اگست 1608 کو ہندوستان پہنچے اور 1609 میں کنگ جیمز کا خط لے کر آگرہ روانہ ہوئے۔ شہنشاہ جہانگیر ان کی شخصیت سے بظاہر خوش ہوئے اور انہیں 'انگریز خان' کا لقب دیا، مگر انہیں اتنا اہم نہیں سمجھا کہ اپنی سرکاری خودنوشت 'تزکِ جہانگیری' میں ان کا ذکر کرتے۔

ولیم ہاکنس 1611 میں ہندوستان سے شدید مایوس اور یسوعی مشنریوں سے خفا ہو کر روانہ ہو گئے، جنہیں وہ اپنی سفارتی ناکامی کا ذمہ دار سمجھتے تھے۔ درحقیقت یورپی اقوام اکبر کے زمانے سے ہی مغل دربار سے مخصوص تجارتی حقوق حاصل کرنے کی کوشش کر رہی تھیں اور ان کوششوں کی ناکامی نے باہمی رقابت کو مزید تیز کر دیا تھا۔

تجارتی جنگ محض استعارہ نہیں تھی، بلکہ حقیقت تھی۔ جہانگیر کے تاریخی ریکارڈ میں انگریزوں کا پہلا باضابطہ ذکر 1612ء میں ایک بحری جنگ کے تناظر میں ملتا ہے جس میں برطانوی بحریہ نے پرتگالیوں کو شکست دی تھی۔ اگرچہ مغل سلاطین کو سمندر سے کوئی خاص دلچسپی نہیں تھی، لیکن ان کی بحری پالیسی کا محور صرف حجاجِ کرام کی سلامتی تھا۔ تاہم جہانگیر برطانوی بحری صلاحیت سے ضرور متاثر ہوئے۔

اسی سال 1612ء میں مغل بادشاہ نے ایک شاہی فرمان کے ذریعے ایسٹ انڈیا کمپنی کو سورت میں اپنا پہلا تجارتی مرکز قائم کرنے کی اجازت دی۔ بعدازاں کمپنی نے وہاں ایک فیکٹری بنائی اور احمد آباد، آگرہ اور اجمیر میں اپنی شاخیں قائم کر لیں۔ اس طرح برطانیہ کا ہندوستان میں قدم جمانے کا عمل باقاعدہ طور پر شروع ہوا۔

بادشاہ اور کمپنی کی جانب سے دوسرا مشن 1615 میں ہندوستان پہنچا۔ سر تھامس رو جو آکسفرڈ اور مڈل ٹیمپل کے تعلیم یافتہ تھے، ایمیزون کا سفر کر چکے تھے، جس پر انہیں نائٹ کا خطاب ملا۔ وہ بڑے سلیقے سے تراشی گئی مونچھیں اور وین ڈائک داڑھی رکھتے تھے، مگر طبیعت میں کھنچاؤ اور غرور نمایاں تھا۔ وہ مغلوں کو خود سے کمتر سمجھتے تھے۔ جہانگیر نے ان کے تکبر کو یہ سوال پوچھ کر ہوا میں اُڑا دیا کہ اگر برطانیہ کا بادشاہ واقعی اتنا عظیم ہے تو اس کے تحفے اتنے معمولی کیوں ہیں؟ سر تھامس نے حتی الوسیع جواب دینے کی کوشش کی اور کہا کہ چونکہ بادشاہ سلامت کو کسی چیز کی کمی نہیں اس لیے انہیں دیا گیا کوئی بھی تحفہ لازماً بے قدر ہی ہوگا۔

سر تھامس کو ہندوستان اسی قدر ناپسند تھا جیسے انہیں ترکی ناپسند تھا۔ انہوں نے کمپنی کو مشورہ دیا کہ ہندوستان میں خاموشی اور سمندری تجارت ہی پر اکتفا کرے اور فوجی چھاؤنیوں اور جنگوں کے بجائے صرف منافع کو ہدف بنایا جائے۔ اس اعتبار سے سر تھامس ایک منفرد شخصیت ہیں کیونکہ وہ نہ صرف ترکی بلکہ ہندوستان کے بارے میں بھی غلط ثابت ہوئے۔

1623 میں جب ڈچوں نے امبوینا میں انگریزوں کا قتلِ عام کیا اور انہیں انڈونیشیا سے نکال باہر کیا تو ایسٹ انڈیا کمپنی کا رجحان مزید ہندوستان کی جانب ہو گیا۔ ابتدا ہی سے منافع اچھا رہا اور سرمایہ کاری پر سالانہ پچیس فیصد منافع حاصل ہوتا تھا۔ جب یہ منافع بڑھنے لگا تو اسے بچانے کے لیے قلعے ناگزیر ہو گئے۔ 1640 میں کمپنی نے مشرقی ساحل کی طرف پیش قدمی کی، مدراس حاصل کیا اور وہاں فورٹ سینٹ جارج تعمیر کیا۔

1661 میں جب چارلس دوم نے پرتگالی شہزادی کیتھرین آف براگانزا سے شادی کی تو جہیز میں ایک دور افتادہ جزیرہ ملا، جسے پرتگالی 'بمبئی' کہتے تھے۔ 1668 میں تاجِ برطانیہ نے بمبئی کو کرایے پر دے دیا۔ یہ باضابطہ طور پر کینٹ کے علاقے ایسٹ گرین وچ کے شاہی املاک میں شامل تھا۔ کرایہ دس پاؤنڈ مالیت کے سونے کی صورت میں سالانہ ادا کیا جانا تھا اور یہ معاہدہ 'ہمیشہ' کے لیے تھا۔ یہ 'ہمیشہ' 1739 میں ختم ہو گیا۔

1650 میں شہزادہ شجاع جو شاہ جہاں کے بیٹے اور بنگال کے گورنر تھے، انہوں نے کمپنی کو تین ہزار

روپے یکمشت ادائیگی کے عوض تجارت کی اجازت دی۔ پہلا تجارتی مرکز ہگلی میں قائم ہوا۔ دریا کے مغربی کنارے پر یورپ کا سا منظر بننے لگا۔ ڈچ چنسورہ آ گئے، فرانسیسی نیچے بہتے ہوئے چندرنگر میں جا بسے اور ڈنمارک والوں نے سیرام پور میں اپنا مرکز قائم کیا۔

معاملات شاید حد سے زیادہ اچھے چلنے لگے تھے۔ ملازمین پہلو بہ پہلو اپنے ذاتی سودوں سے کروڑ پتی بننے لگے اور وہ کاروبار جو کمپنی کو ملنا چاہیے تھا، چپکے سے اپنی جیبوں میں ڈالنے لگے۔ ایسے ہی خوش نصیب تاجروں میں ایک امریکی بھی تھا، جو مدراس کے دفتر میں تعینات تھا۔ ایلیہو ییل کا نام اب زیادہ تر اس یونیورسٹی کے حوالے سے جانا جاتا ہے، جو اس نے کنیکٹی کٹ میں مالی امداد سے قائم کی، بجائے اس نجی تجارت کے جو اُس نے سیام اور کانٹن کے ساتھ کمپنی کے مفادات کو نظرانداز کرتے ہوئے کی۔ تجارت نے کمپنی کو ہندوستان تک پہنچایا لیکن منافع نے اس کی خواہشات کا رخ بدل دیا۔

1687 میں سر جوزایا چائلڈ نے لندن سے مدراس کے گورنر کو لکھا کہ نیا چارٹر برصغیر میں ہمیشہ کے لیے برطانوی اقتدار کی بنیاد رکھنے کے لیے جاری کیا جا رہا ہے۔ اُس نے دلیل دی کہ حالات کمپنی کو مجبور کر رہے ہیں کہ وہ برصغیر میں ایک خودمختار ریاست قائم کرے۔ چائلڈ دراصل سلطنت برطانیہ کا فکری معمار تھا۔ وہ اس خیال کا پختہ قائل تھا کہ ہندوستان کو کمپنی کی ضرورت برطانیہ سے زیادہ ہے۔ اسی یقین کے تحت اس نے بنگال میں تجارتی حقوق پر مذاکرات کی ناکامی کے بعد مغل سلطنت کے خلاف جنگ کا اعلان کر دیا۔

ہگلی میں کمپنی کا نمائندہ جاب چارناک زیادہ محتاط تھا۔ اس کے پاس صرف 380 سپاہی اور دو جہاز تھے، اس لیے اس نے مغل گورنر قاسم خان کے خلاف معمولی جھڑپوں سے زیادہ کسی خطرناک کارروائی کا ارادہ نہیں کیا۔ 1689 میں مغل بحریہ نے بمبئی پر قبضہ کر لیا اور اگلے ہی سال کمپنی کے اہلکاروں کو اورنگ زیب سے ذلت آمیز معافی طلب کرنی پڑی۔ مغل شہنشاہ نے انہیں بمبئی اور ہگلی دونوں جگہوں پر تجارت کی اجازت دوبارہ دی، لیکن یہ اجازت ایک تاوان اور آئندہ اچھے برتاؤ کے وعدے کے بعد دی گئی۔

اس بحران نے جاب چارناک کو مجبور کیا کہ وہ ہگلی کے مقابلے میں کوئی زیادہ محفوظ جگہ تلاش کرے۔ اس نے ایک گاؤں سوتانوتی کو منتخب کیا جو ایک طرف دلدلی زمین اور دوسری طرف دریا سے قدرتی طور پر محفوظ تھا۔ اگست 1690 میں اس نے وہیں اپنا جہاز لنگر انداز کیا اور کچھ جدوجہد کے بعد اسے سوتانوتی، گووند پور اور کلکتہ تین متصل گاؤں کی زمینداری حاصل ہوگئی۔ ان گاؤوں کے لیے سالانہ بارہ ہزار روپے کرایہ مقرر رہا۔ یہاں کمپنی نے اپنا کارخانہ قائم کیا۔ ایک قلعہ بھی بنایا گیا، جس کا نام ولیم آف اورنج کے نام پر رکھا گیا۔ یوں ایک نیا دارالحکومت وجود میں آیا۔

جیسا کہ رڈیارڈ کپلنگ لکھتے ہیں:

کلکتہ ایک اتفاقی شہر تھا
اتفاق سے بسایا گیا،
دلدلی زمین پر تعمیر کیا گیا
محل، کیچڑ، جھونپڑیاں، فقر اور فخر
سب ایک ساتھ
اور آج بھی کلکتہ میں
بستے ہیں فخر اور فقر ایک ساتھ

1717 میں کلکتہ میں کمپنی کے سربراہ جان سرمن اپنے دوست آرمینیائی تاجر اور مترجم خواجہ اسرائیل سرحدی کے ہمراہ دہلی میں شہنشاہ فرخ سیر کے دربار پہنچے۔ شہنشاہ نے اپنا بچپن بنگال میں گزارا تھا جب اس کے والد مغل گورنر کی حیثیت سے وہاں تعینات تھے اور اس کے بچپن کے کھلونے انگلستان سے آیا کرتے تھے۔ سرمن اب بڑے لوگوں کے لیے 'کھلونے' لے کر آیا تھا۔ درباریوں کو دی گئی بڑی رشوتیں اور شہنشاہ کے نازک جسمانی حصوں کا طبی علاج شاید مفید ثابت ہوا۔ اس کے باوجود مذاکرات آسان نہ تھے اور معاہدہ صرف اس وقت طے پایا جب انگریزوں نے سورَت سے دستبردار ہونے کی دھمکی دی۔ ایک صدی کی عرضیوں اور ایک ناکام طاقت آزمائی کے بعد آخرکار کمپنی کامیاب ہوئی۔

1716 کے آخری دن شہنشاہ نے ایک فرمان پر دستخط کیے جسے برطانوی 'ہندوستان کا میگنا کارٹا' کہتے ہیں۔ مغل دربار نے بھی تسلیم کیا کہ اس نوعیت کا امتیاز کسی بھی یورپی قوم کو اس سے پہلے کبھی نہیں دیا گیا تھا۔ کمپنی کو شہنشاہ کی جانب سے باقاعدہ اجازت نامہ حاصل ہوا اور اب وہ اپنے مفروضہ حقوق کے دفاع میں قانونی طور پر کارروائی کر سکتی تھی۔ اسے بنگال میں تجارت، زمین خریدنے اور جہاں چاہے سکونت اختیار کرنے کا حق حاصل ہو گیا اور اس کے بدلے صرف تین ہزار روپے سالانہ ادا کرنے تھے۔ بالکل چالیس سال بعد رابرٹ کلائیو نے اسی فرمان کو بنیاد بنا کر پلاسی کی طرف اپنی پیش قدمی کو قانونی جواز فراہم کیا۔

نواب سراج الدولہ کی شکست اور وفات کی متعدد وجوہات تھیں، جو ان کی سلطنت بنگال و بہار کے تخت پر براجمان ہونے کے صرف ایک سال کے اندر واقع ہوئیں۔ ان کی کمزوری اور دربار میں میر جعفر جیسے حریص و سازشی امراء کی بے وفائی کی تفصیلات کسی اور کتاب کا موضوع ہیں۔ یہاں صرف اتنا جاننا کافی ہے کہ سراج الدولہ کی شکست کے ساتھ ہی شمالی ہندوستان میں مسلم اقتدار کے زوال کا آغاز ہو گیا۔

ابتدائی مرحلہ بظاہر مسلمانوں کے حق میں تھا۔ 15 مئی 1756 کو سراج الدولہ نے اپنی راجدھانی مرشد آباد سے روانگی اختیار کی۔ 20 جون کو اس نے فورٹ ولیم پر قبضہ کر لیا جب انگریز خوف و ہراس کے عالم میں وہاں سے فرار ہو گئے۔ اُسی رات انگریزوں کے 55 قیدیوں میں سے 43 دم گھٹنے سے ہلاک ہو گئے، کیونکہ اُنہیں ایک 18 بائی 14 فٹ کی کوٹھری میں بند کر دیا گیا تھا، جو اس سے قبل نشے میں دھت سپاہیوں کو قید کرنے کے لیے استعمال کی جاتی تھی۔ یہ واقعہ بعد میں 'بلیک ہول آف کلکتہ' کے نام سے بدنام ہوا۔ سراج الدولہ نے یہ حکم خود دیا یا اسے بعد میں افسوس ہوا یہ سوال اتنا اہم نہیں جتنا اس واقعے پر انگریزوں کا ردعمل اہم ہے۔ وہ شدید صدمے اور غصے میں آ گئے۔ وہ کلکتہ کو دوبارہ حاصل کرنے کی کوشش ویسے بھی کرتے، لیکن اس واقعے نے ان کے ارادوں میں ایک اخلاقی شدت اور جذباتی جوش بھی شامل کر دیا۔

رابرٹ کلائیو 29 ستمبر 1725 کو شروپشائر کے علاقے مارکٹ ڈریٹن کے قریب پیدا ہوا۔ جب وہ

سات برس کا تھا تو اس کے چچا نے ایک خط میں لکھا کہ یہ لڑکا نہایت ضدی اور آمرانہ مزاج کا ہے، اور اسے نرمی، سخاوت اور صبر کی تعلیم دی جانی چاہیے۔ خوش قسمتی سے برطانیہ کے لیے وہ کوشش ناکام رہی۔ اس اسکول کے مالک نے جہاں کلائیو زیر تعلیم تھا، یہ پیش گوئی کی کہ اگر یہ لڑکا زندہ رہا تو اس کا نام دنیا میں بہت بلند ہوگا۔

کلائیو کی عمر سترہ برس تھی، جب اسے ایسٹ انڈیا کمپنی میں کاتب (رائٹر) کی حیثیت سے پانچ پاؤنڈ سالانہ تنخواہ پر ملازمت ملی۔ اس نے ہندوستان پہنچنے میں کافی وقت لیا۔ مارچ 1743 میں جب وہ جہاز پر سوار ہوا تو خراب موسم کے باعث جہاز بھٹک کر برازیل پہنچ گیا۔ جب وہ مدراس پہنچا تو اس کی مالی حالت اس قدر خستہ تھی کہ اسے دو بار کپتان سے قرض لینا پڑا اور ایک مہربان ساتھی مسافر سے قمیصیں اور موزے بطور تحفہ لینے پڑے۔ تاہم جب 23 مارچ 1753 کو وہ انگلینڈ روانہ ہوا تو وہ ایک جنگی ہیرو بن چکا تھا اور اس کے پاس مال و دولت کی بھی کمی نہیں تھی۔ اس کے ہم عصروں کو اس کی دولت اور شہرت سے کوئی حسد نہیں تھا۔ انگلینڈ میں اس کا شاندار استقبال ہوا اور وہ پارلیمنٹ کا رکن منتخب ہوا۔ تاہم ہاؤس آف کامنز ایک ایسی جگہ ثابت ہوئی جو ایک پرعزم نوجوان کے لیے بے لطف تھی۔ چنانچہ کلائیو اگست 1756 میں دوبارہ مدراس واپس آ گیا، اس بار نائب گورنر کے طور پر۔ صرف چھ ہفتوں میں وہ بری افواج کے کمانڈر کی حیثیت سے کلکتہ کی دوبارہ بازیابی کے لیے روانہ ہو چکا تھا۔ 11 اکتوبر کو اُس نے لندن میں خفیہ کمیٹی کو خط لکھا کہ ''مجھے امید ہے کہ یہ مہم صرف کلکتہ کو دوبارہ حاصل کرنے پر ختم نہیں ہوگی، بلکہ کمپنی کی جاگیران علاقوں میں پہلے سے بہتر اور زیادہ پائیدار بنیادوں پر قائم ہو جائے گی۔'' برطانوی سلطنت پیش بینی اور حکمت عملی کے بغیر وجود میں نہیں آئی تھی۔

2 جنوری 1757 کو کلکتہ بغیر کسی مزاحمت کے انگریزوں کے قبضے میں چلا گیا۔ اگلے چھ ماہ کے دوران کلائیو نے بنگال کے دربار کو اس وعدے کے ساتھ تقسیم کر دیا کہ میر جعفر کو نواب بنا دیا جائے گا بشرطیکہ وہ انگریزوں کی مدد کرے۔ پلاسی کی فیصلہ کن جنگ میں دونوں جانب کی صف بندی سے اندازہ ہوتا ہے کہ کلائیو کو درحقیقت کتنی مدد درکار تھی۔ اس کے پاس صرف آٹھ سو یورپی سپاہی، دو ہزار دو سو مقامی سپاہی اور چند توپیں تھیں۔ سراج الدولہ کے پاس پینتیس ہزار پیادہ فوج، پندرہ ہزار

سوار، ترپن توپیں، فرانسیسی توپ خانے کا ایک دستہ اور اتحادیوں کے پانچ ہزار گھوڑے اور سات ہزار پیادے تھے۔

جنگ سے ایک دن قبل انگریزوں کی جنگی کونسل کے سترہ میں سے دس ارکان نے حملے کی مخالفت میں ووٹ دیا، ان میں خود کلائیو بھی شامل تھا۔ اس نے اپنا فیصلہ اس وقت بدلا جب میر جعفر کی طرف سے پختہ یقین دہانی حاصل ہوئی کہ ان کے درمیان کیا گیا معاہدہ قائم ہے۔

سراج الدولہ ایک ناکام سپہ سالار ثابت ہوا۔ دن بھر اس کی توپیں بے ربط گولہ باری کرتی رہیں۔ دوپہر کے وقت ہونے والی ایک تیز بارش سے گولہ بارود تر ہو کر ناکارہ ہو گیا۔ میر جعفر میدان سے الگ تماشائی بنا بیٹھا رہا، اور اس نے سراج کی بار بار کی درخواست کے باوجود اپنے سپاہیوں کو لڑائی میں نہیں اتارا۔ ان یونٹوں میں ایک غلط فہمی پیدا ہوئی، جو انگریزوں سے نبرد آزما تھیں۔ انہیں رکنے کا حکم دیا گیا تھا، لیکن انہوں نے یہ سمجھا کہ پسپا ہونے کا حکم ہے اور وہ میدان چھوڑ کر بھاگ گئے۔

یوں انگریزوں کو بنگال کی سلطنت ایک احمق اور ایک غدار کی بدولت ملی۔ کلائیو کو صرف چار انگریز اور پندرہ مقامی سپاہیوں کی قربانی دینا پڑی۔ 29 جون کو جب وہ دارالحکومت میں داخل ہوا تو اس کے ساتھ دو سو یورپی اور تین سو ہندوستانی سپاہی تھے۔ وہ لکھتے ہیں کہ ''مرشد آباد کا شہر وسعت، آبادی اور دولت میں لندن کے برابر ہے، فرق صرف یہ ہے کہ مرشد آباد میں بعض افراد کے پاس لندن کے سب سے دولت مند فرد سے بھی کہیں زیادہ دولت موجود ہے۔'' پرتگالیوں نے بھی کالی کٹ کو لزبن سے زیادہ شاندار پایا تھا۔

30 جولائی کو شہنشاہ عالمگیر ثانی نے رابرٹ کلائیو کی سفارش کو منظور کرتے ہوئے میر جعفر کو بنگال اور بہار کا نواب تسلیم کر لیا۔ اب کسی کو یہ وہم نہیں رہا تھا کہ اصل حکم کہاں سے آ رہا ہے۔ سراج الدولہ کو میر جعفر کے بیٹے میران نے قتل کر دیا۔ تین سال بعد میران آسمانی بجلی گرنے سے ہلاک ہو گیا، اور جب یہ واقعہ بنگال میں جگہ جگہ گھوم کر ادائیگی کرنے والے تھیٹر گروپوں کی داستانوں کا حصہ بنا تو اسے قدرتی انصاف (deus ex machina) کی مثال کے طور پر پیش کیا گیا۔

میر جعفر نے کمپنی کے اعلی افسران کو انعامات دے دے کر اپنا خزانہ خالی کر دیا۔ اسے مجبوراً 23 لاکھ

40 ہزار پاؤنڈ کے تحائف دینے پڑے، جن میں کلائیو سب سے اوپر تھا۔ اس کے علاوہ کلائیو کو چھ ہزار پیادہ اور پانچ ہزار سواروں کا منصب دیا گیا، 'ضبط الملک نصیب الدولہ کرنل شجاعت جنگ بہادر' کا خطاب عطا ہوا اور چوبیس پرگنہ کا وسیع علاقہ اس کے نام کر دیا گیا، جس سے وہ بنگال کا سب سے بڑا زمیندار بن گیا۔

جب تمام لین دین اور عطیات کا حساب مکمل ہوا تو کلائیو کم از کم چار لاکھ پاؤنڈ کا مالک بن چکا تھا۔ لیکن اسے اس پر کوئی شرمندگی نہ تھی۔ بعد میں جب وہ انگلینڈ میں پارلیمانی کمیٹی کے سامنے پیش ہوا تو اس نے کہا کہ ''ایک عظیم شہزادہ میری خوشنودی کا محتاج تھا، ایک مالا مال شہر میری مرضی کا تابع تھا، اور اس کے سب سے دولت مند ساہوکار محض میرے تبسم کے حصول کے لیے ایک دوسرے پر سبقت لے جانے کو بے تاب تھے... جناب صدر، میں اس وقت اپنی شرافت پر خود حیران ہوں!''

دہلی میں مغل شہنشاہ کے اقتدار کے امکانات بنگال میں شکست خوردہ نواب کی حالت سے کچھ زیادہ بہتر نہیں دکھائی دیتے تھے۔ جس طرح بنگال میں اصل طاقت انگریزوں کے ہاتھ آ چکی تھی، ویسے ہی شمالی ہند پر مرہٹے قابض ہو چکے تھے۔ حالات سے یہ صاف ظاہر ہوتا تھا کہ اب محض وقت کی بات ہے کہ دہلی کا مغل شہنشاہ کسی مرہٹہ مدعی اقتدار سے بدل دیا جائے گا۔ لیکن ایک آخری جہاد نے نہ صرف ایک صدی کے لیے مسلم اقتدار کو سہارا دیا، بلکہ اسے اس وقت تک زندہ رکھا جب تک عیسائی بندوق نے آخری وار نہ کر دیا۔

مرہٹہ طاقت کی بنیاد شیواجی کی غیر معمولی ذہانت اور قیادت میں رکھی گئی، جن کی پیدائش 1630 میں ہوئی۔ انہوں نے مغربی گھاٹ کے دشوار گزار پہاڑی سلسلے میں قلعوں کا ایک سلسلہ قائم کر کے حرف بہ حرف ایک ریاست کی تشکیل کا آغاز کیا۔ یہ علاقہ بمبئی کے مشرق اور دکن میں بیجاپور کے مغرب میں واقع تھا۔ شیواجی نے بیجاپور کی جانب سے اس کو مطیع بنانے کی کوشش کو شکست دی اور پھر دہلی کی طاقت کو اپنی تدبیر، حکمت عملی اور جنگی صلاحیت سے قابو میں رکھا۔

غیر ارادی طور پر ہی سہی، اورنگزیب کی ہندو مخالف پالیسیوں کی وجہ سے شیواجی ایک غیر متعصب اور روشن خیال شخصیت کے طور پر ظاہر ہوئے، حالانکہ خود شیواجی کا طرز حکمرانی فرقہ وارانہ نہیں تھا۔ لیکن

اورنگزیب کے خلاف ان کی کامیابیوں نے بعد کے بعض مؤرخین کو یہ موقع فراہم کیا کہ وہ انہیں ہندومت کا علمبردار اور اورنگزیب کے مقابل ایک تہذیبی علامت کے طور پر پیش کریں۔

شیواجی کی پروردہ ریاست کو مغل سلطنت کے زوال کے دوران مکمل بلوغت نصیب ہوئی۔ ان کی وفات 4 اپریل 1680 کو ہوئی، جس کے بعد مرہٹہ طاقت کمزور قیادت کی وجہ سے تنزلی کا شکار ہو گئی۔ لیکن 17 نومبر 1713 کو جب بالاجی وشوناتھ کو پیشوا (یعنی وزیر اعلیٰ) مقرر کیا گیا تو مرہٹوں کی قسمت کا ستارہ دوبارہ چمکنے لگا۔ 1719 تک بالاجی قومی سیاست میں ایک مؤثر قوت کے طور پر ابھر چکے تھے، ایک ایسے وقت میں جب دہلی کا تاج ایک سر سے دوسرے سر تک اس قدر تیزی سے منتقل ہو رہا تھا کہ نہ صرف حکمران بلکہ رعایا بھی بے یقینی کا شکار تھی۔

1737 تک مرہٹے دہلی کے نواح میں حملے کر رہے تھے۔ انہوں نے 1739 میں نادر شاہ کے ہاتھوں دہلی کی تباہی کو خاموشی سے دیکھا۔ 1741 تک وہ مالوہ کی زرخیز زمین پر قابض ہو چکے تھے۔ جب دولت کے ساتھ اُنہوں نے باہمی اتحاد بھی قائم کر لیا تو وہ ہندوستان کی غالب ترین طاقت بن گئے۔

1749 میں مرہٹوں نے شندے، ہولکر، بھونسلے اور گائیکواڑ جیسے بڑے خاندانوں کو ایک ڈھیلے ڈھالے اتحاد میں مجتمع کیا، جس کی قیادت پونے میں مقیم پیشوا کے ہاتھ میں تھی۔ 1758 تک مرہٹے لاہور پر قبضہ کر چکے تھے اور ان کا لشکر دریائے سندھ کے کنارے واقع اٹک تک پہنچ چکا تھا۔ اسی سال دسمبر میں دہلی بھی ان کے زیرِ تسلط آ گئی، اگرچہ انہوں نے وہاں کے ساکت مغل بادشاہ کو بظاہر کوئی گزند نہیں پہنچائی۔

اس دور کے کسی بھی بااثر جنگجو سردار میں اتنا اعتماد نہیں تھا کہ وہ رسمی مغل شہنشاہ کو ہٹا دے، چاہے اس کی حیثیت محض علامتی کیوں نہ ہو۔ انہیں مغل بادشاہ سے کوئی خطرہ نہ تھا بلکہ اصل خوف تو ایک دوسرے کا تھا۔

1760 میں مرہٹے اپنی طاقت کے عروج پر تھے اور ناقابلِ شکست دکھائی دیتے تھے۔ ان کا محصولی

اختیار تقریباً پورے ہندوستان میں نافذ تھا، سوائے انگریزوں کے زیر انتظام علاقوں، یعنی بنگال، مدراس اور شمالی سرکار کے۔ علاوہ ازیں حیدرآباد، اودھ اور روہیلکھنڈ جیسی چند مسلم نوابی ریاستیں باقی تھیں، جہاں مسلمان حکمران برسرِ اقتدار تھے۔

یہ سال مرہٹوں کے لیے فتح و نصرت کے ساتھ شروع ہوا۔ 24 جنوری کو انہوں نے تانڈولا جا کے مقام پر حیدرآباد کے نظام کی افواج کو شکست دی۔ اگست میں وہ ایک بار پھر دہلی میں جلوہ گر ہوئے۔ ایسا محسوس ہوتا تھا کہ اب مغل حکومت کا ظاہری پردہ بھی ہٹ جائے گا اور لال قلعے کے تخت پر پیشوا کا حقیقی اقتدار قائم ہو جائے گا۔

مسلمان اشرافیہ اور اہلِ دانش سخت اضطراب اور بے یقینی کا شکار تھے۔ ان میں نہ اتحاد باقی رہا تھا نہ کوئی مؤثر حکمت عملی، اور نہ ہی ایسی قیادت جو بدلتے حالات کا سامنا کر سکتی۔ وہ ایک ایسے دور کے زخم سہہ رہے تھے جو اُن کی آنکھوں کے سامنے دم توڑ رہا تھا۔ ایسے پر آشوب ماحول میں، ایک جلیل القدر عالم دین نے ایک ہی حل پیش کیا... جہاد۔

شاہ ولی اللہ (1762–1703) ایک معزز اور صاحب نسب خانوادے سے تعلق رکھتے تھے۔ ان کا سلسلہ نسب خلیفۂ دوم حضرت عمر فاروقؓ سے ہوتا ہوا وسط ایشیا کے ترک النسل خاندان تک پہنچتا ہے۔ ان کے والد شاہ عبدالرحیم مغلیہ دربار کے جید عالم، فقیہ اور مورخ تھے۔ وہ 'فتاویٰ عالمگیری' کی تدوین میں شامل تھے اور انہوں نے دہلی میں مدرسہ رحیمیہ قائم کیا تھا۔

شاہ ولی اللہ سات برس کی عمر میں حافظ قرآن ہو چکے تھے۔ پندرہ برس کی عمر میں علوم دینیہ کی باقاعدہ تعلیم مکمل کی اور سترہ برس کی عمر میں والد کی وفات کے بعد مدرسے کی قیادت سنبھالی۔ جب 1730 میں وہ حج کے لیے روانہ ہوئے تو وہ ایک بلند پایہ عالم کی حیثیت اختیار کر چکے تھے۔ ان کے قلم سے سو سے زائد کتب اور رسائل منظرِ عام پر آئے۔

انہوں نے اپنے دور کے زوال کی تفہیم قرآن مجید کی روشنی میں کی۔ ان کے مطابق اللہ کی مدد ایمان کے بدلے آتی ہے، اور زوال دراصل انحراف و اخلاقی زبوں حالی کا نتیجہ ہے۔ ان کا حل یہ تھا کہ

قرآن وسنت کے ابتدائی اصولوں کی طرف عملی رجوع کیا جائے۔ ایروِن روزنتھال نے اپنی کتاب Islam in the Modern National State (Cambridge University Press, 1965) میں لکھا ہے کہ ''اسلام کے اصولوں کی اس حیران کن تعبیر کی سب سے اہم بات یہ ہے کہ یہ ایک خالص اسلامی ماحول میں وجود میں آئی، جہاں کسی یورپی اثر کا دخل نہ تھا اور یہ سب کچھ فرانسیسی انقلاب سے کئی دہائیاں پہلے وقوع پذیر ہوا۔''

علامہ محمد اقبال بیسویں صدی کے عظیم شاعر اور تحریکِ پاکستان کے نظریاتی معمار تھے، وہ شاہ ولی اللہ کو برصغیر کا پہلا مسلمان قرار دیتے ہیں، جنہوں نے ایک نئی فکری روح کے ساتھ سوچا۔ دوسرے علما نے انہیں قدیم وجدید کے درمیان فکری پل کہا ہے۔

اپنی مشہور تصنیف حجۃ اللہ البالغہ میں شاہ ولی اللہ لکھتے ہیں کہ ''اب وقت آچکا ہے کہ اسلامی شریعت کو عقل واستدلال کے لباس میں دنیا کے سامنے پیش کیا جائے۔''

وہ اس بات پر زور دیتے ہیں کہ قرآن کے اصول یورپی فکر پر غالب آسکتے ہیں۔ انہوں نے مغربی تقلید کی شدید مخالفت کی اور مسلمانوں کو رسول اکرم ﷺ اور خلفائے راشدین کے دور کی سادگی، اخلاص اور روحانی پاکیزگی کی طرف پلٹنے کی تلقین کی۔

شاہ ولی اللہ نے اللہ تعالیٰ سے دعا کی اور افغانستان کی طرف رجوع کیا۔ انہوں نے اس زمانے کے افغان بادشاہ احمد شاہ ابدالی کو ایک خط لکھا جسے وہ 'گوہرِ عصر' قرار دیتے ہیں۔ احمد شاہ وہ فرماں روا تھا، جس نے نادر شاہ کی بکھری ہوئی سلطنت کے حصوں کو سمیٹ کر ایک نئی سلطنت قائم کی تھی۔ شاہ ولی اللہ نے اسے دعوت دی کہ وہ ہندوستان میں اسلام کو بچانے کے لیے مرہٹوں کے خلاف جہاد کرے۔ یہ خط Sources of Indian Tradition (وائکنگ، ہارمنڈس ورتھ، 1991، مدوّن: اینز لی ٹی ایمبری) میں موجود ہے:

''اس زمانے میں، جناب عالی [احمد شاہ] کے سوا کوئی ایسا بادشاہ موجود نہیں جو وسائل وقوت کا مالک ہو، کفار کی فوج کو شکست دینے کی صلاحیت رکھتا ہو، دور اندیش ہو اور

جنگ کا تجربہ رکھتا ہو۔ لہذا جناب عالی پر فرض ہے کہ وہ ہند کی طرف لشکر کشی کریں، مرہٹوں اور جاٹوں کی کافرانہ بالا دستی کو ختم کریں اور ان کمزور مسلمانوں کو نجات دلائیں جو کافروں کے تسلط میں آچکے ہیں۔ اگر کفر کی قوت اسی طرح قائم رہی (خدانخواستہ!) تو مسلمان اسلام کو بھلا بیٹھیں گے اور جلد ہی ایک ایسی قوم میں تبدیل ہو جائیں گے جو نہ اسلام کو پہچانتی ہوگی اور نہ کفر کو۔ یہ بھی ایک عظیم آزمائش ہے اور اللہ تعالیٰ کے فضل سے اس کا سد باب صرف جناب عالی ہی کر سکتے ہیں... اللہ رب العزت کے نام پر ہم درخواست کرتے ہیں کہ وہ [احمد شاہ] اس سرزمین کے کفار کے خلاف جہاد میں بھرپور کوشش فرمائیں، تاکہ روز محشر ان کے اعمال نامے میں یہ سعی جمیل درج ہو، ان کا نام غازیوں کے رجسٹر میں رقم ہو جائے اور دنیا میں بے شمار دشمن اسلام کے مجاہدین کے ہاتھوں شکست کھائیں، اور مسلمان کفار کے ظلم سے نجات پائیں۔ اسلام کی فتح پوری امت مسلمہ کی تقدیر ہے۔ جہاں کہیں کوئی مسلمان ہو، اسلامی فرماں روا اسے اپنی اولاد اور بھائیوں کی مانند عزیز رکھیں اور جہاں کہیں کوئی جنگجو کافر ہو، اس کے خلاف شیر کی مانند برسرپیکار ہوں۔''

شاہ ولی اللہ نے کہا کہ اسلام کی فتح پوری امت کی تقدیر ہے اور یہی وہ وعدہ ہے جو اللہ نے اپنے مومن بندوں سے کیا ہے۔ البتہ احمد شاہ ابدالی کے لیے جہاد کے مقابلے میں ممکن ہے کہ مال غنیمت کی کشش زیادہ ہو۔ وہ ان حملہ آوروں میں سے تھا جو ہندوستان پر بار بار حملے کر کے اپنی معیشت کو سہارا دیا کرتے تھے۔ ہمارے پاس اس بات کا کوئی مصدقہ ثبوت نہیں ہے کہ اس نے شاہ ولی اللہ کے خط کا باضابطہ جواب دیا، لیکن یہ وہ ایک مہم ضرور تھی جس کا اصل مقصد مال غنیمت نہیں تھا۔

احمد شاہ ابدالی نے شمالی ہند کی دو اہم مسلم ریاستوں، روہیلکھنڈ اور اودھ کے ساتھ اتحاد کیا اور دہلی کے شمال میں نمودار ہوا۔ فیصلہ کن معرکہ جنوری 1761 میں پانی پت کی تیسری جنگ کے طور پر پیش آیا۔ زمانے کا رخ اور حالات کے تیور مرہٹوں کے حق میں نہ تھے، اور یہ جنگ ان کے لیے تباہ کن ثابت ہوئی۔

1760 میں مرہٹوں نے اپنی تاریخ کا سب سے بڑا اور شاندار لشکر تیار کیا۔ تقریباً ڈھائی ماہ تک چھوٹے چھوٹے معرکے جاری رہے۔ مسلمانوں نے دشمن کی رسد کی لائنیں کاٹنے میں کامیابی حاصل کی جس کے نتیجے میں اشیائے خورد ونوش کی قلت پیدا ہوئی اور یوں جنگ کا دن طے ہو گیا۔ فیصلہ کن معرکہ 14 جنوری کو ہوا۔

مرہٹہ فوج کے بائیں بازو کی قیادت ایک مسلمان جرنیل ابراہیم خان گاردی کے سپرد تھی، جس نے مذہب کے نام پر اپنا محاذ بدلنے کی ہر کوشش کو ٹھکرا دیا۔ حقیقت یہ ہے کہ اٹھارہویں صدی کے میدان جنگ میں ہندو مسلم تفریق اتنی شدید نہ تھی جتنی ہمیں بعد کے مورخین نے باور کرائی۔ جیسا کہ اس جنگ کی مرہٹہ تواریخ کا مترجم ایان ریسا ئیڈ لکھتا ہے کہ ''یقیناً مذہب کا فرق ہمیشہ ایک ایسا بہانہ رہا جسے وقت ضرورت رقابت کو جائز ثابت کرنے کے لیے استعمال کیا جا سکتا تھا، لیکن مسلمانوں کو اس بات میں کوئی تردد نہیں تھا کہ وہ ہندو اتحادیوں کی مدد سے دوسرے مسلمانوں کے خلاف لڑیں، اور ہندو بھی یہی روش اپناتے۔ اٹھارہویں صدی کی جنگوں میں بمشکل کوئی ایسی فوج ملتی ہے جو مذہب کے اعتبار سے یک رنگ ہو۔''

تاہم پانی پت کی تیسری جنگ میں دونوں طرف کے لشکروں کو بخوبی علم تھا کہ اقتدار کا توازن داؤ پر لگا ہے۔ اگر مرہٹوں کو فتح حاصل ہو جاتی تو دہلی کا تخت ایک بار پھر ہندو حکمران کے قبضے میں آ جاتا، وہ بھی سات سو سال بعد جب پرتھوی راج کو شکست ہوئی تھی۔

دلچسپ امر یہ ہے کہ ابراہیم خان گاردی ہی وہ سپہ سالار تھا جس نے ابدالی کی صفوں کو قریب قریب چیر ڈالا تھا، مگر ابدالی بہتر حکمت عملی کا حامل تھا۔ اس نے مرہٹوں کو تھکنے دیا اور پھر دوپہر میں دس ہزار تازہ دم سپاہیوں کے ساتھ جوابی حملہ کر دیا۔ قریب پونے تین بجے 'پلک جھپکتے ہی مرہٹہ فوج کافور کی طرح میدان سے غائب ہو گئی' اور اس کے ساتھ ہی ان کے خواب بھی بکھر گئے۔

ابدالی نے اس فتح کا سہرا اللہ کے سر باندھا۔ اس نے جے پور کے حکمران راجہ مدھو سنگھ کو لکھا کہ 'اچانک فتح کی ہوا چلنے لگی اور پروردگار کے حکم سے ان بدبخت دکنیوں کو عبرتناک شکست نصیب ہوئی...''

پانی پت کی تیسری جنگ ہندوستان کی تاریخ میں آخری جہاد تھی اور جس کا اثر سب سے کم تھا۔ ابدالی دہلی کا تاج نہیں چاہتا تھا، چنانچہ وہ افغانستان لوٹ گیا، اور مرہٹے اپنی ریاستوں کو واپس چلے گئے۔ مغل بادشاہ کے لیے یہ اگرچہ بظاہر فتح تھی لیکن عملی طور پر محض ایک رسمی جیت تھی اور مرہٹوں کے لیے یہ شکست تاریخی ناکامی بن گئی۔ سچ تو یہ ہے کہ مسلمان اپنی سلطنت گنوا چکے تھے اور ہندو ابھی تک اپنی سلطنت قائم نہ کر سکے تھے۔ یہی وہ تاریخی خلا تھا، جس کا کوئی واضح جواب موجود نہیں تھا۔ شاہ ولی اللہ کے نزدیک ابدالی نے ایک مسلمان تخت کو کفار سے بچایا تھا، مگر ان کے فرزند شاہ عبدالعزیز کو جلد ہی احساس ہو گیا کہ ابدالی نے درحقیقت کسی دوسری طاقت کو ابھرنے کا موقع دے دیا تھا۔

پانی پت کے میدان سے مرہٹوں کے غائب ہونے کے اگلے ہی دن جنوبی ہند میں ایک اور اہم اور ڈرامائی واقعہ پیش آیا۔ فرانسیسی گورنر جنرل اور افواج کے سپہ سالار، کومتے دی لالی نے جو ایک آئرش جیکو بائٹ کا بیٹا تھا، پونڈیچیری کو برطانویوں کے حوالے کر دیا۔ اس کے ساتھ ہی ایسٹ انڈیا کمپنی جنوبی ہند میں بھی اسی طرح طاقتور ہو گئی جیسے وہ مشرق میں ہو چکی تھی۔ ہندوستان پر برطانوی تسلط کا روایتی آغاز پلاسی کی فتح سے وابستہ ہے۔ 1757 کے بعد برطانویوں نے ہندوستان کے مختلف حصے ایسے چن چن کر حاصل کیے جیسے بغیر باغبان کے کسی باغ میں درختوں سے پکے ہوئے پھل توڑے جاتے ہیں۔

اگلے پچاس برسوں کے دوران برطانویوں نے کئی بڑی فتوحات کے ذریعے ہندوستان کے مستقبل پر قبضہ جما لیا، اور ان کا سامنا ایسے حریفوں سے تھا جو سراج الدولہ سے کہیں زیادہ اہل، مدبر اور بہادر تھے۔ عمدہ سیاسی حکمت عملی اور منظم عسکری تربیت کے ذریعے انہوں نے ان شخصیات کو شکست دی جنہیں آج قومی مزاحمت کی علامت کے طور پر یاد کیا جاتا ہے: جنوب میں حیدر علی اور ٹیپو سلطان، شمال میں چیت سنگھ اور مہاجی شندے۔

1764 میں بکسر کی جنگ کے ذریعے برطانویوں نے مشرقی ہندوستان میں اپنی برتری کو پختہ کر لیا، جہاں انہوں نے دہلی، اودھ، اور ایک سرکش بنگال کی مشترکہ افواج کو شکست دی۔ تاہم ان کے اصل اور مستقل حریف میسور کی ریاست اور مرہٹے تھے۔ 1787 میں میسور کے بے خوف حکمران ٹیپو

سلطان نے خلافت عثمانیہ سے مدد لینے کی کوشش کی اور قسطنطنیہ میں اپنا سفیر روانہ کیا، لیکن وہ خلیفہ کی صلاحیتوں کے بارے میں غلط اندازے پر تھا۔ بالآخر 1792 میں ٹیپو شکست کھا گیا اور شہید ہو گیا۔

مرہٹوں نے طویل مزاحمت کی۔ آرتھر ویلزلی جوان دنوں ہندوستان میں خدمات انجام دے رہا تھا، اس بات کا دعویٰ کرتا ہے کہ اسے مرہٹوں کے خلاف آسائے کی جنگ جیتنا واٹرلو میں نپولین کو شکست دینے سے زیادہ مشکل لگا۔ ستمبر 1803 میں جنرل جیرارڈ لیک کی قیادت میں ایک بنگالی فوج نے پٹپڑ گنج میں مرہٹہ فوج کو شکست دی، دہلی میں داخل ہوئی اور مغل بادشاہ کو ایک بے اختیار پنشن یافتہ حکمران میں بدل دیا۔ 1804 میں دوسری مرہٹہ جنگ کے اختتام پر گورنر جنرل رچرڈ ویلزلی یہ دعویٰ کرنے کے قابل ہو چکا تھا کہ اب برطانیہ کے پاس صرف 'خطے' نہیں، بلکہ 'سلطنت' ہے۔ برطانوی اب بلا شرکت غیرے ہندوستان کے مالک بن چکے تھے۔

اسی وقت ایک پکار پورے عالم اسلام میں بلند ہوئی: مسلمانوں کو اپنی قوت دوبارہ حاصل کرنی چاہیے تاکہ وہ دارالاسلام کو ان عیسائی طاقتوں سے بچا سکیں جو مسلسل اس کی سرزمینوں میں داخل ہو رہی تھیں۔ یہ صدا پہلے سیاسی نظام سے باہر کے حلقوں سے بلند ہوئی اور جلد ہی عوام میں مقبول ہو گئی۔

شاہ عبدالعزیز 1803 میں اس وقت دہلی میں موجود تھے جب جیرارڈ لیک نے دارالحکومت پر قبضہ کیا۔ انہوں نے ایک فتویٰ صادر کیا کہ ہندوستان اب دارالاسلام نہیں رہا، کیونکہ اقتدار کفار کے ہاتھ میں چلا گیا ہے۔ ان کے شاگرد سید احمد بریلوی نے اگلا قدم اٹھایا اور برطانویوں کے خلاف جہاد کا آغاز کیا۔ وہ جہاد جو سید احمد کی شہادت کے بعد بھی انگریزوں کے لیے دردسر بنا رہا۔ اسی دور میں سلطنت عثمانیہ کی حدود میں ایک اور شخص جہاد کا علم بلند کیے پھرتا رہا، جس کے افکار بیسویں صدی میں اخوان المسلمون جیسے اسلامی تحریکی گروہوں کے لیے باعث تحریک بنے۔

10

# معاہدے کا تلخ انجام

''اللہ کسی قوم کی حالت کو اُس وقت تک نہیں بدلتا جب تک وہ خود اپنی حالت کو نہ بدلے۔''
[سورۃ رعد، آیت 11]

جب خلیفہ عبدالحمید ثانی نے خیر خواہانہ انداز میں سید جمال الدین افغانی کو شادی کا مشورہ دیا تو افغانی نے طیش میں آ کر خود کو مخنث کر لینے کی دھمکی دے دی۔ حالانکہ عظیم صلاح الدین ایوبی ایک عام گھریلو زندگی گزار چکے تھے اور نوجوانی میں کبھی کبھار شراب کا ایک آدھ گھونٹ بھی لے لیتے تھے۔ لیکن افغانی کے نزدیک جنسی تقاضے اور خاندانی زندگی جیسی عام انسانی ضروریات اس بلند مقصد کے لیے محض خلل تھیں، جس کے لیے وہ جیتا تھا۔ برطانیہ کے خلاف ایک عالمی اسلامی جہاد، جو اس کے نزدیک دورِ حاضر کی عیسائی سامراجیت کا سرچشمہ اور سب سے بڑی طاقت تھا۔

وہ اپنے آپ کو 'افغانی' کہتا تھا، حالانکہ وہ ایک ایرانی شیعہ تھا، جو ہمدان کے قریب اسد آباد میں پیدا ہوا۔ ممکن ہے وہ شیعہ سنی اختلافات سے بیزار ہو، جو مسلم اتحاد کی راہ میں بڑی رکاوٹ تھے۔ اسی لیے اس نے اپنی اصل شناخت کو پوشیدہ رکھا، کیونکہ مسلمانوں کی اکثریت سنی ہے۔ بے حد بصیرت رکھنے والا یہ شخص 1838 یا 1839 میں پیدا ہوا۔ ابتدائی تعلیم ایک مدرسے میں حاصل کی، پھر قندھار چلا گیا۔ وہاں یا تو اس کی تند و تیز زبان یا سیاسی خیالات کی وجہ سے وہ دیر تک قیام نہ کر سکا۔ بعد ازاں قسطنطنیہ کا رخ کیا اور 1871 میں قاہرہ پہنچا۔ وہاں اس نے خدیوی اسماعیل اور برطانیہ پر

تنقید کی، جو عوامی پذیرائی کا باعث بنی۔

قاہرہ میں محمد عبدہ اس کے مرید بنے۔ 'مرید' کے لیے انگریزی لفظ 'disciple' استعمال ہوتا ہے، مگر ایک پیر اور مرید کے درمیان جو روحانی تعلق ہوتا ہے اس کی شدت اور گہرائی کو یہ لفظ پوری طرح ادا نہیں کر سکتا۔ انگریزی زبان اسلامی روحانیت کے لطیف اور تہہ دار پہلوؤں کے اظہار کے لیے ناکافی ہے۔

1879 تک وہ مصر کے لیے بھی ناقابل برداشت ہو چکے تھے، چنانچہ وہ حیدرآباد (بھارت) آ گئے، جہاں انہوں نے مسلمانوں کو انگریزوں کا دوست بنانے کی وکالت کرنے والے ماہرِ تعلیم سرسید احمد خان پر زبردست تنقید کی۔ 1884 میں افغانی پیرس چلے گئے، جہاں ان کے شاگرد محمد عبدہ بھی ان سے آ ملے۔ اگلے برس وہ ایران لوٹے اور کوشش کی کہ شاہ ناصرالدین روس کو برطانیہ مخالف مہم میں شریک کرے، لیکن شاہ نے کوئی توجہ نہ دی۔ اس پر افغانی خود سینٹ پیٹرزبرگ چلے گئے اور دو سال وہیں قیام کیا۔ اگرچہ ان کا یہ دعویٰ جھوٹ نکلا کہ انہیں زار الیگزینڈر دوم سے ملاقات کا شرف حاصل ہوا تھا، لیکن وہ ماسکو کو اس بات پر راضی کرنے میں کامیاب ہو گئے کہ قرآن اور اسلامی لٹریچر کی اشاعت کی اجازت دے۔

سلطنت عثمانیہ کے طول و عرض، یورپ کے دارالحکومتوں، افغانستان اور برطانوی سلطنت کے سیاسی و ثقافتی گڑھوں میں انہوں نے جہاں بھی قدم رکھا وہاں افکار و نظریات کے وہ بھنور چھوڑے، جو ان کی روانگی کے بعد بھی مدتوں متحرک رہے۔ معروف مفکر ولفریڈ کینٹ ویل اسمتھ نے جمال الدین افغانی کو وہ پہلا دانشور قرار دیا جس نے اسلام اور مغربی مسیحی دنیا کے مابین تصادم کی حدود کو واضح کیا (Islam in Modern History، پرنسٹن، نیو جرسی، 1957)۔ نکّی کیڈی کا کہنا ہے کہ افغانی کی اہمیت مسئلے کے بیان سے زیادہ اس کے حل کی تشکیل میں ہے (An Islamic Response to Imperialism، یونیورسٹی آف کیلیفورنیا پریس، لاس اینجلس، 1968)۔ افغانی کے تجویز کردہ حل جو اس وقت خاطر خواہ پذیرائی حاصل نہ کر سکے، رفتہ رفتہ مقبولیت حاصل کرتے گئے، جب دیگر ماڈل ناکام ہوتے گئے اور آج بھی ان کی تجاویز دوسرے اور تیسرے ملینیم

کے سنگم پر کھڑی اسلامی تحریکوں کی فکری بنیاد بنی ہوئی ہیں۔قرآن کی جو آیت انہیں سب سے زیادہ پسند تھی وہ سورۃ الرعد(13)،آیت 11 تھی:

''اللہ کسی قوم کی حالت نہیں بدلتا جب تک وہ خود اپنی حالت نہ بدلے۔''ان کے نزدیک اگر حکومتیں سودے بازی کا شکار ہو چکی ہیں تو مسلمان عوام کو چاہیے کہ وہ بغیر ان کی رضامندی کے مسیحی استعمار کے خلاف جدوجہد کا بیڑا خود اٹھائیں۔

ان کے نزدیک اگر مسلم حکمران استعمار کے ساتھ سمجھوتہ کر چکے ہیں تو مسلم عوام کو چاہیے کہ وہ اپنی قوت ایمانی اور شعور کے ساتھ خود میدان میں آئیں اور مسیحی استعمار کے خلاف جدوجہد کا بیڑا اٹھائیں۔

افغانی کے مطابق افریقہ سے لے کر بھارت تک مغرب اور مسیحیت کی پیش قدمی کو صرف اسی وقت روکا جا سکتا ہے جب امتِ مسلمہ آپس میں اتحاد پیدا کرے اور ایسا جہاد کرے جو جدید سائنس، ٹیکنالوجی اور عقلی طرزِ فکر سے مزین ہو۔انہوں نے مسلمانوں کے نظام تعلیم میں سائنسی اور فکری احیاء پر زور دیا اور عربوں کے سنہری دور کے بعد ان شعبوں میں پیدا ہونے والے زوال پر شدید افسوس ظاہر کیا۔افغانی نے مغربی الزام کہ قرآن جدیدیت سے متصادم ہے یا سائنسی فکر کی راہ میں رکاوٹ ہے، یکسر مسترد کر دیا۔دیگر اسلامی مفکرین کی طرح افغانی نے بھی اس بات پر زور دیا کہ آج کے مسلمان کو اپنے سلف صالحین کی زندگیوں سے رہنمائی حاصل کرنی چاہیے، جن کی کامیابی قرآن اور رسول اکرم ﷺ پر غیر متزلزل ایمان کا نتیجہ تھی۔افغانی کے نزدیک اسلامی اتحاد قومیّت کے تصور سے متصادم نہیں، بلکہ اس کے ساتھ ہم آہنگ ہو سکتا ہے۔

آپ کو افغانی کے عہد میں عالمِ اسلام کی زبوں حالی کو سمجھنے کے لیے غیر معمولی بصیرت کی ضرورت نہیں تھی۔1857 میں مغل سلطنت کی رسمی تدفین سے قبل ایک آخری جذباتی ابال اس وقت دیکھا گیا جب مسلمان اور ہندو سپاہیوں نے مختلف وجوہات کی بنا پر برطانوی اقتدار کے خلاف بغاوت کی اور کئی شاہی خاندانوں کو بھی اپنی جدوجہد میں شامل کر لیا۔راج لرز گیا،لیکن قائم رہا اور پھر انتقام سخت ترین تھا۔

اسی بغاوت کے دوران برطانوی حکومت نے قسطنطنیہ میں موجود خلیفہ عبدالمجید پر دباؤ ڈالا کہ وہ ایک ایسا فرمان جاری کریں جس میں واضح طور پر کہا جائے کہ ہندوستانی مسلمانوں کی بغاوت کو جہاد قرار نہیں دیا جاسکتا۔ عبدالمجید اس وقت برطانوی مفاد کی مخالفت کی پوزیشن میں نہ تھے۔

خود سلطنت عثمانیہ میں مغرب سے متاثر اصلاحات مطلوبہ نتائج نہ دے سکیں۔ سلیم ثالث (1788–1807) نے جب نپولین کو قسطنطنیہ پر قابض ہونے کا خواب بلند آواز میں بیان کرتے سنا، تو سمجھا کہ نجات کا راستہ فوج کو یورپی طرز پر تشکیل دینے میں ہے۔ محمود ثانی (1808–1839) نے یورپی ماہرین کی تربیت یافتہ لازمی فوج بنائی، لیکن پھر بھی یونان اور الجزائر عثمانیوں کے ہاتھ سے نکل گئے۔ محمود نے علماء کے اختیارات محدود کیے اور تمام شہریوں کو مساوی حیثیت دی۔ اب ہر شخص فیز (fez) پہن سکتا تھا۔ یورپ نے بظاہر ستائش کی، لیکن دل ہی دل میں طنز کیا۔

1829 تک روس نے قفقاز کے عثمانی علاقے مثلاً چیچنیا اور داغستان پر قبضہ کرلیا اور خود کو سلطنت عثمانیہ کے بارہ ملین آرتھوڈوکس عیسائیوں کا محافظ قرار دیا۔ اس کا ایک غیر متوقع نتیجہ یہ نکلا کہ روسی سلطنت کے مسلمانوں نے خلیفہ سے اپنی سرپرستی کی اپیل کی، جیسا کہ 1857 کے بعد ہندوستان کے مسلمانوں نے بھی کیا۔ لیکن مسلمان خلافت سے جس تحفظ کے طالب تھے وہ میسر نہ آیا، کیونکہ ترکی کو خود اپنی سلامتی کے لالے پڑے تھے۔ 1870 کی دہائی تک روس نے بلغاریہ، بوسنیا، سربیا اور مونٹی نیگرو کو بھی سلطنت عثمانیہ سے بغاوت پر آمادہ کردیا۔

خلیفہ عبدالحمید کو افغانی نے اس نکتہ پر قائل کیا کہ اسلام مغربی اصلاحات نہیں، بلکہ بکھرتی ہوئی سلطنت کو سہارا دے سکتا ہے۔ چنانچہ خلیفہ نے غیر ملکیوں کے بجائے اپنی رعایا کو رجھانے کی کوشش کی۔ دمشق سے مدینہ تک زائرین کے لیے ریلوے لائن بنوائی اور سلطنت کے انتظامی ڈھانچے میں عربوں کی شمولیت بڑھانے کی کوشش کی۔ مگر یہ اقدامات بہت تاخیر سے کیے گئے، جو ناکافی تھے۔ برطانیہ نے ترکوں کے خلاف عربوں کو آزادی کا خواب دکھانا شروع کردیا تھا۔

افغانی کے نظریے میں اگرچہ اسلام کو لندن اور ماسکو دونوں سے خطرہ لاحق تھا، لیکن اصل دشمن برطانیہ تھا۔ ان کے نزدیک برطانیہ کے پاس نہ صرف دنیا پر قبضے کے ذرائع تھے، بلکہ اس کی نیت بھی یہی

تھی۔ ہندوستان پر اس کی گرفت مکمل تھی اور افریقہ و مشرق وسطیٰ میں اس کی بڑھتی ہوئی رسائی اس کی ہوس اقتدار کی مظہر تھی۔ افغانی کسی نیم دل حکمت عملی پر راضی نہ تھے، بلکہ وہ برطانیہ کے خلاف ایک ہمہ گیر اسلامی جہاد کا مطالبہ کرتے تھے۔ انہیں یقین تھا کہ اس اعلان کو مسلم عوام کی وسیع پیمانے پر حمایت حاصل ہوگی۔

شاہ ناصرالدین شاہ فارس کو 1890 میں اس وقت افغانی کی طاقت کا اندازہ ہوا جب انہوں نے تمبا کو کا ٹھیکہ ایک برطانوی کمپنی کو دے دیا۔ افغانی نے تہران میں اقتصادی سامراجیت کے خلاف ایک پمفلٹ شائع کیا اور عوام سے اپیل کی کہ وہ اپنی حکومت کا تختہ الٹ دیں۔ افغانی کی ترغیب پر حجۃ الاسلام حاجی میرزا حسین شیرازی نے ایک فتویٰ جاری کیا:

> ''بنام خداوند رحمن و رحیم، آج تمبا کو کا کسی بھی صورت میں استعمال امام وقت کے خلاف جنگ ہے۔''

آخر کار وہ ٹھیکہ منسوخ کر دیا گیا، لیکن افغانی کے بھڑکائے ہوئے غصے کا لاوا ابھی سرد نہ ہوا تھا۔ مئی 1896 میں شاہ ناصرالدین کو ایک شخص مرزا رضا نے قتل کر دیا جو افغانی کا تربیت یافتہ مرید تھا۔ افغانی کو جنوری 1891 میں ملک بدر کر دیا گیا جس کے بعد وہ بصرہ اور بغداد کی طرف روانہ ہوا۔ وہاں سے وہ لندن گیا، جو اس وقت بھی برطانوی اقتدار کے خلاف بغاوت کی منصوبہ بندی کے لیے ایک موزوں جگہ تھی۔

افغانی برطانیہ کے دل سے اس کی طاقت پر ضرب لگانا چاہتا تھا۔ اسی لیے وہ ان مسلم رہنماؤں پر شدید برہم تھا، جو برطانویوں سے مفاہمت کی بات کرتے تھے، جیسے سر سید احمد خان جنہیں انگلستان کی طرف سے 'سر' کا خطاب ملا تھا، اور جو مسلم و عیسائی دوستی کی وکالت کرتے تھے، حتیٰ کہ قرآن سے استدلال بھی پیش کرتے تھے۔ افغانی نے اس رویے کو اسلامی مقصد سے غداری قرار دیا۔ انہوں نے 28 اگست 1884 کو ایک تباہ کن تنقیدی مقالہ The Materialists in India (''ہندوستان میں دہریے'') کے عنوان سے جاری کیا، جس میں سر سید کو 'دجال'' قرار دیا گیا جو کہ اسلامی اصطلاح میں ''مسیح دجال'' کے ہم معنی ہے۔ افغانی کی ابتدائی سطر ہی مقالے کے تیور طے کر دیتی ہے:

''انگریز ہندوستان میں داخل ہوئے اور اس کے شہزادوں اور بادشاہوں کی عقل سے اس انداز میں کھیلے کہ ہوشمند انسان نہ تو ہنسی روک سکے اور نہ ہی رونا۔''

جہاں تک سرسید کا تعلق ہے:

''انہوں نے اپنے انگریز آقاؤں کی خدمت کے لیے دوسرا راستہ اختیار کیا، مسلمانوں میں تفرقہ ڈال کر ان کی وحدت کو پارہ پارہ کر دیا۔''

افغانی آگے لکھتے ہیں:

''ان کی تعلیمات انگریز حکمرانوں کو بہت بھا گئیں۔ انہوں نے اس کو مسلمانوں کے دلوں کو خراب کرنے کا بہترین ذریعہ پایا۔ انگریزوں نے اس کی حمایت کی، اسے عزت بخشی اور علی گڑھ میں ایک کالج قائم کرنے میں اس کی مدد کی، جسے محمڈن کالج کہا گیا، جو مسلمانوں کے بچوں کو ایک ایسے جال میں پھانسنے کا ذریعہ تھا جس میں وہ افکار و نظریات سیکھیں جو احمد خان بہادر کے تھے۔ احمد خان نے قرآن کی ایک تفسیر لکھی اور آیات کے مفہوم کو بگاڑا، جو کچھ اللہ نے نازل کیا تھا اس میں تحریف کی۔ اس نے تہذیب الاخلاق کے نام سے ایک رسالہ جاری کیا جس میں صرف وہی باتیں شائع کی جاتیں جو مسلمانوں کو گمراہ کریں، ان میں نفاق پیدا کریں، اور ہندوستان کے مسلمانوں اور دیگر مسلمانوں، بالخصوص عثمانیوں کے درمیان عداوت کا بیج بوئیں۔ یہ دہریے انگریزی حکومت کے لیے ایک فوج بن گئے۔ انہوں نے مسلمانوں کے گلے کاٹنے کے لیے تلواریں نکالیں اور ساتھ ہی روتے بھی گئے، اور کہتے گئے: 'ہم تمہیں صرف تم پر رحم کرتے ہوئے قتل کر رہے ہیں تاکہ تمہاری اصلاح ہو اور تمہاری زندگی آسان بنے۔' انگریزوں نے دیکھا کہ یہی وہ سب سے مؤثر طریقہ ہے جس سے اسلام اور مسلمانوں کو کمزور کیا جا سکتا ہے۔''

افغانی کا انجام تنازعے کا شکار رہا۔ لندن میں اس کی دوستی ایک انگریز ولفریڈ بلنٹ سے ہوئی۔

1892 میں اُس کے سرپرست خلیفہ عبدالحمید نے اُسے قسطنطنیہ (استنبول) آنے کی دعوت دی لیکن جلد ہی اسے شک ہوا کہ افغانی کسی برطانوی ایجنٹ کے زیر اثر آ چکا ہے اور ممکنہ طور پر اسے ایک ایسی عرب خلافت کے قیام کے منصوبے میں شریک کرلیا گیا ہے، جیسا کہ دو دہائیوں بعد لارنس آف عریبیہ نے تشکیل دی۔ ایک بھرپور اور متحرک زندگی مایوسی اور تنہائی کے سائے میں اختتام پذیر ہوئی۔ افغانی 1897 میں داڑھی کے نیچے پیدا ہونے والے سرطان کے باعث وفات پا گیا۔

جیسا کہ نکی کیڈی لکھتی ہیں:

''اس کی موت کے وقت اس کے پاس صرف ایک مسیحی خادم موجود تھا۔ نہ تو مشرق میں اس کی وفات پر کوئی خاطر خواہ ردعمل ہوا اور نہ ہی مغرب میں۔ بعد کے ادوار میں جب اس کے عالمی اتحاد اسلامی (Pan-Islamic) پر مبنی مغرب مخالف اور بلا عذر اسلامی نظریات کو مسلم مفکرین کی نئی نسل نے اختیار کیا تو وہ دوبارہ بڑے ذوق وشوق سے پڑھا گیا اور ایک جدید مسلم ہیرو کی حیثیت سے سراہا گیا۔۔۔ افغانی نے اسلام کو ایک محض مذہبی عقیدے سے نکال کر جزوی طور پر ایک سیاسی نظریے میں تبدیل کیا تاکہ مسلمانوں کو مغرب کے خلاف متحد کیا جا سکے۔''

عبدہ نے اگرچہ مسلح جہاد کا نظریہ ترک کر دیا لیکن وہ قرآن کے اصولوں کو جدید معاشرتی اسلوب میں نافذ کرنے کے ذریعے اصلاحات پر کاربند رہے۔ ان کے شاگرد رشید رضا نے ایک جریدہ 'المنار' (چراغِ راہ) کے نام سے جاری کیا۔ ان کے سب سے اہم سیاسی جانشین حسن البنا تھے، جنہوں نے 1928 میں 'جمعیت الاخوان المسلمون' (یعنی اخوان المسلمون، The Muslim Brotherhood) کی بنیاد رکھی۔ عبدہ اور رضا کی پُرامن دعوت بتدریج ایک جامع سماجی، سیاسی، اور ضرورت پڑنے پر عسکری تحریک میں ڈھل گئی۔ اس طرح افغانی کا فکری ورثہ محفوظ ہو گیا۔

ول فریڈ بلنٹ برطانوی ایجنٹ تھا یا نہیں یہ حتمی طور پر نہیں کہا جا سکتا، مگر اتنا طے ہے کہ برطانوی ہر معاملے میں غیر معمولی احتیاط برتتے تھے۔ وہ جہاد کی طاقت اور اس کے خطرات سے بخوبی واقف تھے۔ وہ ابھی ہندوستان میں ایک بڑے جہاد کا سامنا کر چکے تھے، وہی جہاد جو شاہ ولی اللہ نے

1761 میں مرہٹوں کے خلاف شروع کیا تھا، اور جسے ان کے فرزند شاہ عبدالعزیز نے انگریزوں کے خلاف جاری رکھا۔ اس تحریک کا سب سے نمایاں چہرہ سید احمد بریلوی تھے۔

سید احمد بریلوی 1786 میں متحدہ صوبہ جات کے ضلع رائے بریلی میں پیدا ہوئے۔ بیس برس کی عمر میں وہ شاہ ولی اللہ کے قائم کردہ مدرسے میں تعلیم حاصل کی جہاں ان کی دوستی شاہ اسماعیل سے ہوئی جو شاہ ولی اللہ کے پوتے تھے۔ 23–1822 میں جب یہ دونوں حضرات حج پر روانہ ہوئے اس وقت تک ان کی شہرت پھیل چکی تھی۔ بریلوی کی کتاب صراط مستقیم اور شاہ اسماعیل کی تصنیف تقویت الایمان لیتھو پرنٹنگ کے ذریعے شائع ہو چکی تھیں۔ عرب میں سید احمد بریلوی کو ایک ایسی آگ کی راکھ ملی جس کی حدت نے ان کے دل کو گرما دیا۔

محمد بن عبدالوہاب کی پیدائش 1703 میں جزیرہ نما عرب کے علاقے نجد میں ہوئی، یعنی اسی سال جب شاہ ولی اللہ دہلوی پیدا ہوئے۔ ان دونوں کے فکر و نظر پر ایک جیسا درد غالب تھا۔ دونوں نے اسلامی زوال کو ان غیر اسلامی اثرات کا نتیجہ قرار دیا جو دین اسلام کی ابتدائی اور خالص اقدار کو بگاڑ چکے تھے۔ دونوں نے جہاد کی دعوت دی۔ شاہ ولی اللہ نے کفار کے خلاف، جبکہ عبدالوہاب نے دین میں داخل ہونے والی 'بدعات' اور 'منکرات' کے خلاف۔

وہابی تحریک کا آغاز درختوں اور مزارات کو ہدف بنا کر ہوا۔ ان کا کہنا تھا کہ درختوں کی تعظیم جاہلیت کی باقیات ہے اور قبروں پر تعمیرات و عقیدت اولیاء اور آثار کی پرستش کے زمرے میں آتی ہے جو اسلامی احکام کے خلاف ہے۔ ان کے آبائی شہر کے لوگوں کو ان کا یہ تشدد پسند نہیں آیا، چنانچہ وہ 1744 میں درعیہ نامی ایک تجارتی قصبے میں پناہ گزین ہوئے جہاں کے سردار محمد بن سعود نے ان کے پیغام کو قبول کیا۔ سعود نے سونے، چاندی، ریشم اور زیورات جیسی 'فاسقانہ' تعیش پر پابندی عائد کر دی۔ ساتھ ہی موسیقی، رقص اور شاعری پر بھی روک لگا دی۔ ان مذہبی اصلاحات کو میدان جنگ کی فتوحات سے قوت ملی۔

1787 میں عبدالوہاب کی وفات کے بعد بھی تحریک نہیں رکی اور نہ اس کی شدت میں کمی آئی۔ 1791 میں وہابیوں نے مکہ کے شیخ کو شکست دی اور 1797 میں بغداد تک پہنچ گئے۔ 1801 تک

محمد بن سعود کے پوتے سعود بن عبدالعزیز کے زیر کمان ایک لاکھ کے قریب افواج تھیں۔ 1802 میں انہوں نے کربلا پر حملہ کیا۔ 1803 میں مکہ فتح کیا اور اسلام کے اکابرین کی قبروں پر بنی عمارتیں مسمار کر دیں۔ 1804 میں مدینہ پر قبضہ کیا اور خلیج میں برطانویوں سے جھڑپیں بھی ہوئیں۔ خلیفہ سلیم کو اس وقت بڑا جھٹکا لگا جب قسطنطنیہ سے آنے والے حجاج کے قافلے کو حج کی اجازت نہیں ملی۔ یہ ایک ایسا واقعہ تھا جس سے خلافت کی ساکھ کو شدید نقصان پہنچا۔

1812 میں سلطان محمود ثانی نے محمد علی پاشا کو قاہرہ سے ایک لشکر کے ساتھ وہابی تحریک ختم کرنے کے لیے روانہ کیا۔ 1819 میں درعیہ فتح ہو گیا، اور اس کے حکمران عبداللہ بن سعود کو قسطنطنیہ لا کر قتل کر دیا گیا۔ مگر یہ کہانی کا اختتام نہیں تھا۔ ایک صدی بعد آل سعود برطانیہ کی مدد سے دوبارہ عرب کے حاکم بنے۔

وہابی تشدد نے ہندوستان میں بھی جڑ پکڑ لی۔ اگرچہ وہابی اور ولی اللٰہی تحریکوں میں فکری مشابہت نہیں تھی لیکن انگریزوں کو یقین تھا کہ ان دونوں کا جوہر ایک ہی ہے۔ برطانوی حکومت نے ہندوستان میں جاری جہاد کو ''وہابی تحریک'' کا نام دیا۔ سید احمد بریلوی ظاہری طور پر نرم گو، سکون پسند اور بعض اوقات وجد میں آنے والے ایک درویش صفت انسان تھے۔ وہ درمیانے قد کے تھے اور ان کی لمبی داڑھی سینے تک پہنچتی تھی۔ انہوں نے اپنے وعظ میں تین نکات کو مرکز بنایا: اللہ کی توحید، انسانوں کی برابری، اور ہندوستانی اسلام کی آلودگی جو مشرکانہ اور توہم پرستانہ، ہندوانہ اثرات سے پیدا ہوئی تھی۔

سر ولیم ہنٹر کو برطانوی حکومت نے ہندوستان کے مسلمانوں کو سمجھنے کی غرض سے مامور کیا تھا۔ انہوں نے اپنی رپورٹ The Indian Mussalmans (پہلی بار 1871 میں شائع ہوئی) میں سید احمد بریلوی کو ''ڈاکو'' اور ''جعلساز'' قرار دیا۔ تاہم وہ یہ اعتراف بھی کرتے ہیں:

''انہوں نے ایک ایسی مذہبی جبلت کو جگایا جو ان کے ہم وطنوں کی روحوں میں طویل عرصے سے ماند پڑ چکی تھی، اور جس پر ہندومت سے صدیوں کے میل جول نے توہمات کی تہیں چڑھا دی تھیں۔ یہ توہمات اسلام کے اصل جوہر کو تقریباً دبا چکی تھیں ... مجھے اس بات کا پختہ یقین ہے کہ سید احمد کی

زندگی میں ایک ایسا دور ضرور آیا تھا جب ان کا دل سچے جذبے کے ساتھ اپنے ہم وطنوں کی نجات کے لیے تڑپ رہا تھا اور ان کی توجہ صرف خدا کی طرف مرکوز تھی۔‘‘

سید احمد بریلوی نے ہندوستان کے تین اہم صوفی سلسلے چشتی، نقشبندی اور قادری کو اپنی اصلاحی تحریک میں شامل کیا جسے انہوں نے ’طریق محمدیہ‘ (یعنی ’’محمد صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کا راستہ‘‘) کا نام دیا۔ 1821 میں انہوں نے پٹنہ میں اس تحریک کا مرکز قائم کیا جہاں سے مبلغین کا ایک مضبوط نیٹ ورک دیہی علاقوں میں پھیل گیا۔ جب وہ گنگا کے راستے کلکتہ کی بندرگاہ سے حج کے لیے روانہ ہوئے تو عوام کا جوش وخروش دیدنی تھا۔ اور جب وہ اکتوبر 1823 میں واپس آئے تو ان کا استقبال ایک روحانی رہنما کے شایان شان تھا۔ ان کے مرید انہیں مہدی کہنے لگے تھے اور وہ ان مسلمانوں کے لیے امید کی علامت بن چکے تھے جو اپنے سلاطین اور اشرافیہ سے مایوس ہو چکے تھے۔

1824 میں انہوں نے پشاور کے آس پاس افغان قبائل سے ملاقات کی اور وہاں سکھ مظالم کی داستانیں سنیں۔ انہوں نے ان قبائل سے وعدہ کیا کہ وہ ان کے دفاع میں جہاد کریں گے۔ 21 دسمبر 1826 کو ایک فتویٰ جاری کیا گیا، اور 1830 میں ان کے مجاہدین نے پشاور پر قبضہ کر لیا۔ ایسا کارنامہ جس کی کسی کو توقع نہ تھی۔ انہوں نے اپنے نام کے سکے جاری کروائے جن پر درج تھا: ’’احمدِ عادل، محافظِ دین، جس کی تلوار کی چمک کافروں میں تباہی پھیلائے۔‘‘

مگر قسمت کو کچھ اور ہی منظور تھا۔ ایک سکھ فوج نے ان کا تعاقب کیا اور 1831 میں جب وہ اودھ کی طرف واپسی کی کوشش کر رہے تھے انہیں شہید کر دیا۔ برطانوی پالیسی ہمیشہ سے یہی رہی تھی کہ دشمن کو تو کمزور کیا جائے مگر کسی اور کو طاقتور نہ بننے دیا جائے۔ سکھ سلطنت کے اندر جاری اس جہاد سے وہ زیادہ پریشان نہیں ہوئے لیکن جب اس تحریک کی لہر برطانوی علاقوں تک پہنچنے لگی تو ان کی تشویش بڑھ گئی۔ یہ تشویش اس وقت خوف میں بدل گئی جب بنگال کے قصبے باراسات کے علاقے چندپور سے تعلق رکھنے والے نثار علی نے بغاوت کر دی۔ وہ بعد ازاں ٹیٹو میاں کے نام سے مشہور ہوئے۔ وہ سید احمد بریلوی سے ملاقات کر چکے تھے۔ بنگالی ہندو زمینداروں کے ظالمانہ اقتصادی اقدامات کے خلاف انہوں نے علم بغاوت بلند کیا۔

شہادت سے اس تحریک کو نئی زندگی ملی۔ فضا میں بغاوت کی بو تھی مگر یہ بغاوت نہ کسی قیادت کے زیر اثر تھی اور نہ ہی کسی واضح سمت کی حامل۔ یہ محض جذبات کے سہارے ابھرنے والی بے ربط تحریک تھی جس کے مختلف گروہ ہندوستان کے گوشے گوشے میں منتشر تھے اور ہر طرف بے چینی کو ہوا دے رہے تھے۔ یہی بے چینی بعد ازاں 1857 کی اس ہنگامہ خیز بغاوت میں ڈھلی جسے تاریخ میں ''غدر'' کے نام سے یاد کیا جاتا ہے۔

اس تحریک کا ایک جنگی ترانہ ''رسالۂ جہاد'' شہادت کے فضائل کو اجاگر کرتا ہے اور بغاوت کی نیتوں کو بے نقاب کرتے ہوئے اعلان کرتا ہے کہ ''ہندوستان کے ایک سرے سے دوسرے سرے تک اسلام کے پھیلاؤ، یہاں تک کہ صرف 'اللہ! اللہ!' کی صدائیں سنائی دیں۔''

شہروں میں اس بغاوت کی بازگشت شاعری کی صورت بھی سنائی دینے لگی۔ کانپور کے مولوی کرم علی نے ایک قصیدہ لکھا جس میں کفار کے خلاف جہاد کو فرض قرار دیا گیا جبکہ مولوی نعمت اللہ نے ایک نظم میں ایک ایسے بادشاہ کی آمد کی پیش گوئی کی جو عیسائی ''نصاریٰ'' سے مسلمانوں کو ''تلوار کے ذریعے مقدس جنگ'' میں نجات دلائے گا۔ مولوی محمد علی نے ایک اور ''مہدی'' کی کامیابی کو نہایت پر جوش انداز میں بیان کیا: ''یہاں تک کہ حکومت کی بُو تک ان کے سروں اور دماغوں سے نکل گئی۔'' تحریک کا نظریاتی حلقہ وقتی شکستوں سے مایوس نہیں ہوا۔

1857 کے ناکام غدر کے بعد بھی ان کا حوصلہ پست نہیں ہوا اگرچہ وہ تنہائی کا شکار ضرور ہو گئے۔ دہلی سے 1867 میں شائع ہونے والے ایک پمفلٹ ''جامع تفسیر'' میں واضح انداز میں لکھا گیا کہ ہندوستان کے مسلمانوں کے سامنے صرف دو راستے ہیں: یا تو جہاد کریں یا اس خطے کی طرف ہجرت کر جائیں جہاں اسلام کا غلبہ ہو کیونکہ موجودہ ہندوستان ''دارالحرب'' یعنی جنگ کی سرزمین بن چکا ہے۔ پمفلٹ میں ان لوگوں کو ''منافق'' قرار دیا گیا جو مسلمانوں کو جہاد سے روکتے ہیں۔ اس کا متن کچھ یوں تھا:

> ''سب جان لیں کہ جس ملک میں مذہب اسلام کا غلبہ نہ ہو وہاں اسلامی احکام نافذ نہیں کیے جا سکتے۔ مسلمانوں پر فرض ہے کہ متحد ہو کر کفار کے خلاف جنگ کریں۔

جو اس جنگ میں شریک نہ ہو سکے اس پر لازم ہے کہ دار الاسلام کی طرف ہجرت کرے۔ اے بھائیو! ہمیں اپنی حالت پر رونا چاہیے کیونکہ رسول خدا صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم ہم سے ناراض ہیں کہ ہم کفار کی سرزمین میں رہائش پذیر ہیں۔ اور جب خود نبی اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم ہم سے ناخوش ہوں تو ہم کس کے پاس پناہ لیں گے؟''

1865 میں پٹنہ کے مجسٹریٹ نے اپنی تشویش کا اظہار کچھ یوں کیا:

''حکومتی افسران کی ناک کے نیچے، بلکہ ان کی سرپرستی میں، انہوں نے ہمارے سب سے گنجان آباد اضلاع کے ہر گاؤں میں کھلے عام بغاوت کی تبلیغ کی ہے، مسلمانوں کے ذہنوں کو منتشر کیا ہے اور ایسا زبردست اثر و رسوخ قائم کیا ہے جو بلاشبہ نقصان دہ ہے۔''

سر ولیم ہنٹر نے اعتراف کیا:

''ہمارے صوبوں میں سازشوں کا ایک منظم جال پھیل چکا ہے، اور پنجاب سے آگے جو سنگلاخ پہاڑیاں ہیں وہ ایک مربوط زنجیر کی صورت میں ان مرطوب اور دلدلی علاقوں تک جا پہنچتی ہیں جہاں دریائے گنگا سمندر سے ملتا ہے۔ انگریزوں کے بقول جہاد ہندوستان میں برطانوی اقتدار کے لیے ایک مسلسل اور سنگین خطرہ بن چکا ہے۔

1850 سے 1857 کے درمیانی عرصے میں، یعنی بغاوت سے پہلے کے برسوں میں، برطانوی حکومت کو مختلف علاقوں میں بغاوتوں کو دبانے کے لیے سولہ بڑی فوجی مہمات روانہ کرنی پڑیں، جن میں 33000 باقاعدہ سپاہی شامل تھے۔ اس تمام صورت حال نے انگریزوں کو اس بات پر مجبور کیا کہ وہ مسلمانوں کو ایک ایسی قوم کے طور پر دیکھیں جو ان کے اقتدار کے لیے ہمہ وقت خطرہ بنی ہوئی ہے۔''

ہنٹر لکھتے ہیں:

''تقریباً تیس برس پہلے یوں محسوس ہوتا تھا جیسے جنوبی ہندوستان کے قلب میں ایک مذہبی جنونی اتحاد مضبوطی سے قائم ہو چکا ہے۔ سر بارٹل فریر نے مجھے مطلع کیا تھا کہ

اس وقت کی وہابی تنظیم میں نظام حیدر آباد کے ایک بھائی بھی شامل تھے جنہیں حیدر آباد کے تخت پر بٹھایا جانا تھا... ہمیں اصل خطرہ ان غداروں سے نہیں بلکہ ہماری سلطنت کے مرکز میں موجود وہ بغاوت پر آمادہ عوامی گروہ ہیں... اور کوئی پیش گوئی نہیں کی جاسکتی کہ یہ شورش پسند کیمپ جو مغرب سے آنے والے مسلمان لشکروں کی پشت پناہی سے قائم ہو، کسی ایسے رہنما کے تحت کس حد تک پھیل سکتا ہے جو ایشیا کی اقوام کو ہلالی جہاد (Crescentade) میں یکجا کرنے کی صلاحیت رکھتا ہو۔''

مسلمانوں کو ''وہ طبقہ قرار دیا گیا ہے جسے ایک کے بعد دوسری حکومت نے ہمیشہ ہندوستانی سلطنت کے لیے مستقل خطرہ تصور کیا ہے۔'' جب 1857 کی بغاوت کے بعد اقتدار ایسٹ انڈیا کمپنی سے تاج برطانیہ کو منتقل کیا گیا، تو اس اعلان کے لیے نقارے بجوائے جانے کے وقت یہ حکم دیا گیا کہ ''مسلمانوں کے محلوں میں آواز کی شدت بڑھا دی جائے۔''

برطانوی پالیسی کو بجا طور پر اس بات کا اندازہ تھا کہ مسلمان ان کے سب سے زیادہ پرعزم مخالف رہیں گے کیونکہ وہی برطانوی فتوحات کے سب سے بڑے متاثرین تھے۔ 1860 کی دہائی میں پٹنہ میں وہابی قیادت کے خلاف سازش کے مقدمات چلائے گئے۔ اگرچہ ان واقعات کا وہابی جذبات سے براہ راست تعلق نہیں تھا، لیکن پھر بھی یہ ریکارڈ کیا گیا کہ 1872 میں انڈمان جزائر کے دورے کے دوران ایک مسلمان قیدی نے وائسرائے لارڈ مایو کو قتل کر دیا۔ یہ قاتل ایک افغان تھا۔

یہ لارڈ مایو ہی تھے جنہوں نے وہ سوال اٹھایا جس کا جواب ولیم ولسن ہنٹر سے طلب کیا گیا۔ بنگال سول سروس کے رکن اور بعد میں ہندوستان کے پہلے ڈائریکٹر جنرل برائے شماریات بننے والے ڈاکٹر ہنٹر نے 1871 میں ایک اہم رپورٹ مرتب کی جس کا عنوان تھا: The Indian Mussalmans: Are They Bound in Conscience to Rebel Against the Queen? یعنی ہندوستانی مسلمان: کیا وہ ضمیر کی آواز پر ملکہ کے خلاف بغاوت کے پابند ہیں؟ اگرچہ ڈاکٹر ہنٹر تعصب سے مبرا نہیں تھے لیکن ان کے جوابات نے حکومت، ہندو اشرافیہ اور ان تعلیم یافتہ طبقوں پر گہرا اثر چھوڑا جنہیں طنزیہ طور پر 'بنگالی بابو' کہا جاتا تھا۔ ہنٹر نے ہندوؤں اور مسلمانوں کو ایک

دوسرے کا بدترین دشمن قرار دیا۔ ان کے نزدیک مسلمانوں کی وفاداری خلافت عثمانیہ سے لے کر چین تک کی بیرونی طاقتوں سے وابستہ تھی، جب کہ ہندو 'حقیقی مقامی باشندے' تھے۔ ان کے بقول 'ہندو بلاشبہ اعلیٰ دماغی صلاحیت کے مالک تھے لیکن مسلمان ایک 'اعلیٰ نسل' تھے، کم از کم جب تک انگریز نہیں آئے کیونکہ ان میں سیاسی تنظیم اور بہادری موجود تھی۔'

ڈاکٹر ہنٹر نے جن مسلم علما سے مشورہ کیا ان کا اس بنیادی سوال پر جواب بہت واضح تھا:

کیا مسلمان اپنے ضمیر کے مطابق انگریز ملکہ کے خلاف بغاوت کرنے کے پابند ہیں؟

جواب تھا: نہیں۔

حنفی، مالکی اور شافعی مکاتبِ فکر نے فتویٰ دیا کہ جب تک انگریز حکومت میں اسلامی قانون پر عمل کی اجازت ہے (یعنی مسلم پرسنل لا) تب تک ہندوستان ''دارالاسلام'' ہے۔ اس سے کوئی فرق نہیں پڑتا کہ حکومت مسلمانوں کے ہاتھ میں ہے یا عیسائیوں کے ہاتھ میں۔ اہم بات یہ ہے کہ مسلمان اپنے دین کے مطابق زندگی گزار سکتے ہوں۔

شیعہ علما نے اس سوال پر نسبتاً عملی اور چالاکی سے بھرپور موقف اختیار کیا: جہاد اسی وقت واجب ہوتا ہے جب لشکرِ اسلام کی قیادت ایک جائز امام کر رہا ہو، جب ہتھیار کافی ہوں، جب سپاہی تجربہ کار ہوں، جب جرنیلوں میں فہم و فراست ہو، اور جنگ کے لیے سرمایہ موجود ہو۔ چونکہ ایسا کوئی بھی جرنیل یا وسائل موجود نہیں تھے، اس لیے جہاد کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا تھا۔

اس سوال کے جواب کے بعد ہنٹر اور ان کے ساتھی برطانوی افسران نے ایک اور مسئلہ اٹھایا: راج (برطانوی حکومت) ان 'گمراہ وہابیوں' کے اثر سے مسلمانوں کو کیسے نکالے؟

جواب تھا: تعلیم۔

وہابیوں کے خلاف عدالتی کارروائیوں کے نگران جیمز او کینیلی لکھتے ہیں: ''مسلم دیہاتیوں میں وہابی نظریات کی مقبولیت کا سبب میں اپنی تعلیمی غفلت کو سمجھتا ہوں۔''

1870 میں حکومت ہند کے ہوم سیکرٹری ای سی بیلی کا تبصرہ تھا:

''کیا اس بات پر حیرت ہونی چاہیے کہ مسلمانوں نے ایسے تعلیمی نظام سے کنارہ کشی اختیار کی، جو اپنی نوعیت میں ان کے مذہبی جذبات سے مطابقت نہیں رکھتا تھا، اُن کی ضروریات کو تسلیم نہیں کرتا تھا، اوران کے مفادات سے متصادم تھا؟'' نتیجہ یہ نکالا گیا کہ انہیں تعلیم دی جائے ان کے غصے کو کم کیا جائے اور انہیں نظام کا حصہ بنایا جائے۔

برطانوی ہندوستان کی پہلی مردم شماری 1872 میں ہوئی۔ اس میں آبادی کو چار زمروں میں تقسیم کیا گیا: آریہ (برہمن اور راجپوت)، مخلوط نسلیں، قدیم باشندے اور مسلمان۔ یہ تقسیم کم از کم اس وقت کی سماجی ساخت کی ایک جھلک ضرور پیش کرتی ہے۔ 1881 کی مردم شماری کے مطابق ہندوستان میں پانچ کروڑ سے زائد مسلمان آباد تھے جو کل آبادی کا تقریباً پانچواں حصہ بنتے تھے۔ ان میں سے چالیس فیصد بنگال میں رہتے تھے۔ یہ دو کروڑ بنگالی مسلمان، اس وقت کے صوبہ بنگال کی نصف سے زیادہ آبادی پر مشتمل تھے۔ دس ملین مسلمان پنجاب میں تھے۔ دریائے گنگا کے کنارے چودہ فیصد یا چھ ملین سے بھی کم مسلمان آباد تھے۔ یہ شرح آج بھی کچھ خاص تبدیل نہیں ہوئی۔ پنجاب میں مسلمان پنجابی بولتے تھے، بنگال میں بنگالی، اور یوپی و بہار میں اشرافیہ اردو بولتی تھی جبکہ عوام مقامی بولیاں استعمال کرتے تھے۔

1857 کے بعد پرانے اشرافیہ کے ختم ہو جانے کے ساتھ علمائے دین کو ان کی ہنگامی بغاوتوں کے بعد خاموش کر دیا گیا تھا۔ یوں مسلمانوں کی قیادت اس طبقے کے ہاتھ آ گئی جسے ''اشرافیہ'' یا ''شریف'' طبقہ کہا جاتا ہے، وہی جسے ہنٹر نے ''متکبر غیر ملکی'' کہا تھا۔ یہ بات کچھ حد تک درست بھی تھی کیونکہ شریف طبقہ خود کو وسط ایشیا اور فارس سے جوڑتا تھا۔ اس کی ایک دلچسپ مثال سید محمود کی ہے جو سر سید احمد خان کے چھوٹے بیٹے تھے۔ 1869 میں وہ لندن میں انڈیا آفس میں بیٹھے ہوئے The People of India (ہندوستان کے لوگ) نامی نئی شائع شدہ کتاب کے نیم برہنہ دیسی باشندوں کی تصاویر دیکھ رہے تھے۔ ایک انگریز نے آ کر پوچھا: ''کیا آپ ہندوستانی ہیں؟'' سید محمود نے نظریں اٹھا کر ہچکچاتے ہوئے کہا: ''جی، لیکن ابورجین (Aborigine قدیم باشندہ)

نہیں!'' اور وضاحت کی کہ ان کے آباواجداد غیر ملکی تھے۔

یہ رویہ بیسویں صدی میں ابھرتی ہوئی جمہوری سیاست پر گہرے اثرات چھوڑ گیا۔ ایک طرف مسلمانوں پر یہ الزام زور پکڑنے لگا کہ وہ ہندوستان میں رہتے تو ہیں لیکن ان کی وفاداریاں کسی اور ملک سے جڑی ہوئی ہیں۔ خلافت عثمانیہ کے ساتھ مسلمانوں کی جذباتی وابستگی اور مہاتما گاندھی کی قیادت میں خلافت کے تحفظ کی تحریک نے اس بیانیے کو مزید تقویت دی۔ بعد میں مسلم لیگ کا مطالبہ برائے علیحدہ وطن اس تاثر کی مکمل تصدیق بن گیا۔

تاہم مسلم رویے میں ایک داخلی تضاد بھی موجود تھا۔ وسطی ہندوستان کے اشرافیہ، جن کے چہرے سفید اور آنکھیں بادامی تھیں، مقامی نومسلم یا نچلی ذاتوں سے تعلق رکھنے والے مسلمانوں کو حقارت سے دیکھتے تھے۔ ان کے نزدیک ''اصل مسلمان'' وہی تھے جو جسمانی طور پر طاقتور اور جنگجو نسلوں سے آئے تھے۔ 1870 کی دہائی میں ڈھاکہ کے ایک سول سرجن ڈاکٹر جیمز وائز نے مشرقی بنگال کے مسلمانوں پر تحقیق کی۔ ان کے مطابق ہندو اور مسلمان میں فرق صرف داڑھی اور لنگی یا دھوتی کا تھا۔ مسلمان رنگین لنگی کو پسند کرتے تھے اور ہندو سادہ سفید دھوتی کو۔ جیل میں پچاس ہندوؤں اور مسلمانوں کا موازنہ کرنے پر بھی عمر، قد، وزن یا سینے کی چوڑائی میں کوئی فرق نہیں پایا گیا۔

پٹھانوں، ترکوں، شیخوں اور سادات کی اولاد، کمزور جسم کے حامل بنگالی مسلمانوں کو ''حقیقی مسلمان'' تسلیم کرنے کو تیار نہ تھی۔ یہ نسلی تعصب نہ صرف بنگالی زبان جیسے خوبصورت لسانی ورثے کی نفی کا سبب بنا بلکہ کلکتہ میں برٹش راج کے کلرک و مجسٹریٹ ''بنگالی بابو'' بھی طنز و تمسخر کا نشانہ بنے۔ یہی نسلی تفاخر بعدازاں پاکستان کے ٹوٹنے اور 1971 میں بنگلہ دیش کے قیام کا سبب بنا۔

اس ذہنی رویے کا ایک غیر متوقع اثر بھی سامنے آیا۔ کلکتہ اور بنگال کے ہندو اشرافیہ جن میں پریذیڈنسی کالج سے فارغ التحصیل دانشور، لارڈ میکالے کی انگریزی زبان سے متعلق پالیسی کے تربیت یافتہ افراد (جنہیں بھدرلوک کہا جاتا تھا) جن میں زمیندار طبقہ شامل تھا، ان لوگوں نے مسلم کسان طبقے سے شدید نفرت کا اظہار کیا، اور اس نفرت کو ہندوستانی سماج کی روایتی لعنت یعنی ذات پات کے تعصب سے مزید تقویت ملی۔ بھدرلوک طبقے کو شمالی ہند کے مسلم شرفا سے کوئی مسئلہ نہیں تھا،

مگر بنگالی مسلمانوں کو وہ کمتر سمجھتے تھے، کیونکہ ان کے نزدیک وہ ہندو سماج کے نچلے طبقے سے مسلمان ہونے والے افراد تھے۔ یہی رویہ بعد میں بنگال کو تقسیم در تقسیم کی سیاست کا مرکز بن گیا۔

کہا جاتا تھا... اور یہ بات اکثر بنگالی خود ہی کہتے تھے، حالانکہ وہ اس خیال کے موجد نہیں تھے کہ ''جب بنگال کو زکام ہوتا ہے تو پورے ہندوستان کو چھینک آتی ہے''۔ لیکن جب مسلم اکثریتی صوبے میں بالغ رائے دہی کا تصور بھدرلوک کے لیے ناقابل برداشت ہو گیا، تو ہندوستان کو محض زکام نہیں ہوا بلکہ اسے ''تقسیم'' کا جان لیوا مرض لاحق ہو گیا۔

مسلمانوں کی صدیوں پر محیط حکمرانی کے باوجود ان کی اکثریت کو اس اقتدار سے کوئی مادی فائدہ نہیں پہنچ سکا۔ پنجاب اور بنگال کے مسلمان یا تو غربت و جہالت کے شکار کسان تھے یا پھر وہ شہری مزدور جو مقامی صنعتوں کے لیے سرمایہ میسر نہ ہونے کے باعث برطانوی کارخانوں میں کام کرنے پر مجبور ہو گئے تھے۔ دیہی علاقوں میں زمین کی ملکیت یا ظالمانہ شرح سود پر قرض دینے جیسے ذرائع سے معاشی طاقت ایک محدود ہندو طبقے کے ہاتھ میں مرتکز ہو گئی تھی۔ (واضح رہے کہ ہندو کسانوں کی حالت بھی مسلمانوں سے کچھ بہتر نہیں تھی)

بنگال اور پنجاب میں جہاں لسانی، ثقافتی اور نسلی طور پر ہندو اور مسلمان ایک دوسرے سے نسبتاً قریب تر تھے، یہ معاشی تفریق تحریکِ تقسیم کے فروغ میں ایک اہم کردار ادا کرنے لگی۔ متحدہ صوبہ (یو پی) اور بہار میں مسلمانوں کی معاشی حالت اگرچہ مختلف نہیں تھی، مثلاً محض تین فیصد مسلمان ہی خواندہ تھے، مگر وہاں کا مسلم اشرافیہ طبقہ ثقافتی اور جذباتی طور پر اپنی ہی برادری سے قریب تر تھا، اور ہندوؤں سے زیادہ گہرے روابط نہیں رکھتا تھا۔

ناکام جہاد کے بعد انگریزوں نے مسلمانوں میں علما کے بجائے اشرافیہ کے ساتھ معاملات طے کرنے میں کہیں زیادہ سہولت محسوس کی، جیسے وہ ہندوؤں کے معاملے میں وکلا اور ابھرتے ہوئے پیشہ ور متوسط طبقے کو ترجیح دیتے تھے۔ یہ وہ طبقے تھے جنہیں انگریز اپنی حکمرانی کی زبان یعنی انگریزی سکھا سکتے تھے اور جنہیں وہ ریاستی نظم و نسق میں شامل کیے جانے کے قابل سمجھتے تھے۔

انگریزی راج کے دوران ہندوؤں اور مسلمانوں کے درمیان جو کشمکش جاری رہی وہ درحقیقت ایک ذہنی اور فکری جنگ تھی۔ دونوں قوموں کی دانشورانہ قیادت جو اقتدار کی حدود سے باہر تھی، کسی بڑے مقصد کی تلاش میں بغاوت کے لیے آمادہ ہو چکی تھی۔ 1857 سے 1947 تک کے نوے برسوں کی تاریخ کو عمومی طور پر نتائج کی عینک سے دیکھا گیا ہے، نہ کہ ان اسباب کی روشنی میں جو ان نتائج تک لے گئے۔ اس تاریخ کو اکثر 1947 کے بعد کے بھارت اور پاکستان اور 1971 کے بعد کے بنگلہ دیش کے نظریاتی تناظر میں سے سمجھنے کی کوشش کی گئی ہے، بجائے اس کے کہ اسے ان عوامل کے تناظر میں پرکھا جائے جو برصغیر کی عظیم تقسیم کی بنیاد بنے۔

چونکہ تقسیم ہند کو مسلم علیحدگی پسندی کی ایک بڑی کامیابی سمجھا گیا، اس لیے مسلمان ذہن کی فکری ترقی کو مغلیہ سلطنت کے زوال کے بعد کی مایوسی سے لے کر تحریکِ پاکستان کی زبان اور سیاست تک کے سفر کے طور پر دیکھنا ایک فطری بات بن گئی۔ یہ وہ فکری سفر ہے جو اردو شاعری میں نمایاں انداز سے جھلکتا ہے جہاں جذبات، سوالات اور امیدیں اشعار میں سمٹ آتی ہیں۔ یہی سفر ہمیں غالب کی شاعری میں دکھائی دیتا ہے جہاں وہ اپنے دور کے زوال کو طنز اور رمز کے ذریعے بیان کرتے ہیں، اور ان کی زبان وقت کی قید سے آزاد محسوس ہوتی ہے۔ پھر اکبر الہ آبادی کا نام آتا ہے جن کی طنزیہ شاعری ایک طرف انگریز حکمرانوں پر چوٹ کرتی ہے تو دوسری طرف اپنی ہی قوم کی سستی اور غفلت کو نشانہ بناتی ہے۔ اس کے بعد اقبال کا دور آتا ہے جو ایک سوالی مسلمان کی فکری بے چینی، خودی کی تلاش اور نئی امیدوں کو شعری زبان دیتے ہیں۔ اگرچہ بعض ناقدین نے انہیں اردو کا رڈیارڈ کپلنگ ((Rudyard Kipling انگریز نژاد مشہور ادیب اور شاعر جنہیں برطانوی سامراج کا ترجمان سمجھا جاتا ہے) کہہ کر رد کیا لیکن اقبال دراصل ان جذبات کی ترجمانی کرتے ہیں جو اس وقت کے مسلمان کے دل میں موجزن تھے۔

اقبال کا سب سے معروف اور پر اثر کلام 'شکوہ' دراصل اللہ تعالیٰ سے ایک شکوہ ہے، ایک ایسا ''قصۂ درد'' جو برصغیر کے مسلمانوں کے اجتماعی درد، احساسِ محرومی اور فکری بیداری کا نقیب بن گیا۔ یہ نظم پہلی بار 1909 میں لاہور کے ایک مشاعرے میں پیش کی گئی، جہاں اسے غیر معمولی پذیرائی ملی اور

یوں یہ نظم مسلمانوں کے جذبات کی آواز بن گئی۔ ''شکوہ'' محض ایک فریاد نہیں بلکہ ایک جرات مندانہ سوال تھا، ایک دل شکستہ قوم کا اپنے رب سے مکالمہ، جس میں شاعر پوچھتا ہے: جب ہم نے وفاداری میں کوئی کسر نہ چھوڑی تو تیری طرف سے بے وفائی کیوں؟

تاریخ اسلام میں شاید یہ پہلا موقع تھا کہ کسی مومن نے اپنے خالق سے اس درجہ بے باکی سے سوال کیا تھا کہ کیا یہ معاہدہ یکطرفہ تھا؟ کیا بندگی کا صلہ محرومی ہے؟ اقبال کے ان جذباتی اشعار کا انگریزی ترجمہ ممتاز ادیب خوشونت سنگھ نے بھی کیا تھا جو 1981 میں آکسفرڈ یونیورسٹی پریس، دہلی سے شائع ہوا۔ چند اشعار ملاحظہ ہوں جو اس فکری درد کی شدت کو آشکار کرتے ہیں:

ہے بجا شیوۂ تسلیم میں مشہور ہیں ہم
قصۂ درد سناتے ہیں کہ مجبور ہیں ہم

ہم نے تسلیم و رضا کی راہ کو اپنا شعار بنایا، مگر آج دل کا درد کہنے پر مجبور ہیں۔

آ گیا عین لڑائی میں اگر وقت نماز
قبلہ رو ہو کے زمیں بوس ہوئی قومِ حجاز

ایک ہی صف میں کھڑے ہو گئے محمود و ایاز
نہ کوئی بندہ رہا اور نہ کوئی بندہ نواز

بندہ و صاحب و محتاج و غنی ایک ہوئے
تیری سرکار میں پہنچے تو سبھی ایک ہوئے

جب معرکۂ جنگ میں اذان کی صدا گونجی
تو اہل حجاز نے تلواریں روک کر سجدہ کیا

بادشاہ و غلام، امیر و فقیر، سب تیرے حضور ایک صف میں کھڑے ہو گئے۔ تیرے دربار میں سبھی برابر ہو گئے، کوئی ادنیٰ نہ رہا، کوئی اعلیٰ نہ بچا۔ مگر اس بندگی کا صلہ کیا ملا؟

امتیں اور بھی ہیں ان میں گناہگار بھی ہیں
عزّت والے بھی ہیں، مست مئے پندار بھی ہیں

ان میں کاہل بھی ہیں، غافل بھی ہیں، ہوشیار بھی ہیں
سینکڑوں ہیں کہ ترے نام سے بیزار بھی ہیں

رحمتیں ہیں تری اغیار کے کاشانوں پر
برق گرتی ہے تو بے چارے مسلمانوں پر؟

دنیا میں اور بھی اقوام ہیں، جن میں خطا کار بھی ہیں، کچھ عزت والے ہیں، کچھ غرور میں مست۔ کچھ سست اور غافل ہیں، کچھ دانا و بینا اور سینکڑوں تو ایسے بھی ہیں جو تیرے نام سے ہی بیزار ہیں۔ لیکن تیرے انعامات اور رحمتیں انہی کے آنگن میں برستی ہیں جبکہ تیری بجلی گرتی ہے تو صرف ہم غریب مسلمانوں پر؟ یہ اشعار اقبال کے اس کرب، اس بے چینی اور اس تڑپ کا آئینہ ہیں جو انہوں نے امت مسلمہ کی گرتی ہوئی حالت کو دیکھ کر محسوس کی۔ یہی شکوہ آگے چل کر ان کے دوسرے عظیم کلام ''جوابِ شکوہ'' کی صورت میں ایک فکری بیداری کا پیغام بن گیا، جو نہ صرف روح کو جھنجھوڑتا ہے بلکہ ضمیر کو بھی آواز دیتا ہے۔

انیسویں صدی میں علما انگریزوں کے خلاف جنگ ہار گئے۔ اس شکست کے بعد ہندوستانی مسلمانوں نے اپنے اظہار اور جدوجہد کے نئے راستے تلاش کیے۔ کبھی سیاست کی طرف رجوع کیا، کبھی تعلیم کو ذریعہ بنایا، اور جیسا کہ اقبال کی مثال سے ظاہر ہوتا ہے، بعض اوقات شاعری کو بھی اپنے درد وفکر کا وسیلہ بنایا۔ مایوسی کی کئی صورتیں ہوتی ہیں، اور بالآخر انہی میں سے ایک صورت نے تشدد کا روپ بھی اختیار کر لیا۔

# 11

## اقتدار کی دہلیز پر تفریق کی آہٹ

’’کابل ایمبیسی میں سب خیریت ہے۔‘‘

[یہ وہ آخری تار تھا جو میجر سر پیئر لوئس نیپولین کاواگناری نے 2 ستمبر 1879 کو ہندوستان میں وائسرائے کو بھیجا تھا... اپنی وفات سے محض ایک دن قبل]

افغانستان کے داخلی معاملات میں مداخلت کرنے والا پہلا امریکی ایک کوئیکر (یعنی ایک پرہیز گار اور امن پسند مسیحی فرقے کا پیروکار) تھا، جس کا تعلق امریکی ریاست پینسلوانیا سے تھا اور اس کا نام جوزیاء ہارلن بھی ایک ایسا نام تھا جسے ایک بار سننے کے بعد بھولنا دشوار تھا۔ وہ ایلیہو ییل کی طرح مشرق کی جانب اپنی تقدیر آزمانے نکلا تھا، باقی سب کچھ محض ایک سنسنی خیز تجربے کا حصہ تھا۔

1823 میں طبی تعلیم کے کسی باضابطہ پس منظر کے بغیر اس نے بنگال آرٹلری میں بطور معاون سرجن شمولیت اختیار کی اور برما کی جنگ میں حصہ لیا۔ 1826 میں وہ شمال کی جانب روانہ ہوا اور پنجاب کے ایک چھوٹے مگر اہم قصبہ لدھیانہ پہنچا جہاں ایک بے تاج بادشاہ نے اس کی توجہ اپنی جانب مبذول کر لی۔ شاہ شجاع جسے کابل میں دوست محمد خان نے معزول کر دیا تھا، انگریزوں کی پناہ میں آ چکا تھا۔ انگریز اب اس شطرنج کی بازی پر مہروں کی اہمیت سمجھنے لگے تھے۔ افغانستان میں اقتدار کی کشمکش خاندانی سطح پر گویا موروثی تھی۔ مثال کے طور پر دوست محمد خان بہتر (72) بھائیوں یا

سوتیلے بھائیوں کا بھائی تھا اور بہنوں کی گنتی تب شاید ضروری نہیں سمجھی جاتی تھی۔

ہارلن کا دعویٰ تھا کہ اس نے شاہ شجاع کے لیے کابل میں جاسوسی کی غرض سے درویش کا بھیس اختیار کیا، جس کا صلہ یہ ملا کہ اسے 'رفیق رکاب شاہی' کے خطاب سے نوازا گیا۔ یہ لقب اگرچہ شاہانہ شان وشوکت سے خالی تھا، تاہم ہارلن نے کابل کا رخ کیا اور چونکہ وہ کسی تعصب میں مبتلا نہیں تھا تو اس نے دوست محمد خان کا اعتماد حاصل کر لیا اور اس کا قابل اعتماد ساتھی بن گیا۔ دوست محمد نے اسے بخارا کے خلاف ایک فوجی مہم پر بھیجا جو کامیابی سے مکمل ہوئی۔

1839 میں جب وہ دوبارہ کابل لوٹا تو اسے خبر ملی کہ انگریز ایک بڑی فوج لے کر آ رہے ہیں تا کہ اس کے سرپرست کو تخت سے ہٹا دیں۔ چنانچہ اس نے وہی کیا جو ہر عقلمند فوجی کارروائی کرنے والا کرتا ہے۔ موقع کو بھانپ کر اس نے راہ فرار اختیار کر لی۔ 1841 میں وہ کابل سے نکل آیا اور بالآخر سان فرانسسکو میں آ کر سکونت اختیار کی، ایک ایسا شہر جو کابل کی نسبت کچھ کم پرآشوب تھا۔

برطانیہ وہ پہلی سامراجی طاقت تھی جس نے اشوک اعظم کے بعد مشرق کی سمت سے فتوحات کا آغاز کیا۔ یورپ اگرچہ دو ہزار سال قبل سکندر اعظم کے ذریعے افغانستان پہنچ چکا تھا، جس نے یہاں ایک افغان، مقدونی اور بدھ تہذیب کے امتزاج سے ایک خوشحال ریاست قائم کی تھی۔ اس کے بعد دنیا کا دوسرا عظیم فاتح چنگیز خان پندرہ سو برس بعد اس سرزمین پر قابض ہوا، لیکن اس نے اپنے پیچھے صرف تباہی کی یادیں چھوڑیں، خاص طور پر ہرات میں جو دنیا کی قدیم ترین تجارتی شاہراہوں پر واقع ایک زرخیز نخلستانی شہر تھا۔

مسلمان افواج نے ساتویں صدی کے وسط سے وادی آمو (آکسس) کی جانب پیش قدمی شروع کر دی تھی اور افغانستان ان کی گزرگاہ کے طور پر ابھرنے لگا۔ خود افغانوں کا کہنا ہے کہ خدا کے پاس تخلیق کے بعد بچ جانے والے پتھروں کا ایک ڈھیر رہ گیا تھا، سو اس نے افغانستان بنا دیا۔ بظاہر اس دعوے میں کچھ صداقت ضرور ہے کہ ملک کی شمالی سرحد سے لے کر سائبریا تک ایک وسیع اور چٹیل میدان پھیلا ہوا ہے جس میں ڈھلوان یا نشیب وفراز کا نام ونشان نہیں ہے۔

نقشے پر ایک نظر ڈالنے سے حقیقت واضح ہو جاتی ہے کہ افغانستان ہندوستان کے لیے ایک طرف

دروازے کا کام دیتا ہے اور دوسری طرف ایک ایسی دراڑ ہے جو دشمن کی راہ بھی بنتی ہے اور اس کے لیے روکاوٹ بھی۔ غزنوی، غوری اور دیگر افغان حکمران جو گیارہویں صدی سے حملہ آور ہوتے رہے وہ اس حقیقت سے بخوبی واقف تھے۔ بابر نے جب عظیم مغل سلطنت کی بنیاد رکھی تو سب سے پہلے کابل کو مستحکم کیا۔ اس کے پوتے اکبر اعظم نے جسے تاریخ نے بھی ''عظیم'' تسلیم کیا، دریائے کابل اور دریائے سندھ کے سنگم پر واقع اٹک کا عظیم قلعہ تعمیر کروا کر اس دروازے پر پہرہ بٹھا دیا۔ (دلچسپ بات یہ ہے کہ سیاہ اور شفاف پانی ایک ساتھ بہتے ہیں، دریا کو نصف میل تک دو حصوں میں تقسیم کرتے ہوئے جیسے اپنی الگ شناخت چھوڑنے پر آمادہ نہ ہوں، پھر کہیں جا کر آہستہ آہستہ ایک دوسرے میں جذب ہونے لگتے ہیں)۔

جب تک اٹک (Attock) کا قلعہ خیبر سے نکلنے والے راستے پر نگہبان کی طرح کھڑا رہا، ہندوستان مغربی یلغار سے محفوظ رہا۔ مگر جیسے ہی مغل اقتدار کمزور پڑا، نادر شاہ نے خیبر کا سینہ چیرتے ہوئے برصغیر کا رخ کیا۔ بابر کے بعد وہ پہلا فاتح تھا جس نے اس درے (پہاڑوں کے بیچ سے گزرتا ہوا راستہ یا گزرگاہ) کو عبور کیا۔

جدید افغانستان کی بنیاد اس وقت پڑی جب نادر شاہ کے پشتون جنرل احمد شاہ ابدالی نے ایک نئی سلطنت قائم کی۔ 1747 میں نو دن پر مشتمل ایک لویہ جرگہ (قبائلی سرداروں کی مجلس) نے گھاس کا ٹکڑا احمد شاہ کی پگڑی پر رکھ کر اسے درّانی قبیلے کا سردار منتخب کیا۔ احمد شاہ نے قندھار کو دارالحکومت بنایا جب کہ اس کے بیٹے تیمور شاہ نے 1772 میں کابل کو دارالحکومت قرار دیا اور پورے افغانستان کو اپنے زیرِ نگیں کر لیا۔ 1780 میں بخارا کے ساتھ ایک معاہدے کے تحت دریائے آمو (آکسس) کو افغانستان کی شمالی سرحد تسلیم کیا گیا، جبکہ مشرقی علاقے دریائے سندھ پار پشاور تک پھیل چکے تھے۔

اٹھارہویں صدی کی دوسری نصف میں برطانوی سلطنت نے ایک ایک کر کے تمام مسلم نوابوں اور ہندو راجاؤں کو شکست دی یا اپنے اثر میں لے لیا، یہاں تک کہ وہ ہندوستان کے بلاشرکت غیرے مالک بن بیٹھے۔ صرف پنجاب ان کی دسترس سے باہر رہا اور اس کی وجہ تھی مہاراجہ رنجیت سنگھ، وہ

غیر معمولی سکھ حکمراں جس نے سمجھ لیا تھا کہ طاقت صرف اس بندوق سے نکلتی ہے جس میں نظم وضبط ہو۔ تاہم ایک مضبوط پنجاب برطانوی سامراج کے لیے ایک محفوظ بفر ریاست بھی تھا جو اس وقت ٹوٹ گیا جب رنجیت سنگھ کے وارثین نے صرف دس برس میں وہ سب برباد کر دیا جو ایک نسل نے تعمیر کیا تھا۔

بادشاہوں کی شکست کے بعد انگریزوں کو درپیش چیلنج کی نوعیت بدل گئی۔ اب یہ محاذ آرائی سے زیادہ ایک اندرونی، خاموش مگر مؤثر مزاحمت کی صورت اختیار کر چکی تھی۔ ریاست کی نمائندہ باقاعدہ افواج کی جگہ انگریزوں کو ایسے گروہوں کا سامنا تھا جن کے پاس نہ تو کوئی تسلیم شدہ قیادت تھی اور نہ منظم لشکر، لیکن ان کا جذبہ بے مثال تھا۔ کبھی ایسے رہنما سامنے آئے جن کے پاس کوئی فوج نہ تھی، اور کبھی ایسے سپاہی اور کسان جو ایسے مقاصد کے لیے اٹھ کھڑے ہوئے جن کے اظہار کی ہمت ان کے لیڈروں میں نہ تھی۔ ان سب مزاحمتوں میں سب سے شدید اور مؤثر وہ تھی جسے انگریزوں نے 1857 کی 'سپاہی بغاوت' (Sepoy Mutiny) کا نام دیا۔ خفیہ اشاروں کے ذریعے ہم آہنگ ہو کر عوام نے بغاوت کی اور تقریباً انگریز راج کو گرا دیا۔ ہندوستانیوں کے پاس جوش و ولولہ تھا، جبکہ انگریزوں کے پاس نظم وضبط۔ ابتدا میں جو بغاوت طوفانی تھی وہ جلد ہی اپنی شدت کھو بیٹھی اور میدان یکطرفہ ہو گیا۔

انیسویں صدی میں سب سے وسیع اور مسلسل چیلنج انگریزوں کو جہادی تحریکوں کی صورت میں پیش آیا۔ ایک علاقے میں کسی خطرے پر قابو پاتے ہی ان کے وسیع جغرافیائی نقشے کے کسی اور حصے میں ایک نیا محاذ کھل جاتا۔ ان جہادوں میں سب سے کامیاب تحریک وہ تھی جس میں سید احمد بریلوی نے افغان قبائل کی مدد سے پشاور کو سکھوں کے تسلط سے وقتی طور پر آزاد کرایا۔ اس واقعے کے صرف بیس سال بعد انگریزوں نے اپنی پہلی بڑی غلطی کی اور افغانستان پر چڑھائی کر دی، جہاں انہیں پہلی بار غازیوں کی شدید مزاحمت کا سامنا کرنا پڑا (غازی وہ مقدس جنگجو ہے جس کا تصور قرآن مجید میں بیان ہوا ہے)۔ جب امیر نے غازیوں کا ساتھ چھوڑ دیا، تو وہ تنہا میدان میں ڈٹے رہے۔

انگریزوں نے مسلمانوں کے ذہن کو سمجھنے کی پوری کوشش کی مگر وہ اس جذبے کی تہہ تک پہنچنے سے

قاصر رہے۔ وہ کسی ایسے مقصد کو تسلیم کرنے پر آمادہ نہ ہو سکے جو کسی بادشاہ یا سلطنت سے بلند تر ہو۔ پرسیول اسپئیر نے اس کیفیت کو اپنی کتاب ( The Nabobs: A Study of the Social Life of the English in 18th Century India، آکسفرڈ یونیورسٹی پریس، 1963 ) میں نہایت بصیرت کے ساتھ بیان کیا ہے:

''دونوں فریق جس ذہنی پس منظر کے ساتھ ایک دوسرے سے ٹکرائے، وہی اس تصادم کو سمجھنے کی کلید ہے۔ انگریزوں کے ذہن پر ان کے پچھلے تجربات کا گہرا اثر تھا، مثلاً مغربی افریقہ اور ویسٹ انڈیز میں افریقیوں سے سابقہ، امریکہ میں ریڈ انڈینز سے واسطہ، اور مشرقی بحیرۂ روم وشمالی افریقہ میں ترکوں اور عربوں سے تعلق۔ اس زمانے کے انگریز افریقیوں کو وحشی اور غلام یا غلامی کے قابل انسان سمجھتے تھے۔ ریڈ انڈینز کو اگر چہ کچھ احترام کی نگاہ سے دیکھا جاتا مگر وہ ان کی نظر میں جنگلی اور پسماندہ تھے۔ ترک اور عرب نہ تو وحشی سمجھے جاتے تھے اور نہ غلام لیکن ان کے ساتھ صلیبی جنگوں سے چلی آنے والی ایک تاریخی دشمنی وابستہ تھی۔ مسلمانوں کو کافر سمجھا جاتا تھا اور ان کے بارے میں یہ تاثر عام تھا کہ وہ ظالم، بے راہ رو، دھوکہ باز اور ساتھ ہی بہادر بھی ہوتے ہیں۔ کیا مغل اور بہت سے ہندوستانی مسلمان نہیں تھے؟ جب انگریزوں نے دیکھا کہ مغلوں کی طاقت ختم ہو چکی ہے اور مرہٹے بھی اس وراثت کو سنبھالنے کے قابل نہیں، تو ان کی نظر میں مسلمان اور ہندو، دونوں ہی نہ صرف سیاسی طور پر بلکہ تہذیبی سطح پر بھی اپنی قدر و حیثیت کھو بیٹھے۔''

ہندوستان میں کسی مقامی طاقت کے دوبارہ ابھرنے سے کہیں زیادہ انگریزوں کو اصل فکر یورپ کی رقابت کی تھی۔ اس وقت کی تین بڑی یورپی طاقتیں انگلستان، فرانس اور روس سب کی نظریں ہندوستان پر جمی ہوئی تھیں۔ انگلستان اور فرانس تو ہندوستان میں ایک دوسرے سے پہلے ہی ٹکرا چکے تھے۔ اگر چہ فرانس کو شکست ہوئی تھی لیکن نپولین کے دور میں اس کی امیدیں دوبارہ جاگ اٹھیں۔ نپولین ہی وہ شخص تھا جس نے انگریزوں کو پہلی بار افغانستان کی طرف سنجیدگی سے متوجہ کیا، کیونکہ

اس وقت عمومی خیال تھا کہ نپولین سکندرِاعظم کے راستے پر چلتے ہوئے مصر فتح کرنے کے بعد فارس کے ذریعے ہندوستان کا رخ کرے گا۔ 1798 میں جب وہ 38 ہزار فوجیوں اور 170 دانشوروں کے ساتھ مصر پہنچا تو انگریزوں میں خطرے کی گھنٹی بج گئی۔

اگرچہ ایڈمرل نیلسن کی فرانسیسیوں پر بحری فتح سے وقتی اطمینان ہوا، مگر اندیشے ختم نہیں ہوئے۔ ممتاز برطانوی افسر ماؤنسٹیورٹ الفنسٹن 1809 میں پشاور آیا تاکہ اگر نپولین واقعی حملہ آور ہو تو اس صورت میں افغانوں کی مدد حاصل کی جا سکے۔ اسی دوران چارلس میٹکالف نے رنجیت سنگھ سے ایک معاہدہ کیا جس کے تحت اگر نپولین مغرب کی سمت سے ہندوستان کی سرحدوں تک پہنچا تو سکھ سلطنت انگریزوں کی حمایت کرے گی۔ اس کے جواب میں برطانیہ نے سکھ ریاست کو علاقائی سالمیت کی ضمانت دی اور یہ وعدہ رنجیت سنگھ کی زندگی تک نبھایا گیا۔ 1814 میں برطانیہ نے فارس کے ساتھ بھی اسی نوعیت کا معاہدہ کیا کہ اگر فارس پر حملہ ہوا تو وہ مدد فراہم کرے گا۔ تاہم 1826 میں جب روس کے بڑھتے ہوئے خطرے کے پیشِ نظر فارس نے اس معاہدے کی یاددہانی کروائی تو برطانیہ کسی اور مصروفیت میں الجھا ہوا تھا۔

خیبر درہ عبور کرنے والے پہلے انگریز دو غیر متوقع افراد تھے۔ ایک عمر رسیدہ گھوڑوں کا پالنے والا اور دوسرا نوجوان وکیل نما کلرک جو 1824 میں بخارا کے سفر پر روانہ ہوئے اور خیبر کے افسانوی درے تک جا پہنچے۔ ولیم مورکرافٹ اور جارج ٹریبلک فروری 1825 میں کابل کے راستے بخارا بھی پہنچے جس پر کلکتہ میں ان کے کچھ افسر ساتھیوں کو سخت حیرت ہوئی، کیونکہ وہ ایسے بے پرواہ سفر کو حماقت سمجھتے تھے۔ مگر مورکرافٹ کا یہ غیر معمولی سفر اس راستے کا پیش خیمہ ثابت ہوا جس پر صرف پندرہ برس بعد خود برطانوی سلطنت گامزن ہونے والی تھی۔ بالآخر حکومت خود ان سے کہیں زیادہ ناعاقبت اندیش ثابت ہوئی۔

ولیم مورکرافٹ کو ایسٹ انڈیا کمپنی نے سالانہ 30 ہزار روپے کی خطیر تنخواہ پر ایک بالکل مختلف کام کے لیے مامور کیا، یعنی عمدہ نسل کے گھوڑے تیار کرنے کے لیے۔ لیکن اس کے متلاطم مزاج کے لیے یہ ذمہ داری بہت معمولی تھی۔ وہ ''سپرنٹنڈنٹ آف اسٹڈ'' یعنی گھوڑوں کے افزائشی مرکز کا نگران بن کر

ہندوستان آیا، اورنجی زندگی میں بھی اپنے عہدے کے معنی خوب نبھائے۔اس کی زندگی صرف اس بات تک محدود نہیں تھی کہ اس کی ایک بیوی 'میری' انگلینڈ میں تھی اور ایک دوسری بیوی، ''پری خانم'' (جس کا مطلب ہے پری بیگم)، ہندوستان میں تھی، جو اس کے دو بچوں، این اور رچرڈ کی ماں تھی۔ اُس وقت یہ عام رواج تھا، جب تک کہ برطانیہ سے عورتیں اور سخت گیر پادری یہاں نہ آ گئے تھے۔

مقامی لوگوں نے اس طرز زندگی کے لیے ایک نہایت بامعنی اور شوخ مزاج سے بھرپور اصطلاح ''بی بی'' گھڑ لی یعنی انگریز بیوی کی جگہ اب ''بُبو'' آ چکی تھی۔ ''بُبو'' اگرچہ ہندستانی زبان میں بہن کے لیے استعمال ہوتا ہے لیکن یہاں یہ لفظ اس مقامی عورت کے لیے بولا جاتا تھا جو انگریز افسر کی غیر رسمی شریک حیات ہوتی تھی۔ یہ زبان کا ایک ایسا فقرہ تھا جو بیک وقت فصاحت، فطانت اور فقرہ بازی کا نمونہ تھا۔ جبکہ ''بی بی'' کو انگلستان سے محبت بھرے خط ملتے رہتے تھے، ''بُبو'' نہ صرف افسر کے گھر کی دیکھ بھال کرتی بلکہ اسے ہندستانی زبان سکھاتی، اس کی تیمارداری کرتی اور بستر کی رفاقت میں بھی اس کی ساتھی بن جاتی تھی۔

1819 میں جب ولیم مورکرافٹ کلکتہ سے روانہ ہوا تو اس وقت اس کی عمر 52 برس تھی۔ حکومت کا رویہ بظاہر دوستانہ تھا مگر در پردہ چالاکی صاف نظر آتی تھی کہ وہ جہاں چاہے جا سکتا تھا، بس شرط یہ تھی کہ اگر کوئی مسئلہ پیش آئے تو ذمہ داری حکومت پر نہ آئے۔ لگتا ہے جاسوسی کے لیے یہ روایتی پالیسی آج تک نہیں بدلی۔

6 مارچ 1820 کو جب مورکرافٹ نے بھینسوں کی پھولی ہوئی کھالوں پر بیٹھ کر دریائے ستلج عبور کیا تو وہ برطانوی ہندوستان کی حدود سے باہر نکل گیا۔ حتیٰ کہ سب سے سادہ لوح ریاستی شہزادے کو بھی یقین نہیں آیا کہ وہ صرف گھوڑوں کی بہتر نسل کے لیے آیا ہے اگرچہ وہ اس بہانے کو قائم رکھے ہوئے تھا۔ تاہم کلکتہ کو بھیجی گئی اس کی رپورٹس دراصل اعلیٰ درجے کی خفیہ معلومات پر مشتمل تھیں۔

دسمبر 1823 میں پشاور میں اس کا پرتپاک استقبال ہوا، جہاں سے وہ خیبر درے کے راستے کابل روانہ ہوا۔ وہاں سے اس نے سرد علاقوں سے ایک پیغام بھیجا کہ ''راج کی صرف ایک رجمنٹ دوست محمد کو ہٹا کر انگریزوں کے حمایتی شاہ شجاع کو تخت پر بٹھانے کے لیے کافی ہوگی۔'' مورکرافٹ

بھی ان لوگوں میں شامل تھا جو رابرٹ کلائیو کے اس قول پر یقین رکھتے تھے کہ ''جو رکا، وہ مٹ گیا۔''
یہی سوچ ''فارورڈ پالیسی'' کہلائی جس کا بنیادی مقصد روسیوں کی پیش قدمی کو روکنا تھا۔

وہ بخارا میں روسی نمائندوں سے بھی ملا جہاں وہ پیدل داخل ہوا، کیونکہ غیر مسلموں کو شہر میں گھوڑے پر سوار ہو کر داخل ہونے کی اجازت نہیں تھی۔ وہ بخارا کے ایک ہزار سال پرانے قلعے، عظیم کتب خانے، تین سو کے قریب مدارس، سرسبز باغات، نہروں اور بازاروں سے خاصا متاثر ہوا جہاں روسی اشیاء کے ساتھ روسی غلام بھی بڑی تعداد میں موجود تھے۔ (جب بعد میں روس نے اسی غلامی کو بخارا پر حملے کا جواز بنایا تو مسلمان اسے سمجھ نہ سکے۔ ان کا موقف تھا کہ روس تو خود اپنے لوگوں کو زرعی غلامی میں جکڑتا ہے تو اسے دوسروں کی غلامی پر اعتراض کیسا؟)

روس کا خطرہ محض خیالی یا مبالغہ آمیز نہیں تھا، اگرچہ بعض تجزیے اسے ضرورت سے زیادہ رنگ دیتے تھے۔ روس کے جنوب کی طرف بڑھنے کے عزائم صرف توسیع پسندی یا گرم پانیوں تک رسائی تک محدود نہ تھے۔ ایک قابل قبول وجہ یہ بھی تھی کہ روس کو اپنے دفاع کے لیے وسیع میدان درکار تھے۔ زمین کا کھلا پھیلاؤ بعض اوقات دیوار سے زیادہ مؤثر دفاع ثابت ہوتا ہے۔ یہی اصول برصغیر میں انگریزوں کی چھاؤنیوں میں اپنایا گیا جہاں ہر چھاؤنی کے سامنے ایک کھلا میدان مخصوص ہوتا تھا تاکہ فائرنگ کا دائرہ عمل صاف رہے۔

اقتدار اور تحفظ کے ساتھ ساتھ مذہبی جوش بھی روسی پالیسی کا حصہ تھا۔ کوساک سپاہی جو ایوان ہولناک (یا ایوان عظیم) کے پرچم تلے لڑتے تھے 1552 میں دریائے وولگا کے کنارے واقع مسلمان شہر قازان پر قابض ہو گئے۔ وہ نہ صرف عورتوں کو عیسائیت میں تبدیل کرتے بلکہ گرجا گھر بھی بناتے جن کی گھنٹیاں ایک متشدد عیسائی سلطنت کی توسیع کا اعلان کرتیں۔

پیٹر اعظم کے خواب صرف اسلامی دنیا تک محدود نہ تھے۔ 1721 تک وہ ایسٹونیا، لٹویا اور فن لینڈ کے کچھ حصے فتح کر چکا تھا مگر اس کے عزائم کی معراج قسطنطنیہ کو دوبارہ عیسائی سلطنت کے زیر نگیں لانا تھا۔ وسطی ایشیا کی جانب اس کی پہلی پیش قدمی اسی وقت ناکامی سے دوچار ہوئی جب اس کی

3500افراد پر مشتمل فوج خیوا میں مکمل طور پر تباہ ہوگئی۔ اس ناکامی کے بعد اس نے اپنی توجہ قفقاز کی طرف مبذول کر لی، وہ شاندار اور طویل پہاڑی سلسلہ جو تقریباً 650 میل تک بحیرۂ کیسپین سے لے کر بحیرۂ اسود تک پھیلا ہوا ہے اور جو یورپ و ایشیا کو جغرافیائی طور پر ایک دوسرے سے جدا کرتا ہے۔ 1722 میں روس نے داغستان میں قدم رکھتے ہوئے قفقاز کے مسلمان علاقوں کی جانب پیش قدمی کا آغاز کیا اور یوں اس نے اس نازک اور تاریخی خطے کی جانب اپنے اثر ورسوخ کا راستہ ہموار کر لیا۔

ساتویں صدی کی مسلم افواج فارس اور وسطی ایشیا میں تو کامیابی سے داخل ہوگئیں، مگر جب ان بلند و دشوار گزار پہاڑوں اور وہاں کے سخت مزاج باشندوں کا سامنا ہوا تو وہیں رک گئیں۔ اہل فارس کا عقیدہ تھا کہ جنات کا بادشاہ انہی ناقابل عبور برف پوش چوٹیوں میں رہتا ہے۔ اس علاقے میں اسلام تلوار سے نہیں بلکہ صوفی مبلغین کے ذریعے پہنچا، بالخصوص نقشبندی سلسلے کے بزرگوں کے ذریعے۔ چیچن، چرکس، آوار اور داغستانی اقوام فتح نہیں ہوئیں بلکہ ان کا دل جیتا گیا جب کہ جارجیا اور آرمینیا بدستور عیسائی ہی رہے۔

1734 میں روس نے مشرق اور مغرب دونوں سمتوں میں پیش قدمی کی، قزاقوں کو شکست دی اور کریمیا پر قبضہ کر لیا۔ کیتھرین اعظم کے دور میں روس کی توجہ، صلاحیت اور عزم پہلے سے کہیں زیادہ مستحکم ہو گیا۔ اس کے ایک سفیر نے تو یہاں تک اعلان کیا کہ مستقبل روس اور امریکہ کا ہے۔ اگرچہ یہ پیش گوئی دور کے زمانے کے لیے درست ہو سکتی تھی لیکن اس وقت کے حالیہ حالات پر اس کا اطلاق ممکن نہ تھا کیونکہ برطانوی شیر ابھی زندہ تھا۔

1812 میں نپولین کی چھ لاکھ فوج کی شکست اور واٹرلو میں ولنگٹن کی فتح کے بعد روس اور برطانیہ دونوں یورپی تنازعات سے فارغ ہو کر ایک نئی مہم پر نکلے ...ایسی سلطنت سازی جس کی یورپی تاریخ میں مثال نہیں ملتی۔ زار الیگزینڈر اول نے اپنے سلطنتی رقبے میں دو لاکھ مربع میل کا اضافہ کیا۔ برطانوی تجزیہ کار جیسے سر رابرٹ ولسن جو ماسکو کی تباہی کے وقت برطانوی فوجی مبصر کی حیثیت سے موجود تھے، یہ اطلاع دے رہے تھے کہ زار کا منصوبہ قسطنطنیہ پر قبضہ کرنا اور فارس کے راستے

ہندوستان میں داخل ہونا ہے۔

اب روسی افواج بحیرۂ کیسپین کے دونوں اطراف سرگرم ہو چکی تھیں اور اورینبرگ ان کا مرکزی اڈہ بن چکا تھا۔ 1825 تک روس مغرب سے مشرق کی طرف پھیلی ہوئی ایک لکیر کو عبور کر چکا تھا، جو شمالی کیسپین سے آرال جھیل تک، اور پھر بالخاش جھیل تک جاتی تھی۔ (یہی پیش رفت فارس کے لیے باعث تشویش بنی۔)

1839 سے 1840 میں خیوا نے اپنی آخری بڑی کامیابی حاصل کی جب اس نے جنرل وی اے پیروفسکی کی قیادت میں حملہ آور پانچ ہزار کوساک سپاہیوں اور دو ہزار قرغیز جنگجوؤں کو پسپا کر دیا۔ لیکن روسی ارادے کمزور نہیں پڑے۔ 1865 میں انہوں نے تاشقند جیسے اہم شہر پر قبضہ کر لیا اور 1868 تک بخارا اور سمرقند بھی روس کے زیر تسلط آ چکے تھے، یہاں تک کہ 1873 میں خیوا بھی ان کے قبضے میں چلا گیا۔ محض ایک دہائی کے اندر روس، ہرات سے یا تو صرف ایک مصافحہ دور تھا یا ایک گولی۔

ایک صدی محض تاریخوں کی فہرست میں مختصر نظر آتی ہے لیکن حقیقت میں یہ جدوجہد نہ تو آسان تھی اور نہ ہی اس کا انجام یقینی تھا۔ روس کی پیش قدمی اگر ایک طوفانی یلغار کی بجائے تدریجی اور مرحلہ وار انداز میں ہوئی تو اس کی ایک بڑی وجہ وہ غیر رسمی اور بے قاعدہ مزاحمتی افواج تھیں جنہوں نے اس وقت بھی جہاد کا پرچم تھامے رکھا جب ان کے امرا ہتھیار ڈال چکے تھے۔ البتہ تمام امرا نے بھی آسانی سے شکست قبول نہیں کی۔ بخارا کے نصر اللہ خان جیسے حکمرانوں نے چالاکی، اعتماد، تجارت اور قید کے ایک بھیانک نظام کی مدد سے اپنے اقتدار کو قائم رکھا۔ اس کا پسندیدہ قید خانہ ''سیاہ چاہ'' کہلاتا تھا جو بیس فٹ گہرا ایک گڑھا تھا، جہاں منتخب قیدی کیڑے مکوڑوں، چوہوں، حشرات اور ایک یا دو سڑتی لاشوں کے ساتھ زندگی گزارتے تھے۔ تاہم قفقاز کی سرزمین وہ مقام تھی جہاں جہاد کا سب سے نمایاں اور تاریخی پرچم بلند ہوا۔ یہ سیاہ علم، جو سختی، اخلاص اور مزاحمت کی علامت بن گیا، ایک طویل اور خونریز جدوجہد میں روسیوں کی پیش قدمی کے سامنے سیسہ پلائی دیوار ثابت ہوا۔ اس عظیم تحریک کی قیادت ایک ایسے باعزم اور غیر معمولی رہنما نے کی، جو وقت کے ساتھ اسلامی تاریخ میں ایک عظیم اسطوری شخصیت کے طور پر پہچانا گیا، اور وہ تھے امام شامل۔

قفقاز کا مسلمان خطہ آج بھی اس دور کو 'دورِ شریعت' کے طور پر یاد کرتا ہے۔ ایک معروف روایت کے مطابق اس دور میں چیچن لڑکی اس وقت تک کسی نوجوان سے شادی نہیں کرتی جب تک وہ ایک ندی کو پھلانگ نہ لیتا، کندھوں کی اونچائی پر بندھی رسی سے اچھل نہ جاتا، اور ایک روسی کو قتل نہ کر لیتا۔

کہا جاتا ہے کہ پہلا جہاد ایک اطالوی جیسوئیٹ پادری الیشا منصور نے شروع کیا جو اسلام قبول کر چکا تھا اور جسے عثمانی سلطان نے روس کے خلاف جہاد کے لیے روانہ کیا تھا۔ اسے 1791 میں شکست ہوئی اور وہ قید کر لیا گیا۔

یہ مزاحمت دراصل علما کے ہاتھوں پروان چڑھی، جن میں سب سے نمایاں نام مولانا محمد یاراغی کا اور ان کے شاگرد غازی ملا کا تھا۔ اول الذکر ایک صوفی عالم تھے اور مؤخر الذکر داغستان کے آوار قبیلے سے تعلق رکھتے تھے۔ ان کا پیغام واضح تھا کہ روس کے خلاف جہاد تبھی کامیاب ہوگا جب مسلمان مکمل طور پر شریعت کو اپنا لیں گے اور اپنی پرانی رسم و رواج یعنی 'عادت' کو ترک کر دیں گے (یہی لفظ اردو میں 'عادت' کے طور پر مستعمل ہے جسے انگریزی میں ہیبٹ کہتے ہیں)۔

ان کے نزدیک روسی آرتھوڈوکس کلیسا اور زاروں (Tsars) کی صلیبی یلغار کا مقابلہ صرف اتحاد اور طہارت سے کیا جا سکتا تھا۔ 1829 میں غازی ملا نے مختلف علاقوں کا دورہ کرتے ہوئے تبلیغ کی کہ جب تک کوئی روسی ان کے درمیان موجود ہے اس وقت تک اللہ نہ تو شریعت پر عمل کو قبول کرے گا، نہ زکوٰۃ، نہ نماز اور نہ ہی حج۔ یہاں تک کہ ان کے نکاح بھی باطل ہوں گے اور ان کے بچے ناجائز شمار ہوں گے، جب تک کہ ہر ایک روسی کو یہاں سے نکال نہ دیا جائے۔

غازی ملا کو 'امام' کا لقب اس وقت دیا گیا جب جمری کی مسجد میں ایک بڑے اجتماع نے ان کی امامت پر بیعت کی اور وہیں سے انہوں نے باضابطہ طور پر جہاد کا اعلان کیا۔ غازی ملا اور ان کے مریدین نے روسیوں کے خلاف پہلی کامیاب جھڑپ گروزنی کے جنوب میں جنگلات کے اندر لڑی۔ روسیوں کی جوابی کارروائی سخت تھی اور غازی ملا کو پیچھے ہٹ کر جمری واپس جانا پڑا۔ روایت ہے کہ جب روسی جمری پر قابض ہوئے تو انہوں نے غازی ملا کی لاش کو اس حال میں پایا کہ وہ اپنے

مصلے پر بیٹھے ہوئے تھے، ٹانگیں تہہ کیے، ایک ہاتھ داڑھی پر اور دوسرا آسمان کی طرف اٹھا ہوا تھا۔

صرف دو مرید زندہ بچے جن میں ایک شامل بھی تھا۔ وہ ایک مکان کے دروازے پر کھڑا تھا کہ چار روسی سپاہیوں نے اسے گھیر لیا۔ قد بلند، جسم مضبوط، ایک لمحے کو یوں رکا جیسے دشمن کو نشانہ لینے کا موقع دینا چاہتا ہو، پھر یکا یک ان کے اوپر سے چھلانگ لگائی، پیچھے سے تین کو کاٹ ڈالا مگر چوتھے سپاہی نے اپنی سنگین اس کے سینے میں اتار دی۔ شامل نے فولادی خنجر اپنے سینے سے کھینچ کر چوتھے کو بھی موت کے گھاٹ اتار دیا، دیوار پھلانگی اور تاریکی میں غائب ہو گیا۔ لوگ آج بھی اپنے اس ہیرو کو اسی انداز سے یاد کرتے ہیں۔

1796 میں داغستان کے ایک معزز گھرانے میں پیدا ہونے والا شامل بیس برس کی عمر تک اسلامی علم و فضل میں ممتاز ہو چکا تھا۔ 1828 میں اس نے فریضۂ حج ادا کیا۔ 1829 میں جمری کی شکست کے بعد اسے جہاد کا امام تسلیم کر لیا گیا۔ اس نے چھ ہزار مریدین پر مشتمل ایک متحرک لشکر منظم کیا جس میں ہر پانچ سو افراد کی جماعت کی قیادت ایک نائب کے سپرد ہوتی۔ دس برس تک یہ لشکر روسیوں کے لیے قہر بن کر چھایا رہا، یہاں تک کہ 1839 میں اسے گھیر کر شکست دی گئی۔ ایک بیوی اور شیر خوار بچے کے سانحہ کے باوجود شامل خود کو بچا کر نکلنے میں کامیاب ہو گیا۔ 1840 میں وہ پھر لوٹا، نئے لشکر اور اسی سیاہ پرچم کے ساتھ، اور دوبارہ فتح کی راہ پر گامزن ہوا۔

روسیوں نے اس کے سر کی قیمت سونے کے برابر مقرر کی۔ خون بہا بڑھتا جا رہا تھا۔ بالآخر 1858 میں امام شامل کو زیر کر لیا گیا۔ جون 1859 میں جب روسیوں نے دھمکی دی کہ اگر وہ زندہ گرفتار نہ ہوا تو اس کے پورے خاندان کو قتل کر دیا جائے گا، تو اس نے آخری مزاحمت کے بعد خود سپردگی کر دی۔ اسے ماسکو کے مضافات میں جلاوطن کر دیا گیا جہاں وہ 1869 تک مقیم رہا۔ پھر اسے مکہ اور مدینہ جانے کی اجازت ملی۔ جب وہ ترکی کے راستے مقدس شہروں کی طرف روانہ ہوا تو راستے بھر لوگ اس کا استقبال کرتے اور اس کی عظمت کو سلام پیش کرتے۔ وہ 1871 میں مدینہ منورہ میں وفات پا گیا۔

عظیم شخصیت آج بھی زندہ ہے، اور قفقاز میں جہاد کی روح بھی سانس لیتی ہے۔ اگر قفقاز کے مریدوں نے روسیوں کی پیش قدمی روکی تھی تو افغانستان کے غازیوں نے یورپ کی دوسری بڑی

طاقت کو آگے بڑھنے سے روک دیا تھا۔

1833 میں برطانوی حکومت نے کابل میں ایک جاسوس تعینات کیا جسے بظاہر ایک 'نیوز رائٹر' یعنی خبر نویس کہا گیا۔ شاید یہ پہلی بار تھا کہ دو بالکل الگ الگ پیشوں کے درمیان مطابقت پیدا کی گئی۔ یہ جاسوس ایک مفرور اور آوارہ گرد شخص تھا جس کا نام چارلس میسن تھا۔ اسے ماہانہ 250 روپے دیے جاتے تھے، اور کلکتہ نے یہ بات واضح کر دی تھی کہ اگر یہ راز فاش ہوا تو حکومت اس ذمہ داری سے لاتعلق رہے گی۔ وہ ایک اچھا اور دیانت دار جاسوس ثابت ہوا۔ اس نے اطلاع دی کہ کابل (برخلاف قندھار کے) ایک بردبار، غیر طبقاتی، شائستہ اور مہمان نواز شہر ہے جہاں ہندوؤں اور آرمینیائی عیسائیوں کو بھی دوست محمد خان کی عدالت سے انصاف ملتا ہے۔ عوام اسے محبوب رکھتے تھے اور وہ تلوار اسی وقت اٹھاتا جب تمام دوسرے راستے ناکام ہو جاتے۔

1832 میں ایک باصلاحیت برطانوی افسر الیگزینڈر برنس کو بخارا تک کا سفر کرنے کی اجازت ملی جو دو برس میں مکمل ہوا۔ اس نے پگڑی باندھی، مشرقی لباس پہنا، سر منڈوایا، داڑھی کو سیاہ رنگا، ہاتھوں سے کھانا کھانے لگا اور اپنا نام 'سکندر' رکھ لیا۔ جب دوست محمد نے اس سے پوچھا کہ اگر تم جاسوس نہیں ہو تو یہ سب تکلف کیوں کیا، تو برنس نے جواب دیا کہ وہ صرف یہ چاہتا تھا کہ لوگ اسے گھور گھور کر نہ دیکھیں۔ ایک 'صاحب' (افسر) کے لیے یہ وضاحت کافی سمجھی گئی۔

1836 میں ہندوستان کے نئے گورنر جنرل لارڈ آکلینڈ نے برنس کو کابل اور وسطی ایشیا کے دوسرے دورے پر روانہ کیا۔ بظاہر مقصد تجارت کو فروغ دینا تھا لیکن اس وقت تک 'فارورڈ پالیسی' مزید آگے بڑھ چکی تھی۔ کلکتہ نے یہ طے کر لیا تھا کہ جو کچھ قبضے میں لیا جا سکتا ہے اسے لے لیا جائے اور جو قبضے میں نہ آئے اسے کنٹرول کیا جائے۔

1844 میں ایک بار پھر ان ''مسافروں'' کے بعد جنہوں نے راستے کا نقشہ تیار کیا، جنرل سر چارلس نیپیئر نے پنجاب اور افغانستان کے جنوب میں واقع صوبہ سندھ پر قبضہ کر لیا۔ فتح کی خبر دیتے ہوئے اس نے صرف ایک لفظ Peccavi کا تار بھیجا جس کا مطلب ہے ''میں نے گناہ کیا ہے۔'' اسے ایک لفظی لطیفہ کہا جا سکتا ہے جس میں ''Sinned'' (گناہ کیا) کو ''Sindh'' (سندھ) سے جوڑا

گیا (یعنی ”I have Sinned“ کو ”I have Sindh“ یعنی ”میں نے سندھ حاصل کرلیا“ سے تعبیر کیا گیا)۔ مہاراجہ رنجیت سنگھ کی وفات کے بعد انہی کی دہائی میں انگریز اور سکھوں کے درمیان ہونے والی جنگوں کے نتیجے میں پنجاب بھی برطانوی سلطنت میں شامل ہو گیا۔ اور یہ موقع بھی بروقت تھا کیونکہ 1857 کی بغاوت کے دوران یہی پنجاب تھا جس نے برطانوی راج کو سہارا دیا۔ تیسرا ہدف افغانستان کہیں زیادہ پیچیدہ ثابت ہوا۔

روس کی وجہ سے پریشانی اس وقت مزید بڑھی جب اس نے 1837 میں ہرات پر حملہ کرنے کے لیے ایران کو مہمان فوجی فراہم کیے۔ ہرات کا محاصرہ تو اس وقت ختم ہوا جب خلیج فارس میں دو برطانوی توپ بردار کشتیاں پہنچ گئیں۔ دسمبر 1837 میں ایک روسی اہلکار کابل میں نمودار ہوا جو بظاہر بادشاہ وقت (زار) کا خط لایا تھا لیکن وہ ایک خالی لیٹر ہیڈ نکلا کیونکہ اس پر دستخط موجود نہ تھے۔ اتفاق سے اس وقت کابل میں موجود برنس نے مہذب رویہ اپناتے ہوئے اس روسی افسر کیپٹن ایوان وٹکوِچ کو عشائیے پر مدعو کیا۔ اگرچہ اس کی آمد نے کابل میں کوئی خاص اثر نہیں ڈالا لیکن یہ وہ بہانہ بن گیا جس کی کلکتہ کو تلاش تھی۔

مارچ 1838 میں دوست محمد کو ایک سخت الٹی میٹم دیا گیا کہ ”آپ ایران اور روس سے ہر قسم کے تعلقات ختم کریں، ان کے کسی بھی نمائندے کو قبول نہ کریں۔“ دوست محمد نے جواب دیا کہ انگریز سب کچھ مانگتے ہیں اور کچھ بھی نہیں دیتے۔ اپریل میں برنس کو واپس بلایا گیا لیکن جلد ہی اسے تیسرے دورے کا حکم ملا، اور اس بار ایک فوج کے ہمراہ بلایا گیا۔ صرف 33 برس کی عمر میں اسے لیفٹیننٹ کرنل بنا دیا گیا اور نائٹ ہُڈ سے بھی نوازا گیا۔ برطانیہ کے وزیر خارجہ لارڈ پامرسٹن اس نتیجے پر پہنچے تھے کہ ہرات پر حملہ ایران اور روس کے درمیان اس گہرے اتحاد کی علامت ہے جس کا ہدف برطانوی سلطنت ہے۔ اس لیے دوست محمد کو ہٹا کر انگریزوں کے زیادہ فرمانبردار شاہ شجاع کو افغانستان کا حکمران بنانے کی سفارش کی گئی۔ وہ غالباً شاہ شجاع کے افغان لقب ”شاہِ کم نصیب“ یعنی ’بدقسمت بادشاہ‘ سے ناواقف تھا۔

اس مہم کی قیادت سر جان مکناٹن کے سپرد تھی۔ اس دور کی سیاح ایملی ایڈن نے طنزیہ تبصرہ کیا کہ سر

جان کو فارسی، انگریزی سے بہتر آتی تھی اگرچہ وہ سنسکرت کو ترجیح دیتا تھا۔ یکم اکتوبر 1838 کو شملہ اعلامیے میں افغانستان پر ایران کی سازشوں کا ساتھ دینے کا الزام عائد کیا گیا۔ چنانچہ ''آرمی آف دی انڈس'' کو افغانستان پر حملے کے لیے تیار کیا گیا۔ بنگال اور بمبئی سے 9500 فوجی، اور شاہ شجاع کی برائے نام قیادت میں 6000 مزید سپاہی جن میں اکثریت ہندوؤں کی تھی۔ اس لشکر کے ساتھ 30000 اونٹ، دس ہفتوں کے کھانے کے لیے کافی تعداد میں بھیڑیں اور 38000 کیمپ کے پیچھے چلنے والے افراد تھے جن میں ماشکی (جیسے پانی بردار' وفادار گنگا دین)، اسٹریچر اٹھانے والے، باورچی، قسمت بتانے والے، سارنگی نواز، ناچنے والیاں، اور متقی پرہیزگاروں کے لیے بیویاں بھی شامل تھیں۔

راستے میں بہت سا تماشہ اور ڈرامہ ہوا۔ لارڈ آکلینڈ خود مہاراجہ رنجیت سنگھ سے ملاقات کے لیے آیا مگر سکھ حکمران اتنا زیرک تھا کہ اس لشکر کو پنجاب سے گزرنے کی اجازت نہیں دی۔ یوں فوج نے رشوت دے کر سندھ اور بولان کے راستے قندھار کی طرف پیش قدمی کی جہاں شاہ شجاع کو چند سو بے پرواہ افغانوں کے سامنے تخت پر بٹھایا گیا۔ غزنی میں ایک مخبر نے وہ دروازہ دکھایا جو مضبوطی سے بند نہیں کیا گیا تھا۔ بنگال انجینیئرز کے لیفٹینینٹ ہنری ڈیورانڈ نے اسے مؤثر طریقے سے بارود سے اڑا دیا۔ وہ دروازہ بامعنی طور پر ''کابل دروازہ'' کہلاتا تھا۔ ''آرمی آف دی انڈس'' کو صرف سترہ سپاہیوں کا نقصان ہوا۔ کابل بغیر کسی مزاحمت کے فتح ہو گیا، بالکل ویسے ہی جیسے بعد میں 1879، 1978 اور 2001 میں ہوا۔

دوست محمد خان شکست کے بعد فرار ہو کر بخارا جا پہنچا جہاں اسے پناہ بھی مل گئی۔ ادھر شاہ شجاع اور اس کی اکثریت میں ہندو سپاہ پر مشتمل فوج نے فتح کی خوش فہمی میں آسودگی (''خوش نصیبی'') کے دن گزارنے شروع کیے۔ برطانوی افواج نے غزنی، قندھار اور جلال آباد میں چھاؤنیاں قائم کیں جبکہ کوئٹہ اور خیبر پر قبضہ کر کے رسل و رسائل کی راہیں محفوظ بنائیں۔ اب اُن کی نظریں ہرات، چینی ترکستان، اور یہاں تک کہ سائبیریا پر تھیں جیسے یہ سب خطے ایک دن ملکہ وکٹوریہ کی سلطنت میں شامل ہو جائیں گے۔ شاہ شجاع نے اپنی سینکڑوں بیویوں اور خدام کے ساتھ قلعہ بالا حصار' میں

سکونت اختیار کی حالانکہ برطانوی حکام کی خواہش تھی کہ یہ قلعہ ان کی فوجی چھاؤنی کے طور پر استعمال ہو۔ مگر شاہ شجاع نے یہ کہہ کر انکار کر دیا کہ قلعے کی فصیلوں سے انگریز سپاہی اس کے حرم پر نظر ڈال سکتے ہیں۔ برطانویوں نے اس بات پر اصرار نہیں کیا حالانکہ کرنا چاہیے تھا، کیونکہ وہ ایک بدقسمت بادشاہ سے معاملہ کر رہے تھے۔

کابل میں زندگی خوب مزے کی تھی۔ سر الیگزینڈر جو اب درانی دربار سے ''سر'' بھی بن چکا تھا، مقامی سیاہ آنکھوں والی دوشیزاؤں میں خاص دلچسپی رکھتا تھا۔ وہاں پولو ہوتا، شیمپین اور مڈیرا کی بوتلیں کھلتی تھیں، سربمہر سامن مچھلی پیش کی جاتی اور صاحبان و میم صاحبان کے لیے شاندار دعوتیں برپا ہوتیں۔

1840 میں لارڈ پامرسٹن پیش گوئی کر رہا تھا کہ ایشیا کا مقدر طے کرنے کے لیے کسی دن کوساک (روسی سپاہی) اور سیپوئی (برطانوی ہندوستانی سپاہی) افغانستان میں آمنے سامنے ہوں گے۔ کابل سے کلکتہ کو رپورٹ دی گئی کہ افغانستان ''غیر معمولی طور پر پرسکون'' ہے۔ شاید یہی وجہ تھی کہ 1841 کے وسط میں پیچش زدہ 59 سالہ میجر جنرل ولیم الفنسٹون کو یہاں تعینات کر کے ''صحت یابی'' کے لیے بھیجا گیا۔ وہ واٹرلو کی جنگ میں اپنی بہادری ثابت کر چکا تھا اور تب سے اسی پر نازاں تھا۔ کابل میں حالات اتنے ''نارمل'' ہو چکے تھے کہ برطانویوں نے غلزئی قبائل کو دی جانے والی مہذب انداز میں ''سبسڈی'' سے معروف مالی امداد بند کر دی۔ ردعمل میں غلزئیوں نے خیبر پاس بند کر دیا۔ کابل میں اسے محض ایک معمولی تشویش کی بات سمجھا گیا۔

2 نومبر 1841 کو کابل میں سر الیگزینڈر برنز کی رہائش گاہ کے سامنے ایک مشتعل ہجوم جمع ہوا اور اس کے پرانے لقب سے پکارنے لگا: ''سکندر! سکندر!'' جب برنز ان سے ملنے کے لیے باغ میں آیا تو اسے بے دردی سے قتل کر کے ٹکڑے ٹکڑے کر دیا گیا۔ برطانوی افواج خاموش رہیں۔ اس بغاوت کے بارے میں کسی کو کچھ معلوم نہیں تھا کیونکہ یہ بظاہر اس کا کوئی قائد نہیں تھا۔ تاہم قیادت نہ ہونا بے سمت ہونے کے مترادف نہیں تھا۔ اس کے بعد لڑائی شروع ہوئی جو 23 نومبر تک جاری رہی۔ لیڈی فلورینٹینا سیل جن کا حوالہ مائر اور بریسے نے اپنی کتاب Tournament of Shadows میں

دیا ہے، اس جنگ کا نقشہ کچھ یوں کھینچتی ہیں کہ ''غازیانِ ملت، صلیبی جنگوں کے مناظر کی یاد دلاتے ہوئے برطانوی صفوں کی جانب دوڑتے ہوئے آ رہے تھے۔''

آخر کار ایک رہنما نمودار ہوا... دوست محمد خان کا بیٹا اکبر خان، جو ازبک جنگجوؤں کی ایک جماعت کے ساتھ پہنچا۔ برطانوی افواج جو چاروں طرف سے گھر چکی تھیں اب چاہتی تھیں کہ کسی طرح اس مصیبت سے مذاکرات کے ذریعے نکل جائیں۔ اکبر خان نے محفوظ راستہ دینے کی پیشکش کی مگر ایک لمحے میں غصے میں آ کر مکناٹن کی سربراہی میں آئے ہوئے مذاکراتی وفد سے کہا:

''تم میرے ملک پر قبضہ کرو گے، ہاں؟''

یہی وہ لمحہ تھا جب مکناٹن کو قتل کر دیا گیا۔

کابل میں تعینات برطانوی اشرافیہ فورس کے بچے کھچے سپاہیوں کو 6 جنوری کو شہر چھوڑنے کی اجازت ملی مگر جیسے ہی وہ جلال آباد کی طرف روانہ ہوئے راستے میں غلزئی قبائل نے ان کا صفایا کر دیا۔ صرف ایک شخص ڈاکٹر ولیم برائڈن 13 جنوری کو جلال آباد کے قلعے تک زندہ پہنچ سکا (برائڈن واقعی سخت جان تھا۔ وہ 1857 کی بغاوت کے دوران لکھنؤ کے تاریخی محاصرے میں بھی زندہ بچ نکلا تھا۔)

نام نہاد ''آرمی آف ریٹریبیوشن'' (انتقامی فوج) نے اپریل 1842 میں خیبر کے راستے زبردستی داخل ہو کر جلال آباد کا محاصرہ ختم کیا اور ستمبر میں کابل کی جانب پیش قدمی کی، جہاں قندھار سے آئی ہوئی ایک اور فوج سے اس کا ملاپ ہوا۔ غصے کا کچھ مظاہرہ ضرور کیا گیا، چند متوقع پھانسیاں بھی ہوئیں، لیکن اصل انتقام محض نمائشی رہا۔ دوست محمد خان کو دوبارہ تخت پر بٹھا دیا گیا۔ اگر انگریز ابتدا میں ہی اسے نہ ہٹاتے تو شاید ایشیا میں اپنی سب سے بڑی ذلت سے بچ سکتے تھے۔

دوست محمد 1863 تک زندہ رہا اگرچہ اس کا محبوب بیٹا اکبر اس سے پہلے وفات پا چکا تھا۔ چونکہ تخت کے دعوے داروں کی کوئی کمی نہیں تھی، اس لیے تخت نشینی کی کشمکش پانچ برس جاری رہی، یہاں تک کہ شیر علی اقتدار پر قابض ہو گیا۔ شیر علی وہ پہلا افغان حکمران تھا جس نے باقاعدہ جدید اصلاحات کا آغاز کیا۔ اس نے انگریزی اسکول قائم کیے، ڈاک کا نظام متعارف کرایا اور سب سے اہم بات یہ

کہ فوج کو وقت پر تنخواہیں دینا شروع کیں۔ اس نے برطانیہ سے خوشگوار تعلقات استوار کرنے کی کوشش کی اور 1869 میں لارڈ مایو کے دربار میں شریک ہوا۔ لارڈ مایو کا قتل جوانڈمان جزائر میں ایک افغان قیدی کے ہاتھوں ہوا اسے کبھی کابل سے منسوب نہیں کیا گیا۔ لارڈ مایو کے جانشین لارڈ نارتھ بروک نے تو یہاں تک پیشکش کی کہ اگر روس کی طرف سے کوئی خطرہ درپیش ہوا تو برطانیہ شیر علی کو فوجی مدد فراہم کرے گا۔ تاہم 1874 میں لندن میں بنجمن ڈزرائیلی کی قیادت میں ٹوری حکومت قائم ہوئی، اور یوں برطانوی سامراج کی ''فارورڈ پالیسی'' ایک بار پھر واپس آ گئی۔

1875 میں ایڈورڈ رابرٹ بلور لٹن کو وائسرائے ہند مقرر کیا گیا حالانکہ وہ ایک 'طبی حالت' بواسیر کے باعث ہندوستان جانے سے ہچکچا رہا تھا جس کے باعث وہ وائسرائے کی مسند پر بیٹھتے وقت جھک کر بیٹھتا تھا۔ اس وقت ہندوستان کے سیکریٹری آف اسٹیٹ لارڈ سالسبری نے روانگی سے قبل اسے ایک نہایت ہی معقول نصیحت کی کہ ''اگر طبیب کی مانو تو کچھ بھی صحت بخش نہیں، اگر پادری کی مانو تو کچھ بھی معصوم نہیں، اور اگر سپاہی کی مانو تو کچھ بھی محفوظ نہیں۔'' لٹن نے سپاہیوں کی بات ماننے کو ترجیح دی۔

اسے قائل کرنے میں زیادہ وقت نہیں لگا کہ سلطنت کے تحفظ کے لیے افغانستان کو زیر اثر لانا ضروری ہے۔ اس کا مطلب یہ تھا کہ کم از کم کوئٹہ میں فوجی موجودگی، خیبر تک ریلوے لائن، اور کابل، قندھار و ہرات میں برطانوی سیاسی نمائندوں کی تعیناتی درکار تھی۔ چونکہ اشوک اور اکبر کی سلطنتوں کی سرحدیں ہندوکش تک پھیلی ہوئی تھیں لہٰذا راج بھی اس سے کم پر راضی نہیں تھا۔

لٹن نے امیر شیر علی کو صاف الفاظ میں پیغام دیا کہ یا تو کابل میں برطانوی مشن کو تسلیم کرو اور خارجہ پالیسی کا اختیار ہمارے حوالے کر دو، ورنہ اس کے سنگین نتائج کے لیے تیار ہو جاؤ۔ شیر علی نے مؤقف اختیار کیا کہ اگر وہ برطانیہ کو اجازت دے گا تو روس کو انکار نہیں کر سکے گا۔ لٹن نے دوٹوک جواب دیا کہ اگر شیر علی نے بات نہیں مانی تو وہ خود بخود منظر سے ہٹا دیا جائے گا۔ اگر افغانستان نے مزاحمت کی تو اسے تین حصوں میں تقسیم کر دیا جائے گا۔ لندن کے بعض محتاط حلقوں نے خبردار کیا کہ افغانستان تین گنا مسائل پیدا کر سکتے ہیں لیکن لٹن اپنے ارادے پر قائم رہا۔

روس نے بھی حالات کو گرم رکھنے کے لیے کابل میں اپنا حمایتی عبدالرحمٰن تیار بٹھا رکھا تھا اور اس کی

پشت پناہی کے لیے ایک فوجی مشن روانہ کر دیا۔ لٹن نے لندن کو اطلاع دی کہ شیر علی ''وحشی'' اور ''مجنوں'' ہے۔ جب شیر علی نے ایک اشتعال انگیز برطانوی فوجی مشن کو خیبر کے مقام پر روک دیا تو اسے احساس ہوا کہ روسی امداد کہیں دکھائی نہیں دے رہی ہے۔ اس کی ہمت جواب دے گئی لیکن اب بہت دیر ہو چکی تھی۔

21 نومبر 1878 کی صبح تین بجے لٹن نے ہندوستان کے سیکریٹری آف اسٹیٹ لارڈ کرین بروک کو تار بھیجا Jacta est alea (پانسہ پھینکا جا چکا ہے)۔ تیس ہزار برطانوی فوجی اس بار خاکی وردی میں حرکت میں آ گئے۔ آدھے خیبر کے راستے، 6500 کرم کے راستے اور 12000 بولان درے کے ذریعے آگے بڑھے۔ حسبِ روایت کابل بغیر کسی مزاحمت کے فتح ہو گیا۔ شیر علی فرار ہو کر بلخ پہنچا اور 21 فروری 1879 کو وہیں وفات پا گیا۔ انگریزوں نے اس کے بیٹے یعقوب خان کو بادشاہ بنایا، وہی یعقوب خان جسے اس کا باپ ''حرام زادہ'' کہہ کر پکارتا تھا۔

مارچ 1879 میں یعقوب خان نے برطانوی شرائط کی مکمل طور پر توثیق کر دی جن میں خیبر درے کی ملکیت برطانیہ کے حوالے کرنا بھی شامل تھا جس کے بدلے اسے سالانہ ساٹھ ہزار پاؤنڈ کرایہ دینے کا وعدہ کیا گیا۔ یہ معاہدہ 'گنڈا مک' میں طے پایا۔ لٹن نے خود کو مبارکباد دی اور جشن منانے کا اعلان کر دیا۔

میجر سر پییئر لوئس نپولین کاویگناری کی ماں آئرش تھی، باپ فرانسیسی اور شہریت انگریزی تھی۔ جب وہ اکیاسی رکنی برطانوی مشن کی قیادت کرتے ہوئے افغانستان میں داخل ہوا تو اس کا استقبال ایک پرتکلف دعوت سے کیا گیا جس کا اختتام افیون ملی ہوئی روسی چائے اور کافی پر ہوا۔ کابل میں اس کے اعزاز میں سترہ توپوں کی سلامی دی گئی اور بینڈ نے ''گاڈ سیو دی کوئین'' کی دھن بجائی۔ کاویگناری نے قلعۂ بالا حصار سے متصل ایک رہائش گاہ میں قیام کیا۔ یعقوب خان کے کردار پر اختلاف پایا جاتا ہے۔ اگر وہ واقعی اُن فسادات کے پیچھے تھا جو ستمبر کے آغاز میں ہی پھوٹ پڑے تھے تو وہ راز رکھنے کا ماہر تھا۔ 2 ستمبر کو کاویگناری نے نئی بچھائی گئی تار کے ذریعے پشاور ایک پیغام بھیجا: ''کابل ایمبیسی میں سب خیریت ہے۔''

مگر اگلی صبح یعقوب خان سے اپنی تنخواہ کا مطالبہ کر رہے ہرات سے آئے ہوئے سپاہی کو جواب دیا گیا

کہ اپنی رقم انگریز حکمرانوں سے لیں۔ کاویگناری اس وقت ناشتہ کر رہا تھا جب وہ سپاہی اس کے سامنے آ کھڑے ہوئے۔ آٹھ گھنٹے جاری رہنے والی خوں ریز جھڑپ کے بعد پورا برطانوی مشن قتل کر دیا گیا۔

5 ستمبر کو جب لارڈ لٹن کو اس سانحے کی خبر ملی تو وہ غصے سے پھٹ پڑا۔ اس نے کہا کہ اس ہجوم میں شامل ہر فرد خواہ وہ سپاہی ہو، شہری ہو، مولوی ہو یا کسان، سب قصوروار ہیں۔ اس ردعمل سے ظاہر ہوتا ہے کہ یہ حملہ محض بپھرے ہوئے سپاہیوں کی کارروائی نہیں تھا۔ اکتوبر میں میجر جنرل سر فریڈرک رابرٹس نے کابل پر دوبارہ قبضہ کر لیا۔ یعقوب خان نے دستبرداری کا اعلان کر دیا۔ جنرل رابرٹس نے اطلاع دینے والوں کے لیے انعام مقرر کیے ... فی سر پچاس سے لے کر ایک سو بیس روپے تک۔ بالآخر اس زمانے کی فوجی عدالتوں نے ستاسی افغانوں کو پھانسی کی سزا دی۔ لیکن یہ کہانی ابھی ختم نہیں ہوئی تھی۔ دسمبر میں تقریباً دس ہزار غازیوں نے کابل میں برطانوی چھاؤنی کا محاصرہ کر لیا، جس کے بعد جنرل رابرٹس کو کمک کے لیے تار بھیجنا پڑا۔ جنوری میں دوست محمد خان کے پوتے روسی حمایت یافتہ عبدالرحمٰن نے شمال سے پیش قدمی شروع کی۔ وہی لٹن، جس نے روسی اثر کو روکنے کے لیے یہ سارا فساد برپا کیا تھا، اب لندن کو تار بھیج رہا تھا کہ چونکہ کسی مقامی حکمران کی ضرورت ہے، وہ عبدالرحمٰن کو فوری طور پر عوامی طور پر تسلیم کرنے کی سفارش کرتا ہے۔

22 جولائی کو ملکہ وکٹوریہ نے باقاعدہ طور پر عبدالرحمٰن کو تسلیم کر لیا۔ لیکن قصہ یہاں بھی ختم نہیں ہوا۔ 27 جولائی کو بیس ہزار غازیوں پر مشتمل ایک غیر منظم لشکر (اور اس بار کوئی تنخواہ کا مطالبہ نہیں تھا) نے میوند کے مقام پر ڈھائی ہزار برطانوی سپاہیوں پر مشتمل دستہ تہس نہس کر دیا جبکہ قندھار میں موجود تین ہزار برطانوی سپاہیوں کی چھاؤنی کو یعقوب خان کے بھائی ایوب خان کی زیر قیادت ایک افغان فوج نے گھیر لیا۔

جنرل رابرٹس نے کابل سے قندھار تک ایک برق رفتار مارچ کے بعد محصور فوج کو نجات دی اور ہیرو بن گیا۔ اُس نے بڑی حکمت سے نوٹ کیا کہ ''افغان انگریزوں کو جتنا کم دیکھیں گے اتنی ہی کم نفرت کریں گے۔'' اُس نے یہی مشورہ روس کو بھی دیا کہ وہ بھی اپنے مفاد میں یہی روش اپنائے۔ 1907 میں برطانیہ اور روس نے افغانستان کو آزاد چھوڑنے پر اتفاق کر لیا۔ یوں ایک بڑا کھیل اپنے انجام کو

پہنچا، یہاں تک کہ پورے ستر سال بعد روس نے اس کھیل کو دوبارہ شروع کیا۔

برطانیہ نے خیبر اپنے قبضے میں رکھا اور دعویٰ جاری رکھا کہ کابل کی خارجہ پالیسی اب بھی اسی کے اشاروں پر چلتی ہے۔ مگر جب کافر ملک سے نکل چکا ہو تو ایسی نازک باتوں کی اہمیت باقی نہیں رہتی۔ یہ غیر معمولی صورتِ حال بھی بالآخر تیسرا افغان جنگ میں ختم ہو گئی جو کہ افغانوں کی جانب سے شروع کی گئی پہلی جنگ تھی۔ 1919 میں برطانیہ جو جنگ عظیم اوّل کے بعد ایک تھکی ماندہ اور شکست خوردہ فوج کا مالک تھا، مزید لڑائی کے موڈ میں نہیں تھا، چنانچہ افغانستان کو وہ چیز عطا کر دی گئی جسے تاریخ میں اس کی ''آزادی'' کے طور پر یاد کیا جاتا ہے۔

درّانی خاندان کی حکمرانی اس کے باوجود جاری رہی، یہاں تک کہ ظاہر شاہ جو 1933 میں اقتدار میں آیا تھا اور 1973 میں فوجی بغاوت کے نتیجے میں معزول کر دیا گیا۔ اس بغاوت کی قیادت اس کے ہی رشتہ دار سردار محمد داؤد نے کی جو افغانستان کے پہلے صدر بنے۔ ان کے پیچھے ایک شہری علاقوں میں مضبوط سوشلسٹ جماعت ''پرچم'' کی حمایت موجود تھی جس کی قیادت ببرک کارمل کر رہا تھا۔ اب زار شاہی ایک نئے قالب میں واپس آ چکی تھی۔ اس بار سوویت یونین کے سوشلسٹ جمہوری اتحاد کی شکل میں۔

پاکستان کے وزیراعظم ذوالفقار علی بھٹو نے اس خطرے کا توڑ نکالنے کے لیے ایک چھوٹی سی اسلامی جماعت کو فروغ دینا شروع کیا۔ اس کے تین نمایاں رہنما گلبدین حکمت یار، برہان الدین ربانی، اور احمد شاہ مسعود جان بچا کر پشاور فرار ہو گئے۔ یہی تینوں بعد میں سوویت یونین کے خلاف افغان جہاد میں عالمی سطح پر معروف ہو گئے۔

اپریل 1978 میں سردار داؤد کا اپنے ہی حامیوں کے ہاتھوں قتل ہو گیا۔ اقتدار کی ہوس نے پرچم جماعت کو دو دھڑوں میں بانٹ دیا... خلق (عوام) اور پرچم (علم)۔ داؤد کا جانشین نور محمد ترکئی بھی اپنے ہی رفیقوں کے ہاتھوں مارا گیا، اور کچھ عرصے کے لیے حفیظ اللہ امین نے اقتدار سنبھالا۔ دسمبر 1978 کے آخری عشرہ میں سوویت فوج اور کے جی بی کے دستوں نے کابل پر قبضہ کر لیا اور ببرک کارمل کو جو اب ایک کٹھ پتلی سوشلسٹ حکمران تھا تخت پر بٹھا دیا گیا۔ کابل ایک بار پھر بغیر کسی مزاحمت کے فتح ہو گیا۔ وہی افغانستان جو کبھی امریکہ کے لیے ایک دور افتادہ اجنبی اور غیر متعلق ملک

تھا، اب اس کی عالمی حکمت عملی کا مرکز بن چکا تھا۔ اس طویل اور خونی جنگ میں اندازاً پندرہ لاکھ افغان اپنی جانوں سے ہاتھ دھو بیٹھے۔ اور جب 1989 میں سوویت افواج افغانستان سے پسپا ہوئیں، تب تک دنیا کا منظرنامہ یکسر بدل چکا تھا۔

پاکستانی صحافی احمد رشید جن کی معروف کتاب Taliban: Islam, Oil and the New Great Game in Central Asia (آئی بی ٹاورس، لندن، 2000) عالمی سطح پر پذیرائی حاصل کر چکی ہے، اپریل 1989 میں وزیراعظم بے نظیر بھٹو کی جانب سے دیے گئے ایک عشائیے کا ذکر کرتے ہیں۔ اس عشائیے کے مہمانوں میں لیفٹیننٹ جنرل حمید گل بھی شامل تھا، جو اس وقت آئی ایس آئی (انٹر سروسز انٹیلی جنس) کا سربراہ تھا۔ آئی ایس آئی وہی خفیہ ادارہ ہے جس نے افغانستان میں سوویت افواج کے خلاف پاکستان کی جنگی حکمت عملی کی قیادت کی۔ [یہاں ایک نکتہ قابلِ ذکر ہے کہ اس وقت ''جہاد'' مغرب میں ایک قابل احترام اصطلاح تھی۔ امریکی سینیٹرز احمد شاہ مسعود جیسے جہادیوں کے ساتھ تصویریں کھنچوانے کے لیے بیتاب رہتے تھے۔ خاص طور پر آمر جنرل ضیاء الحق جیسے پاکستانی رہنما مذاق میں کہا کرتے تھے کہ امریکی سیاست دان سرحد پار افغانستان میں صرف ایک پاؤں رکھتے، تصویر کھنچواتے، اور فوراً اپنے انتخابی حلقوں میں لوٹ کر خود کو جنگی ہیرو کے طور پر پیش کرتے۔ یہ بات جنرل ضیاء کے ساتھ میری کئی ملاقاتوں میں سے ایک میں خود ان کی زبان سے سنی۔] احمد رشید نے 1989 کے اس وقت کے سب سے بااثر جنرل سے سوال کیا کہ کیا وہ جہاد کو فروغ دے کر آگ سے کھیل نہیں رہے؟ جنرل حمید گل نے جواب دیتے ہوئے یہ کہا کہ ''ہم جہاد لڑ رہے ہیں اور یہ جدید دور کی پہلی اسلامی بین الاقوامی بریگیڈ ہے۔ کمیونسٹوں کی اپنی بین الاقوامی بریگیڈز تھیں، مغرب کے پاس نیٹو ہے، تو مسلمان کیوں متحد ہو کر ایک مشترکہ محاذ قائم نہیں کر سکتے؟''

اسی طرز فکر نے سوویت یونین کے خلاف جہاد کو ایک وسیع تر اور دیرپا عالمی مشن میں بدل دیا۔ امریکہ نے اس جہادی تسلسل کے ممکنہ نتائج کو اہمیت نہیں دی۔ امریکی صدر جمی کارٹر کے قومی سلامتی کے مشیر زبگنیو بریژنسکی کا مشہور قول ہے کہ ''کیا چند مشتعل مسلمان سوویت یونین کی شکست اور مشرقی یورپ کی آزادی سے زیادہ اہم ہو سکتے ہیں؟'' انہی ''مشتعل مسلمانوں'' میں اسامہ بن

لادن بھی شامل تھا جو پہلی بار 1980 میں سعودی خفیہ ادارے (استخبارات) کے سربراہ شہزادہ ترکی بن فیصل کی پرجوش حمایت کے ساتھ پشاور آیا۔ 1984 میں اسامہ کا قریبی ساتھی اور شاید نظریاتی رہنما عبداللہ عزام نے 'مکتب الخدمت' (Centre for Service) کے نام سے ایک ادارہ قائم کیا جہاں سے وہ نیٹ ورک وجود میں آیا جو بعد ازاں ''القاعدہ'' کہلایا۔

اگست 1996 میں اسامہ بن لادن نے پہلی مرتبہ امریکہ کے خلاف جہاد کا باضابطہ اعلان کیا۔ اس اعلان میں دیگر امور کے ساتھ یہ بھی شامل تھا کہ عراق کے خلاف جنگ ختم ہونے کے باوجود 20000 امریکی فوجی سعودی عرب کی سرزمین پر موجود ہیں۔ اس بیان میں کہا گیا کہ ''ظلم اور ذلت کی دیواریں صرف گولیوں کی بارش سے گرائی جا سکتی ہیں۔'' فروری 1998 میں القاعدہ اور اس کی اتحادی جماعتوں نے ایک منشور جاری کیا جسے ''یہودیوں اور صلیبیوں کے خلاف بین الاقوامی اسلامی محاذ برائے جہاد'' کے نام سے پیش کیا گیا۔ اس میں لکھا گیا:

> ''امریکہ سات سال سے زائد عرصے سے اسلامی سرزمین جزیرہ نما عرب پر قابض ہے، اس کے وسائل کو لوٹ رہا ہے، حکمرانوں کو حکم دے رہا ہے، عوام کو ذلیل کر رہا ہے، ہمسایہ اقوام کو خوفزدہ کر رہا ہے، اور اس کی فوجی چھاؤنیاں اسلامی اقوام کے خلاف حملوں کے لیے نیزے کی نوک بن چکی ہیں۔'' اس کا جو حل پیش کیا گیا وہ یہ تھا کہ ''شہری ہو یا فوجی امریکیوں اور ان کے اتحادیوں کو قتل کرنا ہر اس مسلمان کا انفرادی فریضہ ہے جو ایسا کسی بھی ملک میں رہ کر انجام دے سکتا ہو۔''

یہ اعلان اگرچہ افغانستان سے جاری ہوا لیکن اس جہاد کو انفرادی اور ادارہ جاتی سطح پر جو مدد ملی وہ پاکستان سے آئی۔ پاکستان جو برطانوی راج کے آخری ایام میں ہندوستان سے الگ ہو کر مسلمانوں کے لیے ایک وطن کی حیثیت سے وجود میں آیا، اپنے قیام کے غیر معمولی جذباتی پس منظر کی وجہ سے آج بھی ایک پیچیدہ سیاسی حقیقت ہے۔ یہی جذبات بھارت اور پاکستان کی سیاست کو آج تک متاثر کر رہے ہیں... وہ دو ریاستیں جواب ایٹمی طاقت بن چکی ہیں۔ برصغیر میں ماضی کبھی حال سے جدا نہیں ہوتا۔

12

# تاریخ کا قہر، جہاد کا سکوت

''وہ [مسلمان] صرف لوٹ مار پر اکتفا نہیں کرتے تھے بلکہ مندروں کو مسمار کرتے، بتوں کو توڑتے، عورتوں کی عصمت دری کرتے۔ دوسرے مذاہب کی توہین اور انسانیت کی تذلیل ایسی تھی جس کا تصور بھی ممکن نہ تھا۔ بادشاہ بننے کے بعد بھی وہ ان گھناؤنی خواہشات سے نجات نہ پا سکے۔ یہاں تک کہ اکبر جسے رواداری کا علمبردار سمجھا جانے والا شہنشاہ بھی اورنگ زیب جیسے بدنام زمانہ بادشاہوں سے کچھ بہتر نہیں تھا۔''

[سریندر ناتھ چیٹر جی چٹوپادھیائے، ممتاز بنگالی ناول نگار، 1926 کی ایک تقریر میں]

غصہ سے بھرپور تاریخ جس میں اور انتقام سے لبریز ادب نے ہندوستان کو تقسیم کر دیا اور پاکستان کے وجود کی راہ ہموار کی۔

12 جنوری 2002 کی شام پاکستان کے چودھویں صدر اور فوجی بغاوت کے ذریعے اقتدار پر قابض ہونے والے تیسرے جنرل پرویز مشرف نے ٹیلی ویژن پر ایک نہایت اہم اور طویل انتظار کی حامل تقریر کی۔ اس تقریر کی توقع بجا تھی۔ صدر مشرف نے اپنے عوام، ہمسایہ ممالک اور دنیا سے خطاب کرتے ہوئے اعلان کیا کہ پاکستان اب ان انتہا پسندوں اور دہشت گردوں کو مزید برداشت نہیں کرے گا جنہوں نے ملک میں ریاست کے اندر ایک ریاست قائم کر رکھی ہے، قانون کو اپنے ہاتھ میں لے لیا ہے اور دنیا کے لیے ایک سنگین خطرہ بن چکے ہیں۔ وقت آ گیا ہے کہ ان

کے نام نہاد جہاد کا خاتمہ کیا جائے۔ انہوں نے اپنی تقریر میں کہا تھا کہ ''انتہا پسند اقلیت کو یہ سمجھ لینا چاہیے کہ دنیا بھر میں مسلح جہاد برپا کرنے کی ذمے داری پاکستان پر عائد نہیں ہوتی۔''

صدر مشرف نے اپنی بے باک اور جراتمندانہ تقریر میں مزید کہا کہ ''فرقہ وارانہ دہشت گردی برسوں سے جاری ہے۔ ہر شخص اس سے تنگ آ چکا ہے۔ یہ اب نا قابل برداشت ہوگئی ہے۔ ہمارا پرامن عوامی طبقہ کلاشنکوف اور اسلحے کی اس ثقافت سے نجات چاہتا ہے۔ سب اس سے بیزار ہو چکے ہیں... حساب کا دن آ پہنچا ہے۔ کیا ہم چاہتے ہیں کہ پاکستان ایک مذہبی ریاست بن جائے؟''

انہوں نے کہا:

> ''ہم اس بات سے بخوبی واقف ہیں کہ ہمیں اپنے معاشرے کو انتہا پسندی سے پاک کرنا ہے اور یہ کام ابتدا ہی سے جاری ہے۔ کچھ انتہا پسند جو احتجاج کر رہے ہیں وہ ایسے لوگ ہیں جو دین پر اجارہ داری قائم کرنا چاہتے ہیں اور اپنے مخصوص مسلک کو پھیلانے کی کوشش کرتے ہیں۔ وہ یہ سمجھتے ہیں کہ باقی مسلمان نہیں ہیں۔ یہی وہ لوگ ہیں جنہوں نے طالبان کو اسلام کی علامت سمجھا اور یہ تصور قائم کیا کہ طالبان اسلام کی نشاۃ ثانیہ لا رہے ہیں یا اسلام کی سب سے خالص شکل پر عمل کر رہے ہیں۔ میں ان انتہا پسندوں سے یہ سوال کرنا چاہتا ہوں کہ ہزاروں پاکستانیوں کو افغانستان میں قتل ہونے کے لیے کس نے گمراہ کیا؟ کچھ مساجد کو نفرت پھیلانے اور اشتعال انگیزی کے لیے استعمال کیا جا رہا ہے۔ میں آپ کو آگاہ کرنا چاہتا ہوں کہ متعدد دہشت گرد گروہوں کو گرفتار کیا جا چکا ہے۔ ریاست کی عملداری کو چیلنج کیا جا رہا ہے۔ پاکستان کو ایک کمزور ریاست بنا دیا گیا ہے جہاں قانون کی بالادستی پر سوال اٹھائے جاتے ہیں۔''

یہ تقریر کرنا کسی پاکستانی صدر کے لیے آسان نہیں ہوسکتا تھا۔ صدر مشرف چاہتے تو خاموش رہ سکتے تھے مگر وہ اپنے پیشروؤں سے مختلف ثابت ہوئے۔ ان کی دیانت داری یہ تھی کہ انہوں نے اعتراف کیا کہ یہ ناسور اب ریاست کے رگ وپے میں سرایت کر چکا ہے۔

یہ سوال ناگزیر ہے کہ ایک ایسا ملک جو مسلمانوں کے لیے وطن کے طور پر وجود میں آیا تھا وہ مسلم دہشت گردوں کا گڑھ کیسے بن گیا؟ ابتدائی دور میں جب شدت پسند عناصر پاکستان میں اقتدار حاصل نہ کر سکے تو انہوں نے ایک متوازی ریاست (parallel state) قائم کر لی۔ اس متوازی ریاست کے دو بنیادی مقاصد تھے۔ پہلا یہ کہ ان مدارس کے ذریعے نوجوان اذہان کی ذہن سازی کی جائے جو ان کے کنٹرول میں تھے۔ دوسرا یہ کہ وقتاً فوقتاً مختلف دشمنوں کے خلاف جہاد کا اعلان کیا جائے، جن میں بھارت، روس، امریکہ اور کبھی کبھار خود پاکستانی حکومت بھی شامل تھی۔ طالبان کے دور حکومت میں افغانستان اس متوازی ریاست کا باضابطہ اتحادی بن چکا تھا۔

زیادہ اہم مگر کم نمایاں پہلو یہ تھا کہ انہوں نے مختلف حکومتوں کو بھی اپنے مقاصد کے لیے استعمال کیا۔ سعودی عرب سے مالی وسائل کبھی خاموشی سے اور کبھی مذہبی تعلیم جیسے بلند و بالا عنوانات کے تحت آتے رہے۔ مگر کبھی کسی نے یہ نہیں پوچھا کہ یہ سرمایہ آخر کس مد میں خرچ ہو رہا ہے۔ اس کے ساتھ دیگر حفاظتی پردے بھی موجود تھے۔ سوویت یونین کے خلاف جہاد درحقیقت مغربی دنیا اور بیشتر مسلم ممالک کی مالی و عسکری مدد کے ذریعے ہی ممکن ہوا تھا۔ اس جنگ میں بہائے گئے وسائل اور چھوڑی گئی میراث کی جھلک آج بھی اسلحے کے اس کلچر میں دیکھی جا سکتی ہے جسے صدر مشرف نے اپنی تقریر میں کلاشنکوف کلچر کے نام سے یاد کیا۔ امریکہ اور برطانیہ اب کب کے اس جہاد سے خود کو الگ کر چکے ہیں مگر پاکستان کی یہ متوازی ریاست آج بھی چیچنیا میں روس کے خلاف اس نام نہاد مقدس جنگ کی سرپرستی کر رہی ہے۔

امریکہ کے خلاف جہاد 1990 کی دہائی میں اپنے بھرپور انداز میں ابھرا اور یہ جہاد پاکستان اور سعودی عرب کے بعض مقتدر حلقوں میں ہمدرد اور معاون عناصر سے خالی نہیں تھا۔ 11 ستمبر 2001 کے بعد واشنگٹن کے اثر و رسوخ نے کسی اختلافی آواز کے لیے گنجائش باقی نہیں رہنے دی لیکن سرگوشیاں آج بھی سنائی دیتی ہیں۔

بھارت کے خلاف جہاد کے معاملے میں پاکستانی حکومت پر ہمیشہ بھروسہ کیا جا سکتا تھا، کیونکہ یہ اُس کی ایک غیر اعلانیہ مگر کھلم کھلا جنگ تھی۔ کئی انتہا پسند تنظیموں نے نہایت ہوشیاری سے اس اجازت کو

ایک وسیع ترایجنڈے کے لیے استعمال کیا۔ بھارت کے خلاف جہاد جسے عوامی سطح پر اور حکومتی سطح پر وسیع حمایت حاصل تھی، متوازی ریاست کی اصل توانائی اور بقا کا ذریعہ بن گیا۔ اسی کے پردے میں ایسے دہشت گرد بھی پنپتے رہے جنہیں دیگر محاذوں پر بھیجا جاتا تھا۔

پاکستان کا بھارت کے خلاف غصہ محض مسئلہ کشمیر تک محدود نہیں ہے۔ اس کی جڑیں کہیں زیادہ گہری ہیں اور انہیں مکمل طور پر سمجھنا ضروری ہے۔ دہشت گردی کی ہر تحریک اپنے لیے کوئی نہ کوئی دلیل تراش لیتی ہے، اور بھارت نے یہ دلیل مہیا کر دی۔ اس غصے کی جڑیں تاریخ میں بہت دور تک پیوست ہیں۔

انیسویں صدی کے دوسرے نصف میں انتقام پر مبنی لٹریچر پورے زور وشور سے پروان چڑھا اور اس کا مرکز ملک کا سب سے زیادہ خواندہ اور سیاسی شعور رکھنے والا شہر کلکتہ تھا۔ کلکتہ اس وقت نہ صرف برطانوی راج کا دارالحکومت تھا بلکہ ہندوستانی ذہانت اور فکری سرگرمیوں کا بھی گہوارہ تھا۔ اس دور کے ایک نمایاں فکری رجحان نے ایک سوال پر بار بار غور کیا کہ 'آخر ہندوؤں سے کیا غلطی ہوئی؟' وہ کس طرح صدیوں تک دہلی اور بنگال میں مسلم حکمرانوں کے اقتدار کو برداشت کرتے رہے؟ اور پھر کس طرح وہ خود برطانویوں کے ماتحت کلرک اور پیشہ ور بن گئے، وہی بدنام زمانہ ''بنگالی بابو''؟ اسی عہد کے ممتاز نثر نگار، ناول نویس اور سب سے با اثر دانشور بنکم چندر چٹوپادھیائے (1838-1894) نے اس سوال کا جواب تلاش کرنے کی کوشش کی کہ بنگالی بابو آخر ہے کون؟ اور اس کا جواب نہایت زہریلا اور کاری تھا:

''جیسے وشنو ابدی بستر پر لیٹے رہتے ہیں ویسے ہی بابو بھی ہمیشہ پڑا رہے گا۔ وشنو کے دس اوتار ہوتے ہیں بابو کے بھی ہوں گے۔ کلرک، استاد، برہمو، بروکر، ڈاکٹر، وکیل، جج، زمیندار، اخبار نویس اور نکمّا۔ وشنو کی طرح یہ بھی ہر اوتار میں دیووں کو فنا کرے گا۔ کلرک بنے گا تو اپنے ماتحتوں کو، استاد بنے گا تو شاگردوں کو، اسٹیشن ماسٹر ہوگا تو بغیر ٹکٹ کے مسافروں کو، برہمو بنے گا تو غریب پنڈت کو، بروکر ہوگا تو انگریز تاجر کو، ڈاکٹر بنے گا تو مریض کو، وکیل ہوگا تو اپنے مؤکل کو، جج بنے گا تو فریقین کو، زمیندار ہوگا تو کسانوں کو، اخبار نویس ہوگا تو معصوم عوام کو اور نکمّا ہوگا تو تالاب کی مچھلیوں تک کو برباد کرے

گا۔جس کے دل میں ایک بات ہو بولتے ہوئے دس ہو جائے، لکھتے وقت سو ہو جائے اور جھگڑے میں ہزار گالیوں میں ڈھل جائے وہی بابو ہے۔جس کی طاقت ہاتھ میں جتنی ہو زبان میں دس گنی ہو پیٹھ پیچھے سو گنی ہو اور عمل کے وقت غائب ہو وہی بابو ہے۔جس کا دیوتا انگریز ہو، پیشوا برہمو واعظ ہو، صحیفے اخبارات ہوں اور زیارت نیشنل تھیٹر ہو وہی بابو ہے۔جو مشنری کے سامنے عیسائی بنے، کیشب چندر کے سامنے برہمو ہو، باپ کے سامنے ہندو کہے اور برہمن فقیر کے سامنے دہریہ بن جائے وہی بابو ہے۔جو گھر میں پانی پیے، دوستوں کے ہاں شراب چکھے، طوائف سے گالیاں کھائے اور افسر سے ٹھوکر کھائے وہی بابو ہے۔جو نہاتے وقت تیل سے نفرت کرے کھاتے وقت اپنی انگلیوں سے گھن کھائے اور بولتے وقت اپنی ہی زبان سے بیزاری دکھائے وہی درحقیقت بابو ہے...اے بادشاہ! وہ قوم جس کی خوبیاں میں نے بیان کی ہیں، یہ سمجھتی ہے کہ پان چبانے، بستر پر لیٹے رہنے، دوزبانوں میں بات چیت کرنے اور تمبا کو نوشی کے ذریعے وہ دوبارہ ہندوستان کو فتح کر لے گی۔''

[یہ ترجمہ ماخوذ ہے: پارتھا چٹرجی کی کتاب The Nation and Its Fragments: Colonial and Postcolonial Histories (آکسفرڈ یونیورسٹی پریس، نئ دہلی، 1993) سے]

یہ طنز بھری ذہانت بے مثال ہے اور آخری جملے میں بے بسی کا غم پوری شدت کے ساتھ محسوس ہوتا ہے۔

اس زمانے کے بعض جوابات حد تخیل سے بھی آگے نکل جاتے تھے۔ بنگلہ میں شائع ہونے والی پہلی تاریخ 'راجابلی' 1808 میں منظر عام پر آئی جسے ایسٹ انڈیا کمپنی کے فورٹ ولیم کالج میں سنسکرت کے استاد مرتیونجے ودیالنکر نے لکھا تھا۔انہوں نے دہلی کے آخری ہندو بادشاہ پرتھوی راج چوہان کی 1162ء میں شکست کو ایک دلسوز کہانی کے ذریعے بیان کیا۔کہانی یوں تھی کہ پرتھوی راج کے والد کی دو بیویاں تھیں جن میں سے ایک چڑیل تھی۔وہ اپنے شوہر کو انسانی گوشت کھانے پر مجبور کرتی۔اس صورت حال سے خوف زدہ ہو کر دوسری بیوی اپنے بھائی کے گھر چلی گئی اور وہیں پرتھوی راج پیدا ہوا۔جب وہ جوان ہوا تو اس نے ایک طرح کے ادپسی انتقام کے طور پر اپنے باپ کو قتل کیا اور اس کا گوشت اکیس عورتوں کو کھلایا۔مگر باپ کا خون ہمیشہ بدلہ مانگتا ہے۔یہی وجہ تھی کہ پرتھوی راج اپنی

سلطنت ایک 'یونانی' یعنی مسلمان دیو کے ہاتھوں ہار بیٹھا۔ اس بیانیے میں مسلمان بیرونی دیو اور شیطان کی صورت میں پیش کیے گئے جو ہندوستان پر حکومت کرنے آئے۔

بنکم چندر ایسی کہانیوں کے لیے وقت ضائع کرنے کے قائل نہ تھے۔ 1880 میں اپنے بنگالی ہم وطنوں سے ایک سلسلہ وار لیکچر کے آغاز پر وہ بول اٹھے کہ ''ہمارے پاس کوئی تاریخ نہیں۔ ہمیں ایک تاریخ چاہیے۔'' وہ افسوس کے ساتھ کہتے ہیں ''یہاں تک کہ اوڑیا لوگوں کے پاس بھی اپنی تاریخ ہے۔'' (اوڑیا یعنی ہمسایہ صوبے کے لوگ جنہیں بنگالی بابو اپنے سے کمتر سمجھتے تھے۔)

بنکم نے مسلمان بادشاہوں اور درباروں کے ریکارڈز پر مبنی تاریخ کو مسترد کر دیا۔ ان کے الفاظ میں ''جو کوئی بھی ان جھوٹے، ہندو دشمن، متعصب مسلمانوں کی گواہی کو بغیر سوچے سمجھے تاریخ مان لے وہ بنگالی کہلانے کا مستحق نہیں ہے۔'' (یاد رہے کہ بنکم کے تصور میں بنگالی قوم میں بنگالی مسلمان پوری طرح شامل نہیں تھا۔)

بنکم ایک ایسی تاریخ کے متلاشی تھے جو صدیوں کی شکست خوردگی میں ڈوبے ہوئے ہندوؤں کے اندر نئی روح پھونک دے۔ ان کے نزدیک انگریز اور مسلمان دونوں ہی غیر ملکی حملہ آور تھے، اگرچہ انگریزوں کو وہ تہذیب اور شائستگی کے اعتبار سے بہتر گردانتے تھے۔ ان کے خیال میں ہندوستانی قوم پرستی دراصل ہندو قوم پرستی ہی کی توسیع تھی۔ اس فکر کی سب سے پُراثر اور دل میں اتر جانے والی ترجمانی ان کے مشہور گیت ''وندے ماترم'' میں نظر آتی ہے جو دیوی درگا کے حضور ایک مناجات ہے۔ دیوی درگا جو مادر وطن کی محافظ ہیں، اپنے شفقت آمیز اور غضبناک دونوں روپوں میں سرزمینِ ہند کو سنوارتی ہیں، اسے پروان چڑھاتی ہیں اور اس پر حملہ آور دیووں یعنی دشمنوں سے پاک کرتی ہیں۔

بنکم محض فکری احیا پر اکتفا نہیں کرنا چاہتے تھے بلکہ وہ ہندو قوم کے لیے ایک مقدس جنگ کی آرزو بھی رکھتے تھے۔ انہوں نے یہ پیغام اپنے مقبول ناولوں میں بار بار پیش کیا ہے، خصوصاً ''آنند مٹھ'' میں جس میں 1770 کے قحط کے زمانے میں ناگا دسنمی فرقے کے جوگیوں اور ایک مسلمان نواب کے درمیان تصادم کی کہانی بیان کی گئی ہے۔ اس ناول کے ہندو کسانوں کا نعرہ تھا:

''جب تک ہم ان ناپاک غلیظ مسلمانوں کو یہاں سے نکال باہر نہیں کریں گے، ہندو قوم تباہ ہوتی رہے گی۔ وہ دن کب آئے گا جب ہم ان مسجدوں کو زمین بوس کر کے ان کی جگہ رادھامدھو کے مندر تعمیر کریں گے؟''

اس کہانی کی ایک بار بار گونجنے والی صدا تھی: ''کمینے مسلمانوں کو مار ڈالو۔''

مورخ تانیکا سرکار کی اپنی ایک بصیرت افروز تحریر Making India Hindu (آکسفرڈ یونیورسٹی پریس، نئی دہلی، 1996) میں شائع ہوئی ہے جس سے یہاں پیش کیے گئے اقتباسات لیے گئے ہیں۔ وہ لکھتی ہیں:

''بنکم نے انیسویں صدی کی ہندو احیائی تحریک اور بعد کے مسلم مخالف پر تشدد سیاسی رجحانات کے درمیان ایک نہایت مؤثر پل کا کردار ادا کیا۔ انہوں نے فرقہ وارانہ تشدد کی ایک انتہائی طاقتور تصویری شکل پیش کی اور اسے قیامت خیز مقدس جنگ کا درجہ دے دیا۔ انہوں نے اس تصور کو فرقہ وارانہ سیاست کے اجتماعی تخیل میں ہمیشہ کے لیے ثبت کر دیا جہاں انتقام اور فرقہ وارانہ تشدد کی جبلت کو ایک نسوانی جسم کی صورت میں پیش کر کے جذبات کو مہمیز دی گئی۔ مادرِ وطن کی عصمت دری شدہ شبیہ ایک نہایت مؤثر اور دلوں کو جھنجھوڑ دینے والا استعارہ بن گئی۔''

بنکم کی تخلیق کردہ سب سے طاقتور کردار عورتیں ہیں کیونکہ مردوں نے قوم کو مایوس کیا تھا جبکہ عورتوں نے اپنے اصل مزاج اور باطنی قوت کو قائم رکھا تھا۔ بنگال کی نشاۃ ثانیہ کو اپنے فکری بیانیے کے لیے ایک تاریک عہد درکار تھا جو اسے مسلم دورِ حکومت میں دکھائی دیا۔ اسے ایک سنہرا ماضی بھی چاہیے تھا جو کہیں حقیقت اور کہیں تخیل کے بکھرے ہوئے ٹکڑوں میں مل گیا۔ بنکم نے بنگالیوں کو یونانی ایتھینین قوم سے تشبیہ دی کیونکہ کبھی بنگالیوں نے سری لنکا اور انڈونیشیا تک فتوحات حاصل کی تھیں۔ جب وہ اس شاندار ماضی کو یاد کرتے اور پھر اپنے اردگرد عیش پرستی اور کمزور ارادے کے شکار بنگالی بابو کو دیکھتے تو طنز ہی ان کے لیے واحد آسودگی بن جاتا۔

محض نرمی اور کمزوری اس زوال کی مکمل وضاحت نہیں تھی۔ مرہٹے اور سکھ جو مقامی اقوام تھے، اپنے وقت میں انگریزوں کو شکست دے چکے تھے۔ بنکم اس بات پر فکرمند تھے کہ ہندو اپنی آزادی کی آرزو کھو چکے ہیں۔ ان کے نزدیک طاقت صرف جسمانی قوت نہیں بلکہ اس کا سرچشمہ جرات، ہمت، اتحاد، استقامت اور ایک خاص رویے میں ہے۔ یورپی اقوام طاقت کی عبادت کرتی ہیں اس لیے وہ طاقت رکھتی ہیں۔ ہندو اس قدر روحانیت میں محو ہو گئے تھے کہ عملی زندگی کا ذوق ہی کھو بیٹھے تھے۔

یہ دوہری بدقسمتی تھی، کیونکہ حل ہندومت کی صحیح تفہیم میں مضمر تھا۔ بنکم کے نزدیک ہندومت سب سے اعلیٰ مذہب تھا کیونکہ یہ بیک وقت عملی اور فلسفیانہ تھا اور ریاکاری سے پاک تھا۔ مہابھارت کے مرکزی کردار شری کرشن جنگ سے نفرت کرتے تھے لیکن جب ضرورت پیش آتی تو میدان میں اتر کر ناقابل شکست ہو جاتے۔ بنکم لکھتے ہیں:

''کرشن ہی انسان کے لیے حقیقی مثالی کردار ہیں۔ کرشن خود ایک خاندانی، سفارتکار، جنگجو، قانون ساز، درویش اور مبلغ تھے۔ اس حیثیت سے وہ ایک مکمل انسانی نمونہ پیش کرتے ہیں۔''

اس مقام تک پہنچنے کے لیے ہندومت پر چھائے قدامت پرستی اور توہم پرستی کے پردوں کو ہٹانا ضروری تھا۔ عقل بنگالی کی سب سے بڑی خوبی تھی مگر شاید اسی عقل کی پرستش نے بنگالی کو جسمانی تربیت اور توانائی سے غافل کر دیا تھا جس کے باعث وہ کمزور اور ناتواں ہو گیا۔ یہی کمزوری مسلمانوں جیسے وحشیوں کو موقع دیتی کہ ہندوؤں پر غلبہ پائیں، مندروں کو تباہ کریں اور ایک تصور جس پر بار بار زور دیا جاتا، ہندو عورتوں کی عصمت دری کریں۔

مسلمانوں کے لیے یہی نفرت ایک اور مقبول بنگالی ناول نگار کی تحریروں میں بھی نہایت واضح انداز میں نظر آتی ہے۔ وہ مصنف جن کی کہانیوں پر فلمیں بن چکی ہیں اور جن کا افسانوی ادب اسکولوں کے نصاب میں شامل ہے۔ شرت چندر چٹوپادھیائے نے 1926 میں بنگال صوبائی کانفرنس میں 'برتمان ہندو مسلم سمسیا' (موجودہ ہندو مسلم مسئلہ) پر ایک تقریر کی جو بعد میں 'ہندو سنگھ' میں شائع ہوئی۔ ان کے خیال میں ہندو مسلم اتحاد، خاص طور پر وہ اتحاد جسے مہاتما گاندھی نے فروغ دیا تھا،

ایک خطرناک فریب تھا، کیونکہ ''کسی جھوٹے مقصد کی جنگ جیتی نہیں جا سکتی''۔ ان کے نزدیک دونوں قوموں کی سیاسی امنگیں نا قابل مصالحت تھیں اور مسلمان جب اپنے مقاصد کے لیے ہندوؤں کی حمایت چاہتے تھے تو یہ سراسر نفاق تھا۔ شرت چندر لکھتے ہیں:

> ''سچ یہ ہے کہ اگر کبھی مسلمان یہ کہیں کہ وہ ہندوؤں کے ساتھ اتحاد چاہتے ہیں تو اس سے بڑا دھوکہ کوئی نہیں۔ مسلمان ہندوستان کو لوٹنے آئے تھے نہ کہ یہاں سلطنت قائم کرنے کے لیے۔''

ایسے میں حقائق کی کوئی اہمیت نہ تھی۔ تعصب ہر وقت پسِ منظر میں موجود رہتا۔

وہ [مسلمان] صرف لوٹ مار پر اکتفا نہیں کرتے تھے بلکہ مندروں کو منہدم کرتے، بتوں کو توڑتے، عورتوں کی آبروریزی کرتے۔ دوسرے مذاہب کی توہین اور انسانیت کی تذلیل ایسی تھی کہ تصور بھی ممکن نہ تھا۔ بادشاہ بننے کے بعد بھی وہ ان گھناؤنی خواہشات سے چھٹکارا نہ پا سکے۔ یہاں تک کہ اکبر جسے رواداری کا علمبردار سمجھا جاتا ہے، وہ بھی اورنگزیب جیسے بدنام حکمرانوں سے کچھ بہتر نہیں تھا۔''

مندروں کی تباہی اور عورتوں کی عصمت دری اس پورے بیانیے کا مستقل اور لازم جزو بنا دی گئی تھی۔ مسلمانوں کے بارے میں یہ گمان کیا گیا کہ وہ کبھی اس تہذیب اور شائستگی کو نہیں پا سکتے جو ہندوؤں کے پاس ہے:

''اگر علم کی اصل وسعتِ فکر اور دل کی تہذیب میں ہے تو دونوں قوموں کا آپس میں کوئی موازنہ نہیں ہو سکتا۔ مساوات صرف مدمقابل میں ہی ممکن ہے۔ ایک ہزار برس بھی کافی ثابت نہ ہوئے اور ایک اور ہزار سال بھی ناکافی ہوں گے۔ 'ہندو مسلم اتحاد' محض ایک دکھاوے کی نعرہ بازی ہے۔ ہمیں اس خوش فہمی کو ترک کر دینا چاہیے۔ بنگالی مسلمانوں کو یہ طعنہ دینا بھی بے معنی ہے کہ وہ سات پشت پہلے ہندو تھے اور اس لیے ہم سے خون کا رشتہ رکھتے ہیں۔ اگر بھائی کو مارنا گناہ ہے تو اس میں ہلکی سی بھی ہمدردی دکھانا فضول ہے۔''

مسلمانوں کی تہذیبی پسماندگی نے انہیں وحشی، سنگ دل، متعصب اور عورتوں کے لیے ایک مسلسل خطرہ بنا دیا تھا۔ ان میں امیر و غریب کی کوئی تمیز نہیں تھی۔ دونوں ہی جاہل اور غیر متمدن تھے۔ اس کے برعکس ہندو تہذیب ایسی دولت تھی جو طبقاتی فرق سے بالاتر ہر ہندو کے حصے میں آتی تھی۔ ظلم گویا اسلام کی شناخت بن چکا تھا۔

''ہم کمزور ہندو بس یہی کرتے رہتے ہیں کہ ان کے مظالم، جبر اور ہم پر ان کی دشمنی کی فہرستیں تیار کرتے ہیں اور ہر بار یہی دہراتے ہیں: تم نے ہمیں قتل کیا، ہمارے بت توڑے، ہماری عورتوں کا اغوا کر لیا۔ تم نے ہم پر سخت ظلم کیا اور ہمیں نا قابل برداشت دکھ دیا۔ ہم اس حالت میں مزید نہیں جی سکتے۔ کیا ہم اس سے آگے کبھی کچھ کہتے یا کرتے ہیں؟''

وہ مزید لکھتے ہیں:

> ''یہ سرزمین ہندوؤں کی ہے۔ اس لیے اسے غلامی کی زنجیروں سے آزاد کرانے کی ذمے داری بھی صرف ہندوؤں پر عائد ہوتی ہے۔ مسلمان ترکی اور عرب کی طرف دیکھتے ہیں۔ ان کے دل اس ملک سے منسلک ہوئے ہی نہیں۔''

گاندھی کے اس تصور کو کہ ہندو مسلم اتحاد سے آزادی ممکن ہے، وہ یکسر رد کرتے ہیں:

''میں آپ سے پوچھتا ہوں، کیا فریب سے قوم کو آزادی مل سکتی ہے؟ جب ہندو خود آگے بڑھ کر اپنی سرزمین کو آزاد کرنے کا عزم کریں گے تو یہ سوال بے معنی ہو جائے گا کہ چند درجن مسلمان اس تحریک کا ساتھ دیتے ہیں یا نہیں۔''

اس مؤقف کے حق میں بعض عجیب دلائل بھی دیے گئے:

> ''جب امریکہ نے آزادی کی جنگ لڑی تو اس کے بیشتر عوام برطانوی حکومت کے حامی تھے۔ آئرلینڈ کی آزادی کی تحریک کو کتنے آئرش عوام کی حمایت حاصل تھی؟ روس میں آج جو بالشویک حکومت برسرِ اقتدار ہے اسے تو ایک فیصد عوام کی حمایت بھی میسر نہیں۔''

تاریخ کو اپنی پسند کے مطابق نئے سانچے میں ڈھالا گیا۔ مثال کے طور پر سراج الدولہ، وہی مسلمان نواب جسے کلائیو نے شکست دی تھی، اس کی شبیہ کو مختلف رنگ دیے گئے۔ سیکولر قوم پرست مؤرخین نے سراج الدولہ کے منفی پہلو چھپا کر پلاسی کی جنگ کو برطانوی استعمار کے خلاف ایک قومی مزاحمتی جنگ بنا کر پیش کیا۔ مگر ہندو قوم پرست مؤرخین کے لیے یہ وہ لمحہ تھا جب ہندو قوم نے مسلم اقتدار کی غلامی سے نجات حاصل کی۔

جدو ناتھ سرکار The History of Bengal، جلد دوم، The Muslim Period 1200-1757 (ڈھاکہ، 1948) میں اس تبدیلی کا منظر یوں بیان کرتے ہیں:

> ''23 جون 1757 کو ہندوستان میں قرونِ وسطیٰ کا خاتمہ اور جدید دور کا آغاز ہوا۔ جب کلائیو نے نواب کو شکست دی، تو ملک کا نظم و نسق شدید بدعنوانی اور نااہلی کا شکار تھا۔ عوام غربت، جہالت اور اخلاقی زوال کی گہرائیوں میں ڈوبے ہوئے تھے۔ حکمران طبقہ خودغرض، متکبر اور بے بصیرت تھا، جبکہ تخت پر ایسے افراد براجمان تھے جو نالائق اور شہوت پرست تھے۔ درباری خواتین کی حالت اس سے بھی زیادہ ناگفتہ بہ تھی۔ سادیست ذہنیت کے حامل حکمران، جیسے سراج الدولہ اور میران، نے اپنے اعلیٰ درباریوں تک کو خوف کے حصار میں جکڑ رکھا تھا۔ فوج مکمل طور پر بوسیدہ ہو چکی تھی اور اس کے اندر غداری کی جڑیں مضبوط ہو چکی تھیں۔ دربار اور اشرافیہ کی رندانہ محفلوں اور عیاشانہ ادب نے خاندانی زندگی کے اخلاقی ڈھانچے کو کھوکھلا کر دیا تھا۔''

یوں یہ سلسلہ جاری رہا۔ اس انداز سے سخت اور تلخ لہجے میں لکھنے کے لیے مسلمانوں سے شدید نفرت کی ضرورت ہوتی ہے۔ جدو ناتھ سرکار نے یہ دعویٰ کیا کہ برطانوی دور میں ہندوستان نے معاشی بحالی کا سفر شروع کیا۔ اس کے برعکس جواہر لال نہرو سمیت بعض دیگر اہلِ قلم نے اس تصور کو چیلنج کیا۔ نہرو نے اپنی کتاب Discovery of India (کلکتہ، سگنیٹ، 1946) میں لکھا کہ پلاسی کی جنگ میں سراج الدولہ کا سپہ سالار ایک ہندو تھا۔ نہرو نے برطانوی محصولاتی پالیسیوں کو ''محض لوٹ مار'' اور ''کھلی غارت گری'' قرار دیا جن کے نتیجے میں 1770 کا وہ ہولناک قحط برپا ہوا

جس میں بنگال اور بہار کی ایک تہائی سے زائد آبادی لقمۂ اجل بن گئی۔ اس کے برخلاف، جدوناتھ سرکار کو اسی نقطۂ نظر کی پذیرائی کے صلے میں ''سر'' کا خطاب عطا ہوا۔

جیا چیٹرجی کی ایک اہم اور بصیرت افروز تصنیف

Bengal Divided: Hindu Communalism and Partition (1932–47)

کیمبرج یونیورسٹی پریس، 1996 اسی نوع کی تاریخ کو اس وقت کے سیاسی سیاق و سباق میں رکھ کر سمجھنے کی کوشش کرتی ہے۔

''نشاۃ ثانیہ کے بیان میں جدوناتھ سرکار نہ صرف برطانوی اقتدار کو سراہتے ہیں بلکہ ایک پیچیدہ تاریخی عمل کو حد درجہ سادہ اور یک رخی انداز میں پیش کرتے ہیں۔ ان کے بیانیے سے یہ تاثر ابھرتا ہے کہ مسلمانوں کا پورا دور (1200 سے 1757 تک) محض ظلم، بربریت اور خونریزی پر مشتمل تھا۔ جدید دور، جو تہذیب، روشنی اور فکری بیداری کا زمانہ تھا، اس میں مسلمانوں کے لیے کوئی جگہ نہ تھی۔ ان کے نزدیک جدید بنگال کی تعمیر کا سہرا ہندو 'بھدرلوک' طبقے کے سر تھا جنہوں نے اگرچہ کچھ روشنی انگریزوں سے مستعار لی، مگر بنگال کو ہندوستانی تہذیب کا مرکز بنانے میں بنیادی کردار ادا کیا۔ ان کے نزدیک بنگال کا اصل حق دار یہی طبقہ تھا۔ اس زاویۂ نگاہ سے نشاۃ ثانیہ محض ایک تہذیبی علامت نہ رہی بلکہ ایک خاص ہندو بنگال کی علامت میں ڈھل گئی جس میں مسلمانوں کے لیے کوئی جگہ نہیں چھوڑی گئی۔ اس تاریخی تعبیر سے مسلمان نہ صرف بنگالی قومیت کے دائرے سے باہر ہو گئے بلکہ وہ اس سرزمین کے کسی بھی قومی حق سے بھی محروم کر دیے گئے۔

انڈین نیشنل کانگریس کا قیام 1885 میں عمل میں آیا۔ کانگریس نے سیاسی مطالبات اور ضروریات کو ایک ایسے وسیع سیاسی پلیٹ فارم کے ذریعے منظم کرنے کی کوشش کی جو کسی ایک مخصوص قوم یا فرقے سے بالاتر ہو۔ راج کا ردعمل یہ تھا کہ اس کی توجہ بتدریج ان طبقات پر مرکوز ہونے لگی جن کا سیاسی شعور بیدا ہو چکی تھی اور وہ منظم ہو چکا تھا۔

اسی حکمت عملی کا ایک نتیجہ آل انڈیا مسلم لیگ کے قیام کی صورت میں سامنے آیا جو 30 دسمبر 1906 کو ڈھاکہ میں قائم ہوئی۔ اس کا واضح مقصد برطانوی تاج سے وفاداری کو فروغ دینا اور ہندوستان

کے مسلمانوں کے سیاسی حقوق اور مفادات کا دفاع کرنا تھا۔اس مقصد کے لیے علیحدہ انتخابی حلقوں کا مطالبہ کیا گیا۔مسلم لیگ کے پہلے صدر آغا خان نے برطانوی عہدیدار ڈنلوپ اسمتھ کو ایک خط میں لکھا کہ ''ایک نمایاں مسلمان شخصیت ہماری تمام کوششوں اور عزائم کے سخت مخالف کے طور پر سامنے آئی۔اس کا کہنا تھا کہ علیحدہ انتخابی حلقوں کا اصول قوم کو خود اپنے خلاف تقسیم کر رہا ہے۔'' یہ نمایاں مسلمان محمد علی جناح تھا جو اس وقت تیس برس کا ایک ابھرتا ہوا وکیل تھا۔

مسلم لیگ کی کوششوں کا 1909 کی مارلے منٹو اصلاحات کی شکل میں صلہ ملا جن میں مسلمانوں کے لیے علیحدہ انتخابی حلقے تسلیم کر لیے گئے۔ ہندو مسلم کشیدگی پہلے ہی 16 اکتوبر 1905 کو اس وقت بھڑک اٹھی تھی جب لارڈ کرزن نے بنگال کو تقسیم کر دیا جو اس وقت بہار اور اڑیسہ پر بھی مشتمل تھا۔ اس وقت اس خطے کی آبادی تقریباً 79 ملین تھی۔اگرچہ انتظامی نقطۂ نظر سے اس تقسیم کے حق میں ایک مضبوط دلیل موجود تھی لیکن مسلمانوں کے ساتھ ایک چالاکی کی گئی۔اعلیٰ سرکاری اہلکاروں نے انہیں باور کرایا کہ اب وہ ہندو غلبے سے آزاد ہو جائیں گے، کیونکہ مشرقی بنگال کے نئے صوبے میں ان کی اکثریت ہو گی۔اس نئے صوبے میں 1 کروڑ 80 لاکھ مسلمان اور 1 کروڑ 20 لاکھ ہندو تھے۔اس فیصلے کے خلاف ہندو سماج کے بااثر حلقوں میں شدید ردعمل پیدا ہوا۔ولولہ انگیز اور جذباتی خطابت کے زیر اثر یہ تحریک اتنی شدت اختیار کر گئی کہ کانگریس کے اندر بھی تقریباً تقسیم کی نوبت آ گئی۔اس تقسیم کی منصوبہ بندی کرنے والے لارڈ کرزن بے نیازی سے کہتا تھا کہ ''بنگالی لوگ شور مچاتے ہیں لیکن جب کوئی معاملہ طے ہو جائے تو اسے قبول کر لیتے ہیں۔'' لیکن اس بار بنگالیوں کے احتجاج کی شدت نے برطانوی حکومت کو جھنجھوڑ دیا اور 1911 میں بنگال کو دوبارہ متحد کر دیا گیا جس سے وفادار مسلم قیادت کے دلوں میں یہ سوال پیدا ہوا کہ ان کی وفاداری کا نتیجہ کیا نکلا؟

سر سید احمد خان جیسے مسلم رہنماؤں نے جو برطانوی اقتدار سے روابط کے پل تعمیر کیے تھے وہ اب کمزور پڑنے لگے۔1910 میں محمد علی جناح نے الہ آباد میں ایک اتحاد کانفرنس کا انعقاد کیا جس کے نتیجے میں مسلم لیگ نے کانگریس سے بڑھتے ہوئے تعاون کے حق میں ایک قرارداد منظور کی۔اس کے بعد کانگریس اور مسلم لیگ نے اپنے اجلاس ایک ہی شہر میں منعقد کرنے کا فیصلہ کیا تاکہ دونوں

جماعتوں کے رہنماؤں اور کارکنوں میں باہمی شراکت اور رابطہ ممکن ہو سکے۔ دسمبر 1916 میں لکھنؤ میں دونوں جماعتوں کے درمیان ایک تاریخی معاہدہ طے پایا۔ کانگریس نے مسلمانوں کے لیے علیحدہ انتخابی حلقوں کو تسلیم کیا اور بدلے میں مسلمانوں نے یہ حق ترک کر دیا کہ وہ دونوں، یعنی علیحدہ اور عمومی حلقوں میں بیک وقت ووٹ ڈال سکیں۔ یہ ایک انقلابی پیش رفت تھی جو ایک ایسے وقت پر واقع ہوئی جب دنیا (جیسا کہ وقتاً فوقتاً ہوتا ہے) ایک نئے دور میں داخل ہو رہی تھی۔

8 مئی 1901 کو سمندری ہاتھی جیسی گھنی مونچھوں والا ایک انگریز جو آسٹریلیا کی سونے کی کانوں سے پہلے ہی ایک خطیر دولت جمع کر چکا تھا اور جس کی توانائیاں اب تک ماند نہیں پڑی تھیں، ایران کے شاہ کے ساتھ ایک معاہدہ طے کرتا ہے۔ اس معاہدے کے تحت بیس ہزار پاؤنڈ نقد کے عوض اسے پوری ایرانی سلطنت میں قدرتی گیس، اسفالٹ اور تیل تلاش کرنے، نکالنے اور بیچنے کا خصوصی حق حاصل ہو گیا۔ یہ انگریز ولیم ناکس ڈارسی تھا جس نے یوں اس خطے کا پہلا تیل کا رعایتی معاہدہ کیا تھا۔

مگر 1904 تک یہ سرمایہ کاری ایک غلط فیصلہ ثابت ہونے لگی۔ ادھر برطانیہ میں فرسٹ سی لارڈ ایڈمرل سر جان فشر نے فیصلہ کیا کہ برطانوی بحریہ کے جہازوں کا ایندھن کوئلے کے بجائے تیل پر منتقل کیا جائے۔ اس وقت برطانیہ کے پاس تیل کے محض دو یقینی ذرائع تھے: بورنیو کا ایک چھوٹا سا تیل کا کنواں اور برما میں نسبتاً بڑے ذخائر۔ ایڈمرل فشر نے حکومت کو قائل کر لیا کہ تیل کو قومی دفاع کی اولین ترجیح قرار دے اور ڈارسی کے منصوبے میں مزید سرمایہ کاری کی جائے۔ حکومت نے برما آئل کمپنی سے کہا کہ وہ ڈارسی کی شراکت دار بن جائے۔

26 مئی 1908 کو طلوعِ فجر سے ذرا قبل مسجد سلیمان نامی ایک چھوٹے سے قصبے کے نزدیک ایک تیل نکالنے والی مشین (Drilling Rig) سے اچانک زمین میں حرکت محسوس ہوئی، جو اس بات کا اشارہ تھا کہ تیل کی بڑی مقدار دریافت ہونے والی ہے۔ ڈارسی نے موقع سے فائدہ اٹھاتے ہوئے برما آئل کمپنی کے نو لاکھ پاؤنڈ مالیت کے حصص کی نقدی وصول کر لی۔ 1911 اور 1913 میں برطانوی حکومت نے بحرین اور کویت سے یہ معاہدہ طے کر لیا کہ ان کی سرزمین پر کوئی نیا تیل کا

رعایتی معاہدہ برطانوی منظوری کے بغیر نہیں ہو سکے گا۔ 1914 تک جب جنگ کی آہٹ سنائی دینے لگی تھی، تو برطانوی حکومت نے برما آئل کمپنی کے 51 فیصد حصص خرید لیے تا کہ بحریہ کو تیل کی محفوظ اور مستقل فراہمی یقینی بنائی جا سکے۔ اب صحرا ایک سمندری طاقتوں کی دلچسپی کا مرکز بن گیا۔

ادھر سلطنت عثمانیہ اپنے زوال سے بے خبر نہیں تھی۔ خلافت اپنا بڑھاپا گزار کر آخری سانسیں لے رہی تھی۔ 1890 کی دہائی بغاوتوں سے سلگ رہی تھی۔ سلونیکا میں مصطفیٰ کمال سمیت کئی دیگر افراد نے 'کمیٹی آف یونین اینڈ پراگریس' قائم کی۔ جون 1908 میں انگریزوں اور روسیوں کے مابین طے پانے والے معاہدے سے ترک خارجہ پالیسی کو شدید دھچکہ لگا، کیونکہ عثمانی حکومت روایتی طور پر ان دونوں طاقتوں کو ایک دوسرے کے خلاف استعمال کرتی آئی تھی۔ جولائی میں ترک فوجی افسران نے بغاوت کرتے ہوئے پہاڑوں کا رخ کر لیا۔ سلطان عبدالحمید نے بے بسی کے عالم میں خزاں کے لیے اخبارات پر سنسر اور پارلیمنٹ کے انتخابات کا اعلان کیا مگر یہ تدبیر بھی اسے نہیں بچا سکی۔

1909 میں اینور، طلعت اور جمال پاشا پر مشتمل ایک سہ رکنی گروپ نے سلطان کو معزول کر دیا۔ 29 اپریل کی صبح دو بج کر پینتالیس منٹ پر سلطان عبدالحمید کو ایک ریل گاڑی کے ذریعے سلونیکا روانہ کر دیا گیا اور اس کے خاص خواجہ سرا کو گلاتا کے پل پر پھانسی دے دی گئی۔ سلطان کے بھائی رشاد جو شاعر بھی تھا اور ینگ ترک کا حامی تھا تخت پر بٹھا دیا گیا۔ نئی حکومت کے ایجنڈے میں عربوں کے ساتھ تعلقات بہتر بنانا سرفہرست تھا۔ یہاں تک کہ آسٹریا اور ہنگری کی مشترکہ سلطنت کے ماڈل کو مدنظر رکھتے ہوئے ترک اور عربوں کے درمیان مشترکہ بادشاہت کے تصور پر بھی غور کیا جانے لگا۔

عبدالحمید کے دور کے آخری فیصلوں میں سے ایک یہ بھی تھا کہ 1908 میں حسین ابن علی کو جو حضرت فاطمہؓ کی نسل سے تھے، مکہ کی امارت سونپ دی گئی۔ اس وقت عرب کے اندر نوجوان عبدالعزیز ابن سعود کی طرف سے ایک نئی تحریک اٹھ رہی تھی۔ یہ وہی خاندان تھا جس نے وہابی تحریک کو ایک مختصر مگر درخشاں دور عطا کیا تھا۔ حسین ابن علی کو اس بات کا علم نہیں تھا کہ ابن سعود کے برطانوی حکومت سے روابط قائم ہو چکے ہیں۔ اس رابطے کا ذریعہ ولیم ہنری اروائن شیکسپیئر ( William Henry Irvine Shakespear) تھا جو برٹش بنگال لانسرز کا سابق افسر تھا (اس کے نام کے

آخر میں 'e' نہیں تھا)۔ ابن سعود شیکسپیئر کو ان چند یورپیوں میں سب سے عظیم قرار دیتا تھا جن سے اس کا واسطہ پڑا تھا اگرچہ اس کا دائرۂ تعلق محدود ہی تھا۔ لندن میں اس دوستی پر ابتدائی ردعمل سرد مہری کا تھا لیکن 1914 میں شیکسپیئر کے لیے حالات سازگار ہو گئے۔

جب ترکی نے آسٹریا، ہنگری اور جرمنی کے ساتھ مل کر برطانیہ، فرانس اور روس کے خلاف جنگ میں شمولیت اختیار کی تو جنوری 1915 میں شیکسپیئر نے ابن سعود کو نجد کا خودمختار حکمران تسلیم کرتے ہوئے برطانوی سرپرستی پیش کر دی۔ یوں وہابی پرچم یونین جیک کے سائے میں لہرانے لگا۔ پہلی مشترکہ مہم میں شیکسپیئر مارا گیا۔ یہ مہم ناکام رہی مگر ابن سعود نے اپنی جدوجہد جاری رکھی۔ جون 1916 میں برطانوی حکومت نے اسے ایک ہزار موزر رائفلیں، دو لاکھ راؤنڈ گولہ بارود اور بیس ہزار پاؤنڈ قرض دینے کی منظوری دے دی۔

1918 تک ترکوں کا جہاد انجام کو پہنچ چکا تھا۔ ہندوستان کے مسلمان جو پہلی جنگ عظیم کے آغاز ہی سے مضطرب تھے، اب دنیا میں اسلام کی عسکری قوت کے زوال پر سخت دل گرفتہ ہو چکے تھے۔ وہ کچھ کرنا چاہتے تھے اگرچہ یہ واضح نہیں تھا کہ کیا کریں۔ 6 ستمبر 1916 کو لارڈ چیمسفورڈ کو خط لکھتے ہوئے اس وقت کے سکریٹری آف اسٹیٹ برائے ہند، آسٹن چیمبرلین نے لکھا کہ شاید مسلمانوں ہی کی وہ واحد برادری ہے جو برطانوی پرچم تلے کسی غیر ملکی بادشاہ کے لیے باقاعدگی سے دعا کرتی ہے اور اپنے بادشاہ کے لیے نہیں۔ وہ غیر ملکی بادشاہ خلافت عثمانیہ کا خلیفہ تھا۔

برطانوی حکومت نے خلافت اور عثمانی حکومت کے درمیان فرق واضح کرنے کی کوشش کی اور مسلمانوں کو یہ یقین دہانی کرائی کہ مکہ اور مدینہ پر کبھی حملہ نہیں ہوگا اور حج کے سفر میں کوئی رکاوٹ پیش نہیں آئے گی، تاکہ عالم اسلام میں پیدا ہونے والے وحدت اسلامی جذبات کو کسی حد تک ٹھنڈا کیا جا سکے۔ لیکن یہ تسلیاں بے اثر ثابت ہوئیں۔ مسلمان ابھی تک اپنے مقدس مقامات پر مسیحی تسلط کے خلاف کسی مؤثر ردعمل کی تلاش میں تھے کہ عین اسی وقت موہن داس کرم چند گاندھی ان کی سیاسی زندگی میں وارد ہو گئے۔

گاندھی کو فقیری میں رکھنا ہمیشہ ایک دشوار کام رہا۔ بعد میں جیسا کہ سروجنی نائیڈو نے شوخی سے کہا، یہ

کام مہنگا بھی ہو گیا۔ 18 جولائی 1914 کو جب وہ کیپ ٹاؤن سے لندن کے لیے تیسرے درجے کے ٹکٹ پر روانہ ہوئے تو کمپنی نے انہیں خصوصی مہمان کا درجہ دیا۔ البتہ گاندھی کو صرف ایک رعایت درکار تھی کہ ان کے لیے خشک میوہ جات اور پھلوں کی خوراک کا بندوبست کیا جائے۔ اب وہ صرف سبزی خور نہ رہے تھے بلکہ 'نٹریئن' (nutarian) بن چکے تھے۔

گاندھی نے ہندوستان واپسی کا راستہ کچھ طویل اس لیے اختیار کیا کہ یورپ میں زیر علاج اپنے استاد گوپال کرشن گوکھلے کی عیادت کر سکیں۔ وہ ابھی انگلستان پہنچنے سے دو روز کی مسافت پر تھے کہ 4 اگست کو جنگ چھڑ گئی۔ لندن میں موجود ہندوستانی معززین نے جنوبی افریقہ کی جدوجہد کے اس ہیرو کا پرتپاک خیر مقدم کیا۔ 8 اگست کو سیسل ہوٹل میں ان کے اعزاز میں ایک تقریب منعقد ہوئی جس میں سب سے نمایاں شخصیت گجراتی وکیل اور سیاست دان محمد علی جناح کی تھی۔ کچھ ممتاز شخصیات نے ''ناگزیر مصروفیات'' کے باعث شرکت سے معذرت کی جن میں لارڈ کرزن، کیئر ہارڈی، ریمزے میکڈونلڈ اور لارڈ کروز، سکریٹری آف اسٹیٹ برائے ہند شامل تھے۔

جناح نے گاندھی کی بے حد تعریف کی۔ جواب میں گاندھی نے ہندوستانی قیادت کو نصیحت کی کہ ''لفظ کے بہترین مفہوم میں سلطنتی طرز فکر اختیار کریں اور اپنے فرائض انجام دیں۔'' انہوں نے پیشکش کی کہ یورپی محاذ پر ہندوستانیوں پر مشتمل ایک طبی امدادی یونٹ منظم کریں گے۔

لارڈ کروز نے اس پیشکش پر شک کا اظہار کیا اور شاید یہ شک بجا تھا۔ یہ طبی یونٹ ابھی فرانس کے میدان جنگ تک پہنچی بھی نہ تھی کہ برطانوی حکومت سے اس کے اختلافات شروع ہو گئے۔ گاندھی نے اس بات پر سخت اعتراض کیا کہ برطانوی حکام نے محض طالب علم ہونے کی بنیاد پر نوجوان انگریزوں کو ہندوستانی طبی رضا کاروں کا افسر مقرر کر دیا تھا، حالانکہ یہ ہندوستانی رضا کار عمر، تجربے اور قابلیت میں ان سے کہیں برتر تھے۔ گاندھی نے بارہا خطوط لکھ کر اس فیصلے کے خلاف آواز بلند کی اور آخر کار اس معاملے پر باقاعدہ ایک کانفرنس بھی منعقد ہوئی تاکہ کسی سمجھوتے پر پہنچا جا سکے۔ ان مسلسل مذاکرات کے بعد کسی حد تک مفاہمت ممکن ہوئی، مگر اسی دوران خزاں کی سرد اور مرطوب فضا میں طویل مشقوں کے باعث گاندھی کو پھیپھڑوں کی شدید سوجن (پلورسی) ہو گئی، جس نے ان کی

صحت کو خاصا متاثر کیا۔ حکومت اس بات کے لیے تیار نہیں تھی کہ کوئی ایسا ناخوشگوار واقعہ پیش آئے، خاص طور پر جب گاندھی اپنے معالج جیوراج مہتا کے مشورے کے باوجود بہتر غذا لینے پر آمادہ نہیں تھے۔ ان دنوں ان کی خوراک میں صرف مونگ پھلی، کیلے (پکے اور کچے)، لیموں، ٹماٹر، انگور اور بطور ذائقہ زیتون کا تیل شامل تھا۔ حکومت نے اصرار کیا کہ وہ واپس ہندوستان چلے جائیں۔ اگر صحت یابی تک جنگ جاری رہی تو سلطنت ان کی خدمات کے لیے اور بھی راستے نکال لے گی۔

گوکھلے نے واپسی سے پہلے گاندھی کو نہایت صاف اور سخت مشورہ دیا کہ ''ہندوستان پہنچ کر کم از کم ایک سال تک آنکھیں کھلی رکھو اور منہ بند۔'' 19 دسمبر کو گاندھی بمبئی کے لیے روانہ ہوئے اور اس بار دوسرے درجے میں سفر کیا۔ ان کا جہاز 9 جنوری 1915 کو اپالو بندرگاہ پر لنگر انداز ہوا۔ یہ اعزاز صرف شاہی خاندان کے افراد، وائسرائے یا ملک کے مشہور ترین فرزندوں کو حاصل تھا۔

ہندوستان پہنچ کر گاندھی کا پہلا اہم قدم اپنا لباس تبدیل کرنا تھا۔ انہوں نے کھادی کی دھوتی، کاٹھیاواڑی قمیص اور ہندوستانی ملوں کی تیار کردہ پگڑی پہن لی۔ مہاتما بنانے میں لباس کا بھی رول ہوتا ہے۔

دوسرا نمایاں واقعہ محمد علی جناح کو ناراض کرنا تھا۔ لندن کی طرح اس بار بھی گجراتی تاجروں نے گاندھی کے استقبال کے لیے جناح کو خطبۂ استقبالیہ پیش کرنے کے لیے منتخب کیا۔ جناح نے پر جوش تقریر شروع ہی کی تھی کہ گاندھی نے بیچ میں روک کر کہا کہ ''جب یہاں سب لوگ گجراتی ہیں تو جناح صاحب انگریزی میں کیوں بول رہے ہیں؟'' بتیس برس بعد اسی جناح نے ایک ایسی قوم کی بنیاد رکھی جس کی سرکاری زبان اردو تھی حالانکہ وہ خود اردو کا ایک لفظ بھی نہیں جانتے تھے۔

3 جون 1915 کو شاہ برطانیہ کی سالگرہ کے موقع پر دو ہندوستانیوں کو اعزازات سے نوازا گیا۔ رابندرناتھ ٹیگور کو نائٹ ہڈ دیا گیا اور گاندھی کو قیصر ہند میڈل عطا ہوا۔ اسی سال دسمبر میں گاندھی نے کانگریس کے لکھنؤ اجلاس میں شرکت کی جہاں محمد علی جناح اسٹیج پر سب سے نمایاں شخصیت تھے۔ اسی اجلاس میں بہار کے ضلع چمپارن سے ایک کانگریس کارکن راج کمار شکلا نے گاندھی سے اصرار کیا کہ وہ ان کے ساتھ چمپارن چلیں تاکہ وہاں نیل (نیلا رنگ جو پودوں سے حاصل ہوتا تھا اور

کپڑے رنگنے کے لیے استعمال ہوتا تھا) کے کاشتکاروں پر ہونے والے ظلم وستم کا ازالہ کیا جا سکے۔ گاندھی جنہوں نے نہ کبھی چمپارن کا نام سنا تھا اور نہ ہی نیل کی کاشت کے مسائل سے واقف تھے، شکلا کی مسلسل درخواست سے اتنے متاثر ہوئے کہ چند دن کے لیے چمپارن جانے پر آمادہ ہو گئے۔

9 اپریل 1917 کی صبح وہ کلکتہ سے ریل کے ذریعے پٹنہ پہنچے۔ سب سے پہلے معروف وکیل راجندر پرساد کے گھر گئے مگر میزبان ان کے آنے سے بے خبر اور تعطیلات پر ساحل سمندر کی سیر کو نکلے ہوئے تھے۔ ایک ملازم نے پہلے شکلا کو دیکھا، پھر گاندھی پر ایک نظر ڈالی اور دونوں کو دروازے سے ہی واپس کر دیا۔ گاندھی کو اپنے لندن کے زمانۂ طالب علمی کے ایک دوست مظہر الحق یاد آ گئے جو ان دنوں پٹنہ ہی میں مقیم تھے۔ مظہر الحق نے گاندھی کو خوش دلی سے اپنے ہاں ٹھہرایا۔

چمپارن پہنچ کر گاندھی نے نیل کے مزدوروں کی حالت زار کے بارے میں تحقیق کا آغاز کیا۔ مگر 13 اپریل کو انہیں ضلع چھوڑنے کا حکم دے دیا گیا۔ گاندھی نے انکار کر دیا۔ 16 اپریل کی صبح جب مغرب کی طرف سے تیز گرد آلود ہوا چل رہی تھی، گاندھی ایک ہاتھی پر سوار ہو کر چمپارن روانہ ہوئے۔ دوپہر کے وقت ایک پولیس سب انسپکٹر انہیں لینے آ پہنچا۔ گاندھی بیل گاڑی میں بیٹھ کر موتیہاری روانہ ہو گئے۔ راستے میں انہیں باضابطہ حکم نامہ دیا گیا کہ وہ فوراً ضلع چھوڑ دیں۔ گاندھی نے حکم ماننے سے انکار کر دیا۔ ان کو تعزیرات ہند کی دفعہ 188 کے تحت گرفتاری کی دھمکی دی گئی۔

18 اپریل کو جب مقدمہ چلا تو ہزاروں کسان ضلع مجسٹریٹ کی عدالت کے باہر جمع ہو گئے۔ بھیڑ کے دباؤ سے کھڑکیاں اور دروازے ٹوٹ گئے۔ بھیڑ کو کنٹرول کرنے کے لیے مسلح پولیس طلب کرنا پڑی۔ سرکاری وکیل نے مقدمہ مؤخر کرنے کی درخواست کی۔ گاندھی نے مداخلت کرتے ہوئے پوچھا: کیوں؟ اور کہا کہ وہ اپنا جرم تسلیم کرتے ہیں۔

گاندھی نے کہا:

> ''ایک قانون پسند شہری ہونے کے ناتے میری پہلی جبلت یہی ہے کہ سرکاری حکم کی تعمیل کروں، لیکن اگر میں ایسا کرتا تو ان لوگوں کے ساتھ اپنی اخلاقی ذمے داری سے انکار کر بیٹھتا جن کے لیے میں یہاں آیا ہوں۔ میں نے حکم عدولی کسی غیر قانونی

مقصد سے نہیں کی بلکہ اپنے ضمیر کی آواز پر عمل کیا۔''

مجسٹریٹ معاملے کو رفع دفع کرنا چاہتا تھا اور گاندھی کو کسی طرح چھوڑنے کا راستہ تلاش کر رہا تھا، لیکن گاندھی سزا پانے کے لیے پرعزم تھے۔ انہوں نے کہا کہ ''میں عدالت کا وقت ضائع نہیں کرنا چاہتا اور اپنا جرم تسلیم کرتا ہوں۔''

مجسٹریٹ نے نرمی سے کہا کہ ''ضلع چھوڑ دیجیے اور دوبارہ واپس نہ آیئے تو مقدمہ واپس لے لیا جائے گا۔'' گاندھی نے جواب دیا کہ ''میں سزا پوری کرنے کے بعد چمپارن ہی کو اپنا مسکن بناؤں گا۔''

مجسٹریٹ تذبذب میں پڑ گیا۔ فیصلہ سہ پہر تین بجے سنانے کا اعلان کیا مگر وقت مقررہ پر فیصلہ ایک بار پھر مؤخر کر دیا۔ 20 اپریل کو مجسٹریٹ نے گاندھی کو اطلاع دی کہ صوبے کے لیفٹیننٹ گورنر نے مقدمہ واپس لینے کا حکم دے دیا ہے۔

گاندھی نے اس جدوجہد میں بازی پلٹ دی تھی اور حکومت پسپا ہو گئی تھی۔ آئندہ تین دہائیوں کے لیے ایک نیا راستہ متعین ہو چکا تھا۔ گاندھی نے پہلی بار وہ ہتھیار دنیا کے سامنے پیش کیے جن کے ذریعے وہ برطانوی سلطنت سے نبرد آزما ہونے والے تھے: بے خوف اور متعدی (یعنی دوسروں تک منتقل ہونے والی) جرأت، ایک اٹل اور بے لوث ضمیر اور عدم تشدد۔ ان کا کہنا تھا کہ چمپارن میں انہوں نے ایسا ہتھیار تیار کر لیا ہے ''جس کے ذریعے ہندوستان کو آزاد کرایا جا سکتا ہے۔''

6 فروری 1919 کو حکومتِ ہند نے جسٹس رولٹ کی صدارت میں قائم کمیٹی کی سفارشات پر عمل کرتے ہوئے امپیریل لیجسلیٹو کونسل میں دو بل پیش کیے۔ ان میں دوسرا قانون ''انارکیکل اینڈ ریولوشنری کرائمز ایکٹ 1919 (Anarchical and Revolutionary Crimes Act of 1919) تھا، جس کے تحت خصوصی عدالتیں قائم کی گئیں تا کہ بغیر اپیل کے حق کے فوری مقدمے چلائے جائیں اور ایسے شواہد بھی قبول کیے جائیں جو اب تک ''انڈین ایویڈنس ایکٹ'' کے تحت نا قابلِ قبول تھے۔ 18 مارچ 1919 کو یہ قانون نافذ کر دیا گیا۔ گاندھی نے اس کے

خلاف سول نافرمانی کی مہم کا اعلان کیا اور 6 اپریل کو پورے ہندوستان میں ایک روزہ ہڑتال کا فیصلہ کیا۔ یہ نیا ہتھیار ''ہڑتال'' کہلایا، ہندی کا ایک لفظ جواب انگریزی لغت میں بھی شامل ہو چکا ہے۔

پنجاب کے لیفٹیننٹ گورنر سر مائیکل او ڈائر اس بات پر مصر تھے کہ عوام ''کانگریسی ذہنیت'' نہ اپنا لیں۔ 10 اپریل کو انہوں نے ''ڈیفنس آف انڈیا ایکٹ'' کے تحت دو مقامی رہنماؤں، ایک ہندو (ستیا پال) اور ایک مسلمان (ڈاکٹر سیف الدین کچلو) کو نظر بند کرنے کا حکم دے دیا۔ اس اقدام کے خلاف امرتسر میں ایک احتجاجی جلوس نکلا جسے ریلوے کراسنگ پر روک دیا گیا۔ پولیس نے مظاہرین پر فائرنگ کر دی اور کئی پنجابی مارے گئے۔ اس کے جواب میں عوامی غصہ بھڑک اٹھا۔ بینک کے چھ انگریز افسران کے دفتروں میں قتل کر دیے گئے، عمارتوں کو آگ لگا دی گئی اور ٹیلیگراف کے تار کاٹ دیے گئے۔ 11 اپریل کو مرنے والے انگریز افسروں کی آخری رسومات خاموشی سے ادا کی گئیں۔ اسی شام بریگیڈیئر جنرل آر ایچ ڈائر شہر پہنچا۔

اگلے دن گرفتاریوں کا آغاز ہوا اور تمام عوامی اجتماعات پر پابندی لگا دی گئی۔ 12 اپریل کو چند سرگرم کارکنوں نے اعلان کیا کہ سہ پہر ساڑھے چار بجے ''جلیانوالہ باغ'' میں عوامی جلسہ ہوگا۔ یہ باغ تقریباً ٹرافلگر اسکوائر جتنا بڑا تھا اور چاروں طرف سے تقریباً دیواروں سے گھرا ہوا تھا۔

دلچسپ بات یہ تھی کہ اسی مقام پر میلہ بھی لگا ہوا تھا اور وہاں غیر سیاسی خاندان بھی موجود تھے۔ حکومت نے نہ جلسہ روکنے کی کوشش کی اور نہ کوئی پیشگی وارننگ دی۔ جب جلسہ شروع ہو چکا تو بریگیڈیئر جنرل ڈائر اپنے دستے کے ہمراہ وہاں پہنچا۔ اس نے بغیر کوئی انتباہ دیے سپاہیوں کو حکم دیا کہ سو گز کے فاصلے سے براہ راست ہجوم پر گولیاں چلائیں۔ یہ فائرنگ اس وقت تک جاری رہی جب تک تمام گولیاں ختم نہ ہو گئیں۔ دس منٹ کے اندر 1650 گولیاں چلائی گئیں۔ 379 مرد و خواتین موقع پر جاں بحق ہوئے اور مزید دو سو شدید زخمی ہو گئے۔ بریگیڈیئر جنرل ڈائر نے بعد میں کہا کہ اس نے اپنا فرض پورا کر دیا۔ فائرنگ کے بعد وہ اپنے سپاہیوں کو اسی راستے سے واپس لے گیا۔ 15 اپریل کو حکومت نے پورے پنجاب میں سنسر شپ اور مارشل لا نافذ کر دیا۔

گاندھی پنجاب کے واقعات کی تفصیلات سے ناواقف تھے مگر تشدد کے بڑھتے ہوئے رجحان سے فکر مند تھے۔ انہوں نے رولٹ بل کے خلاف اپنی تحریک معطل کر دی۔ انہیں پنجاب جانے کی اجازت نہیں ملی مگر وہاں کے حالات کی کہانیاں رفتہ رفتہ سنائی دینے لگیں۔ 30 مئی کو رابندر ناتھ ٹیگور نے احتجاج کے طور پر اپنا نائٹ ہڈ لقب واپس کر دیا اور جلیانوالہ باغ کے سانحے کو ''مہذب حکومتوں کی تاریخ میں ایک ایسی بربریت قرار دیا جس کی کوئی مثال نہیں، چند گنتی کے شاذونادر ماضی وحالیہ واقعات کے سوا۔''

1919 کا سال نوخیز قومی تحریک کے لیے ایک فیصلہ کن موڑ ثابت ہوا جب مختلف وجوہات کی بنا پر ہندوؤں اور مسلمانوں کے درمیان ایک مشترکہ مقصد نے جنم لیا۔ خود گاندھی بھی اس سے زیادہ کی توقع نہیں کر سکتے تھے۔ مسلمان اس بات پر سخت برہم تھے کہ تاریخ میں پہلی بار ان کے مقدس مقامات ایک عیسائی حکومت کے قبضے میں چلے گئے تھے۔

24 نومبر 1919 کو آل انڈیا خلافت کانفرنس دہلی میں منعقد ہوئی۔ بظاہر اس اجلاس کا مقصد برطانوی ''جشن فتح'' پر غور کرنا تھا جو پہلی جنگ عظیم کے خاتمے پر منایا جا رہا تھا مگر یہ کانفرنس ہندو مسلم اتحاد کی ایک انوکھی مثال بن گئی۔ گاندھی نے اس کانفرنس کی صدارت کی اور اردو میں خطاب کیا۔ ان کے ابتدائی جملے ہی فضا کا خلاصہ تھے:

''اس بات پر کسی کو حیرانی نہیں ہونی چاہیے کہ ایک ایسے معاملے میں ہندو مسلمان بھائیوں کے ساتھ ایک ہی اسٹیج پر موجود ہیں جو خاص طور پر مسلمانوں سے متعلق ہے۔ آخر دوستی کا اصل معیار یہی ہے کہ مشکل وقت میں ایک دوسرے کا ساتھ دیا جائے۔ اور ہم سب چاہے ہندو ہوں، پارسی، عیسائی یا یہودی، اگر ایک قوم کی حیثیت سے جینا چاہتے ہیں تو پھر ہم میں سے کسی کے بھی مفاد کو ہم سب کا مفاد سمجھنا چاہیے... ہم ہندو مسلم اتحاد کی بات کرتے ہیں مگر یہ محض ایک کھوکھلا نعرہ رہ جائے گا اگر ہندو اس وقت مسلمانوں کا ساتھ نہ دیں جب ان کے بنیادی مفادات داؤ پر لگے ہوں۔''

جواب میں پرجوش مسلم رہنماؤں نے اعلان کیا کہ وہ گائے کا گوشت ترک کر دیں گے (گائے کا

ذبیحہ اس وقت ہندو اکثریتی ملک میں ایک نہایت حساس مسئلہ تھا) مگر گاندھی نے واضح کر دیا کہ ہندوؤں کا تعاون غیر مشروط ہوگا۔

انہوں نے کہا: ''مشروط تعاون اس ملاوٹ شدہ سیمنٹ کی مانند ہے جو دیوار کو باندھ نہیں سکتا۔''

مسلم حلقوں میں سخت موقف کے لیے معروف مولانا عبدالباری نے کہا کہ ''مسلمانوں کی غیرت کا تقاضہ ہے کہ وہ ہندوؤں کی اس قربانی کو نہ بھولیں۔ میری رائے یہ ہے کہ ہم ہندوؤں کے تعاون کے بغیر بھی گائے کا ذبیحہ ترک کر دیں کیونکہ ہم اسی سرزمین کے فرزند ہیں۔''

اسی دوران جوش وولولہ کے ساتھ مولانا حسرت موہانی نے گاندھی سے پرزور مطالبہ کیا کہ ''ہمارے لیے کوئی ایسا انقلابی قدم اٹھائیں، کوئی فوری اور تیز تر تدبیر کہ ہم جلد از جلد انگریزوں سے نجات پا سکیں۔''

گاندھی اس موقع پر اردو یا ہندی میں اس ''فوری اور تیز تر'' تصور کے لیے کوئی مناسب لفظ نہ ڈھونڈ سکے اور بالآخر انگریزی کا سہارا لیا:

''نان کوآپریشن'' (ترک موالات)

جنوری 1920 میں ہندو اور مسلمان رہنماؤں کے ایک بااثر وفد نے لارڈ چیمسفورڈ سے ملاقات کی۔ وائسرائے نے ان ''باغیوں'' کے ساتھ خوش اخلاقی برتی اور لندن کے سفر کے لیے مالی اعانت کی پیشکش کر دی۔ مولانا محمد علی جنہیں کبھی بھی کسی غیر ملکی سفر سے پرہیز نہیں تھا اس اہم ذمے داری کو قبول کرتے ہوئے لندن روانہ ہو گئے۔ 17 مارچ کو لائیڈ جارج نے علی برادران کے وفد کی تمام خوش فہمیوں کا پردہ فاش کر دیا۔ ترکی سے اس کی سلطنت چھین لی جائے گی اور یورپی فاتحین مقدس مقامات کے نگہبان ہوں گے۔ ہندوستان میں اس کی بازگشت فوراً سنائی دینے لگی۔ 19 مارچ کو یوم سوگ منانے کا اعلان کیا گیا۔

''روح بیچنے والی وفاداری کی کوئی قیمت نہیں ہوتی۔'' (A loyalty that sells its soul is worth nothing)

یہ وہ نو الفاظ تھے جو گاندھی نے 19 مارچ 1920 کو بمبئی میں خلافت کمیٹی کے اجلاس میں پیش کردہ قرارداد میں کہے۔ ہندوستانی اب اپنی روح برطانیہ کے ہاتھوں بیچنے کو تیار نہ تھے۔ گاندھی نے عدم تشدد پر اصرار کیا مگر فیاضی سے یہ بھی کہہ دیا کہ اگر عدم تشدد ناکام ہو جائے تو وہ مسلمانوں کی جانب سے کسی پر تشدد جہاد کی راہ میں رکاوٹ نہیں بنیں گے۔

یہ شاید وقتی طور پر مسلمانوں کی حمایت حاصل کرنے کی ایک کوشش تھی، مگر بمبئی کی اس تقریر میں کئی ایسے اشارے پوشیدہ تھے جن سے خود گاندھی بھی بے خبر تھے۔ مسلمانوں کے لیے عدم تشدد کے فلسفے کو سمجھنا آسان نہیں تھا، کیونکہ اس سے پہلے کبھی ایسا نہیں ہوا تھا کہ مقدس مقامات کی آزادی کے لیے کوئی غیر مسلح جہاد کیا گیا ہو۔ تاہم، مسلمانوں نے پورے جوش و خلوص سے گاندھی کی حکمت عملی کی حمایت کی۔

یکم اگست 1920 کو گاندھی نے 'قیصر ہند' کا طلائی تمغہ احتجاجاً واپس کر دیا۔ یہ فیصلہ انہوں نے ''نہایت درد کے ساتھ'' کیا، ان مظالم کے خلاف جو ''میرے مسلمان ہم وطنوں'' پر ڈھائے جا رہے تھے۔ 10 اگست کو معاہدۂ سیورریس پر دستخط ہوئے۔ آبنائے بین الاقوامی کمیشن کے سپرد کر دی گئیں، مشرقی اناطولیہ کو آرمینیا اور کردستان میں تقسیم کر دیا گیا، اور یونان کو ازمیر اور مشرقی تھریس کا علاقہ دے دیا گیا۔ خلیفہ نے اسے ترکی کے لیے ''موت کا پروانہ'' قرار دیا۔ ہندوستانی مسلمان اس دکھ میں برابر کے شریک تھے۔

کانگریس نے 4 سے 9 ستمبر کے درمیان کلکتہ کے خصوصی اجلاس میں گاندھی کے پروگرام کی محض 144 کے مقابلے میں 132 ووٹوں سے منظوری دی تھی جو یہ ظاہر کرتا تھا کہ ہندو اکثریت میں خلافت کے نام پر تحریکِ آزادی چلانے کے بارے میں تذبذب بڑھ رہا تھا۔ قرارداد پیش کرتے ہوئے گاندھی نے کہا کہ وہ نہ کوئی سنت ہیں نہ آمر بلکہ ایک عملی سیاست دان ہیں۔ اس اجلاس میں شریک تمام مسلمان رہنماؤں نے گاندھی کی حمایت کی۔ صرف ایک مسلمان محمد علی جناح نے مخالفت کی۔ ان کا اعتراض یہ تھا کہ سیاست اور مذہب کو یکجا کرنا درست نہیں۔

رابندر ناتھ ٹیگور اس ہمہ گیر تحریک ترک موالات کی طاقت کے بارے میں شکوک و شبہات رکھتے

تھے مگر عوام گویا کسی خواب میں تھے اور برطانوی راج کے خلاف اٹھ کھڑے ہوئے۔ دیہاتی کسانوں کو یقین تھا کہ ''گاندھی راج'' محض ایک سال میں ''برٹش راج'' کی جگہ لینے والا ہے۔ اپنی محرومیوں اور مصیبتوں کے خلاف ان کا غصہ مختلف صورتوں میں ظاہر ہوا۔ کئی علاقوں میں کسانوں نے زمینداروں کو کرایہ دینا بند کر دیا کیونکہ ان کے خیال میں ''گاندھی راج'' میں زمین کا کرایہ دینا مناسب نہیں تھا۔

مہاتما نے ایسی ''انحرافی'' حرکتوں کی حوصلہ شکنی کی، مگر ان کے کچھ سوشلسٹ شاگرد اس اقتصادی بے چینی کے ایسے اظہار کو برا نہیں سمجھتے تھے۔ یقیناً ہر کوئی اس طریقے سے متفق نہیں تھا کہ صرف چرخہ کاتنے اور گاندھی کے بننے سے ہی ہندوستان آزاد ہو جائے گا۔

کیرالا میں 1916 سے کرایہ داروں کے حقوق کی ایک تحریک جاری تھی۔ یہ تحریک زیادہ تر مسلم کمیونٹی 'موپلا' کے بے چین نوجوانوں کی قیادت میں ہندو زمینداروں کے خلاف اٹھی تھی۔ بعض خلافت حامی رہنماؤں نے جو کسی پرتشدد جہاد کے موقع کی تلاش میں تھے، اس تحریک کو مذہبی رنگ دے دیا۔ انہوں نے اعلان کر دیا کہ اس تحریک کی کامیابی کی صورت میں ایک شاندار مسلم ریاست قائم کی جائے گی۔ 29 اگست 1921 کو پولیس نے تیرورنگاڈی کی ایک مسجد پر اسلحہ کی تلاشی کے لیے چھاپہ مارا، جس کے ردعمل میں بغاوت بھڑک اٹھی۔ پولیس اسٹیشنوں، سرکاری دفاتر اور زمینداروں کے گھروں پر حملے کیے گئے۔ بعض مسلمانوں نے ''خلافت ری پبلک'' قائم کرنے کا اعلان بھی کر دیا۔ وائسرائے لارڈ ریڈنگ نے لندن کو اطلاع دی کہ یہ صورت حال کھلی جنگ میں بدل چکی ہے۔ تاہم یہ جنگ انگریزوں کے بجائے زیادہ تر ہندوؤں کے خلاف ہو گئی۔ سینکڑوں ہندو قتل کر دیے گئے اور کئی کو زبردستی مسلمان بنا دیا گیا۔ حکومت نے اس بغاوت کو بے رحمی سے کچل دیا۔ 2337 باغی ہلاک اور 45404 گرفتار ہوئے۔ 20 نومبر کو ایک اور اندوہناک واقعے میں 66 موپلا قیدی ایک ریل گاڑی کے ڈبے میں دم گھٹنے سے جاں بحق ہو گئے۔

ادھر 8 فروری 1922 کے اخبارات میں ایک اور سنسنی خیز خبر چھپی۔ 5 فروری کو متحدہ صوبہ جات (یو پی) کے ضلع گورکھپور کے گاؤں چوری چورا میں ایک احتجاجی جلوس نکالا گیا۔ ڈیوٹی پر موجود کانسٹیبلوں

نے مظاہرین کو طعن و تشنیع کا نشانہ بنایا اور جلوس کے رہنما بھگوان اہیر کو بری طرح مارا پیٹا۔ جب پولیس نے مظاہرین پر گولیاں چلائیں تو مشتعل ہجوم نے پولیس اسٹیشن کو آگ لگا دی، جس میں 22 کانسٹیبل زندہ جل کر ہلاک ہو گئے۔

گاندھی نے ملک بھر میں تحریک کو فوراً معطل کر دیا۔ انہوں نے کہا کہ ''شیطان قابض ہو چکا ہے۔'' جواہر لال نہرو اور دیگر کانگریسی رہنما جو اس وقت جیل میں تھے اور جن کا ''شیطان'' سے کوئی واسطہ نہیں تھا اس اعلان پر حیران رہ گئے۔ بعد میں گاندھی نے اس فیصلے کی جو وضاحتیں پیش کیں وہ اگرچہ مکمل طور پر غیر منطقی نہ تھیں، مگر تشفی بخش بھی نہیں تھیں۔ برطانوی حکومت جواب تک گاندھی کو گرفتار کرنے کی جرأت نہیں کر رہی تھی، 10 مارچ کو انہیں گرفتار کر کے چھ سال قید کی سزا دے دی۔

یوں اچانک جیسے کوئی روشنی گل کر دی گئی ہو، پورا ہندوستان خاموشی میں ڈوب گیا۔ گاندھی کی گرفتاری پر کوئی آواز بلند نہ ہوئی۔ ہندو مسلم اتحاد کی ایسی مثال جو کسی ایک مقصد کے تحت قائم ہوئی تھی، پھر کبھی نہیں دیکھی گئی۔ اس کے بعد دونوں قومیں الگ الگ راستوں پر چلنے لگیں۔ تقریباً پندرہ برس بعد مسلمانوں نے اسی لیڈر کو دوبارہ دریافت کیا جسے وہ گاندھی کے زیر اثر رد کر چکے تھے... محمد علی جناح۔

13

# اسلام خطرے میں

''مسلم لیگ نے آپ کے سامنے ایک ہدف رکھا ہے جو میری دانست میں آپ کو اس سرزمین موعود تک لے جائے گا جہاں ہم اپنا پاکستان قائم کریں گے۔ لوگ کچھ بھی کہیں اور جو چاہیں بولیں، آخر میں ہنستا وہی ہے جو سب سے آخر میں ہنستا ہے۔''

[جناح کا خطاب، آل انڈیا مسلم اسٹوڈنٹس فیڈریشن کے اجلاس میں، 26 دسمبر 1941]

آخر ایسا کیسے ہوا کہ ایک ایسا مسلمان وکیل جو مذہبی طور پر پابندِ عمل نہ تھا، مسلسل سگریٹ نوشی کرتا تھا، شراب نوشی سے رغبت رکھتا تھا، اسلام کے بنیادی احکام سے بھی زیادہ واقف نہیں تھا، انگریزی کے سوا کوئی اور زبان نہیں جانتا تھا، ہمیشہ بے داغ سوٹ میں ملبوس رہتا تھا، تقریباً انگلستان میں ہی مستقل سکونت اختیار کر چکا تھا، ملاؤں کے اسلامی ریاست کے خواب کو حقارت سے دیکھتا تھا، گاندھی کی بھجن سرائی والی سیاست سے سخت بیزار تھا، اور ہندوستانی اتاترک بننے کا خواب دیکھتا تھا، اس نے تن تنہا پاکستان قائم کر دیا؟ پاکستان تو دراصل ہندو مسلم تنازعے کا حل سمجھا جا رہا تھا۔ پھر ایسا کیا ہوا کہ ہندوستان اور پاکستان ایسی شدید نفرت میں ڈوب گئے اور وہ جنگ چھیڑ دی جو بعد میں دہشت گردی کے لیے ایک درس گاہ بن گئی؟

محمد علی جناح نو ہفتے قبل از وقت پیدا ہو گیا تھا۔ وہ 20 اکتوبر 1875 کو محمد علی جناح بھائی کے نام سے اس دنیا میں آیا۔ مغربی دنیا سے اس کا پہلا تعارف ایلیٹ کرسچین مشن ہائی اسکول کے ذریعے ہوا۔

یہاں اسے کرسمس کا دن بطور یوم پیدائش زیادہ بہتر لگا، چنانچہ اس نے اپنی تاریخ پیدائش 25 دسمبر 1875 درج کروادی۔ اس کے نام کا ''بھائی'' لاحقہ بھی کچھ زیادہ دیسی سا معلوم ہوتا تھا، چنانچہ اسے بھی حذف کر دیا۔ 1893 میں لندن کے لنکنز اِن سے وکالت کی ڈگری لیتے وقت اس کا نام صرف ''جناح'' رہ گیا۔

لندن میں طالبِ علمی کے زمانے میں اس کی تین بڑی دلچسپیاں تھیں: قانون، جس کی اس نے باضابطہ پڑھائی کی، تھیٹر جس کا وہ باقاعدہ شوقین تھا اور سیاست جس میں اس کا دل لگتا تھا۔ جناح جس کام میں بھی ہاتھ ڈالتا کمال کر دکھاتا تھا۔ جو لوگ اس کے اسٹیج کے شعور، اس کے خطبات کے اثر، اور بروقت مداخلت کی مہارت کو ہلکے میں لیتے وہ ہمیشہ نقصان اٹھاتے تھے۔

لندن میں جناح کا سب سے قیمتی رابطہ عظیم پارسی عالم اور تاجر دادا بھائی نوروجی سے تھا جن کی 1901 میں لندن سے شائع ہونے والی شہرۂ آفاق تصنیف Poverty and un-British Rule in India (ہندوستان میں غربت اور برطانوی اصولوں سے منحرف اقتدار) بعد کی قومی تحریک کی فکری بنیاد بن گئی۔ دادا بھائی پہلے ہندوستانی تھے جو برطانوی پارلیمنٹ کے ایوان زیریں (ہاؤس آف کامنز) کے رکن منتخب ہوئے۔ وہ 1902 میں سنٹرل فنز بری سے لبرل پارٹی کے ٹکٹ پر کامیاب ہوئے تھے۔

دادا بھائی اپنے کامیاب کیریئر کا سہرا انگریزی تعلیم کے سر باندھتے اور لندن میں مقیم ہندوستانی طلبہ کی ہمیشہ دل کھول کر مدد کرتے تھے۔ جناح نے بھی کچھ عرصہ ان کے سکریٹری کے طور پر کام کیا۔ ہندوستان میں دادا بھائی کی جو شبیہ معروف ہے وہ ایک ضعیف العمر شخص کی ہے کیونکہ 1906 میں جب وہ کلکتہ میں کانگریس کے اجلاس کی صدارت کے لیے آئے تو ان کی عمر اسی برس سے تجاوز کر چکی تھی۔ اس اجلاس کے صدارتی خطاب کا مسودہ تیار کرنے میں جناح نے ان کی مدد کی تھی۔

تیس برس کی عمر تک جناح ابھرتی ہوئی قومی تحریک کی صف اول کی قیادت میں شامل ہو چکا تھا۔ اس کا سیاسی مؤقف نہایت واضح اور انقلابی تھا۔ اس نے اس وقت کے برطانوی حامی رہنما سر سید احمد خان کے تصور دو قومی نظریہ کو سخت تنقید کا نشانہ بنایا جن کے مطابق ہندوستان میں ہندو اور مسلمان دو علیحدہ قومیں تھی۔ جناح کے نزدیک اصول پسندی مقبولیت پر مقدم تھی۔ اس نے 1905 میں تقسیم

بنگال کی مخالفت کی اور وائسرائے کرزن پر یہ الزام عائد کیا کہ اس نے محض اپنے قلم کی ایک جنبش سے ہندوؤں اور مسلمانوں میں تفرقہ ڈال دیا۔

جناح نے 31 دسمبر 1906 کو ڈھاکہ میں قائم ہونے والی آل انڈیا مسلم لیگ میں شمولیت سے انکار کر دیا۔ اس نے مسلمانوں کو خبردار کیا کہ وہ برطانوی پالیسی ''بانٹ کر حکومت کرو'' کا شکار نہ ہوں اور جداگانہ انتخاب کے مطالبے کو زہر قاتل قرار دیا۔ اس کی وکالت اور عوامی زندگی میں کیریئر تیزی سے ترقی کر رہا تھا۔ 1910 میں وہ وائسرائے کی ایگزیکٹو کونسل میں شامل ہونے والا پہلا غیر سرکاری رکن بنا۔ اسی دوران انہوں نے جنوبی افریقہ میں سرگرم گاندھی کا پرزور دفاع کیا جب لارڈ منٹو نے اسے غدار قرار دینے کی کوشش کی۔ مسلم لیگ کے بعض سخت گیر حلقے بالخصوص مولانا حسرت موہانی جناح سے اتنے نالاں ہو گئے کہ انہیں ''ہندو ایجنٹ'' تک کہہ ڈالا، جو ان کے سیاسی ذخیرۂ الفاظ میں بدترین گالی تھی۔

ابتدائی زمانے کا جناح کانگریس کے حلقوں میں بے حد مقبول تھا۔ مشہور شاعرہ سروجنی نائیڈو نے تو یہاں تک لکھا کہ جناح کا مزاج بچپن جیسا شوخ و دل آویز، اس کا ادراک نسوانی سی لطافت لیے ہوئے اور شخصیت نہایت عقلی، عملی اور شاندار طور پر آئیڈیل ازم سے بھرپور تھی۔

اس نے مذہب کے نام پر پیدا ہونے والی اس عوامی ہسٹیریا کو مسترد کر دیا اور یہ سمجھنے سے قاصر تھا کہ آخر برطانوی انتظام کے تحت ان مقدس مقامات کے تقدس میں کون سی کمی آ جائے گی۔ ذاتی طور پر چونکہ وہ زیادہ مذہبی نہیں تھا اس لیے مکہ اور مدینہ پر ممکنہ عیسائی اقتدار کے تصور سے جو تکلیف دیگر مسلمان محسوس کر رہے تھے اس سے وہ خود کو ہم آہنگ نہ کر سکا۔ لیکن مسلم برادری نے وہ بات نہیں بھولی جو جناح شاید جانتا ہی نہیں تھا کہ خود رسول اکرم ﷺ نے فرمایا تھا کہ سرزمین عرب میں کبھی دو مذاہب اکٹھے نہیں ہوں گے۔

گاندھی کو بھی درحقیقت حضور ﷺ کے ارشادات سے کوئی دلچسپی نہیں تھی، مگر ایک زیرک سیاست دان کی حیثیت سے انہوں نے مسلمانوں کے دلوں میں جگہ بنانے کا یہ موقع ہاتھ سے جانے نہیں دیا۔ 1919 کے ناگپور کانگریس اجلاس میں مسلمانوں نے اس شخص کے حق میں تالیاں بجائیں

جو'اللہ' کے بجائے 'رام' کا پجاری تھا۔ جناح کو وہاں خوب طعن وتشنیع کا سامنا کرنا پڑا۔علی برادران میں سے زیادہ جری شوکت علی نے تو یہاں تک دھمکی دے دی کہ اگر جناح باز نہ آئے تو اسے سرعام پیٹا جائے گا۔ مگر جناح ڈٹا رہا۔اس نے گاندھی کو متنبہ کیا کہ سیاست میں مذہب کو شامل کرنا خطرناک ہوگا اور پھر کانگریس سے علیحدہ ہوگیا۔اس کے بعد وہ کبھی کانگریس میں واپس نہیں آیا۔

1922 میں گاندھی کی تحریک کی اچانک ناکامی کے بعد سیاست نے پھر آئینی طریقوں کی راہ اختیار کی۔ موتی لال نہرو کے زیر قیادت کانگریس کے ایک حلقہ نے 1923 کے انتخابات میں بھی حصہ لیا۔ مرکزی قانون ساز اسمبلی میں جناح حسب معمول اپنے تیکھے سوالات اور بے مثال حاضر دماغی سے چھایا رہا۔اس کا ایک مشہور مکالمہ مالیات کے رکن سر بیسل بلیکٹ سے 1925 میں ہوا۔بحث کے دوران جناح نے سر بیسل پر یہ الزام لگایا کہ ان کا پیش کردہ بجٹ ہندوستان کے بجائے برطانیہ کے مفادات کو زیادہ فائدہ پہنچانے والا ہے۔ سر بیسل نے اس الزام کی تردید کی۔ جناح نے کہا کہ ''تو پھر ہاتھ دل پر رکھ کر اس کی تردید فرمائیے۔'' سر بیسل نے تردید کے لیے ہاتھ دل پر رکھا تو جناح نے اسپیکر سے کہا: سر، ایسی صورت میں عرض ہے کہ معزز رکن مالیات کے پاس دل ہی نہیں ہے۔''

باقی 1920 کی پوری دہائی میں گاندھی کا واحد یادگار کارنامہ محض ایک ادھوری سی خودنوشت سوانح شائع کرنا تھا جس میں سچائی کے حوالے سے اپنے بعض سنسنی خیز تجربات بیان کیے۔ قارئین کو گاندھی کی غیر معمولی جنسی زندگی کے بعض حیران کن گوشے کا پتہ بھی اسی سے چلا۔ ہندو مسلم معاہدے کے لیے 1927 میں آئینی اصلاحات کی ایک اور کوشش ناکام ہوئی جس کا نتیجہ محض لیگ میں مزید اختلافات اور تقسیم کی صورت میں نکلا۔ حکومت نے ایک مسودۂ آئین کو سائمن کمیشن کے ذریعے آگے بڑھانے کی کوشش کی مگر وہ محض اس شدید بائیکاٹ کے لیے یادگار رہ گئی جو اس کے خلاف واقع ہوا۔

1928 میں کانگریس نے خود بھی ایک آئین کا مسودہ تیار کرنے کی کوشش کی مگر یہ کوشش دوہرے رویے کے الزامات کے باعث ناکامی سے دوچار ہوئی۔ 19 جون 1929 کو جناح نے نئے برطانوی وزیر اعظم ریمزے میکڈونلڈ کو خط لکھ کر گول میز کانفرنس کے انعقاد کی تجویز پیش کی۔ وائسرائے لارڈ اِرون نے 31 اکتوبر کو اس تجویز کو قبول کرلیا مگر کانگریس نے اس گھوڑے کے آگے

گاڑی باندھ دی۔ ان کا مطالبہ تھا کہ پہلے ہندوستان کو ''ڈومینین اسٹیٹس'' دیا جائے۔ سال کے آخر تک کانگریس نے اپنا مطالبہ بڑھا کر ''مکمل آزادی'' پر کر دیا۔ جناح سمجھتا تھا کہ گاندھی جدید دور کے لیے موزوں لیڈر نہیں ہیں۔ چنانچہ اس نے کہا کہ ''خدا ہی مسٹر گاندھی کی مدد کرے۔'' جناح ہمیشہ کانگریس کے لیڈروں کو مخاطب کرتے ہوئے ''مسٹر'' کہنا نہیں بھولتا تھا۔ پہلی گول میز کانفرنس کے لیے اٹھاون مندوبین کو مدعو کیا گیا۔ کانفرنس کا افتتاح 12 نومبر 1930 کو شاہ جارج پنجم نے کیا۔ گاندھی نے اس اجلاس کو کانگریس کے بغیر بے کار قرار دیا۔

دس ہفتوں پر محیط مشاورتوں کے بعد یہ بات صاف ہوگئی کہ یہ تمام کوششیں بے سود ثابت ہوئیں۔ جناح نے کنارہ کشی اختیار کر لی۔ اس نے ہیمپسٹیڈ میں ایک عالی شان کوٹھی خریدی، کنگز بینچ پر وکالت کے لیے دفتر قائم کیا، اپنی چہیتی بہن فاطمہ اور بیٹی دینا کے ساتھ لندن میں سکونت اختیار کی، ایک پالتو کتا (پوڈل) رکھا، آرام و سہولت کے لیے ایک ڈرائیور سمیت بینٹلی کار حاصل کی اور پرائیویٹ کونسل کے روبرو مقدمات کی پیروی شروع کی۔ (اس کی اہلیہ رتی جو پارسی تھی، کم عمری میں شادی کے بندھن میں بندھی اور جوانی ہی میں وفات پا گئی۔ جناح صرف ایک بار کسی مجمع میں رویا تھا، اور وہ لمحہ اس کی بیوی کی موت کا تھا، حالانکہ دونوں کے درمیان اس وقت تک علیحدگی ہو چکی تھی۔)

لندن میں جناح کو مصطفیٰ کمال اتاترک کے بارے میں ایک کتاب کے ذریعے پتہ چلا۔ اس نے ایچ سی آرمسٹرانگ کی Grey Wolf: An Intimate Study of a Dictator کا مطالعہ کیا اور اس ترک رہنما کا مداح بن گیا جس نے پہلے اپنی قوم کو بچایا اور پھر اسے جدید خطوط پر استوار کیا۔ جناح نے اپنی بہن سے کہا کہ اگر کبھی اسے اتاترک جتنی طاقت حاصل ہوئی تو وہ ہندوستانی مسلمانوں کو مغربی تہذیب و اقدار اختیار کرنے کی طرف مائل کرے گا۔

دوسری گول میز کانفرنس جو 7 ستمبر 1931 سے شروع ہوئی، وہ جتنے بلند و بانگ دعوے لے کر آئی تھی اتنے ہی ناکام نتائج کے ساتھ ختم ہوئی۔ گاندھی کی شرکت سے امیدیں بڑھ گئی تھیں لیکن اس نے اس دورے کو بنیادی طور پر برطانوی عوام کے سامنے تحریک آزادی کو اجاگر کرنے کے لیے استعمال کیا۔ گاندھی نے محنت کش طبقے سے میل جول بڑھایا اور ذرائع ابلاغ کی توجہ کا مرکز بن گئے۔ وہ

سردیوں میں محض ایک دھوتی میں لندن کی سڑکوں پر نظر آتے اور یوں واقعی میڈیا کے ستارے بن گئے۔ نیم برہنہ درویش نما شخص جب دوہری پٹیاں پہنے کنگ سے ملنے گیا تو کنگ جارج پنجم نے تبصرہ کیا کہ ان کے مہمان کے بدن پر کپڑے کم ہیں، جس پر گاندھی نے برجستہ جواب دیا کہ کنگ نے کافی لباس پہن رکھا ہے۔

کانفرنس کے مذاکرات ایک بار پھر وہیں جا کر الجھ گئے جہاں پہلے بھی رکے تھے... فرقہ وارانہ تنازعات کی دلدل میں۔ آغا خان نے اپنی یادداشتوں میں لکھا ہے کہ گفتگو ان باریکیوں میں الجھ گئی کہ وہ غیر حقیقی محسوس ہونے لگی۔ جناح زیادہ تر خاموش رہا اور اس طرز عمل کو بعض نے بے اعتنائی اور بعض نے کمزوری سے تعبیر کیا۔ جناح کو اس وقت شدید صدمہ پہنچا جب نومبر و دسمبر 1932 میں ہونے والی تیسری گول میز کانفرنس میں اسے مدعو ہی نہیں کیا گیا۔ اس کی انا کو سہارا درکار تھا اور اس کی شفا صرف ہندوستان کی سرزمین پر ممکن تھی۔ روشنی کی ایک کرن بمبئی سے طلوع ہوئی جہاں اس کی غیر موجودگی میں مسلمانوں کے لیے مخصوص نشست سے ووٹروں نے اسے بلامقابلہ مرکزی قانون ساز اسمبلی کے لیے منتخب کر لیا تھا۔ جنوری 1935 میں وہ بمبئی کے لیے روانہ ہوا تا کہ اپنے ووٹروں کی نمائندگی کر سکے۔ یہ سفر اتنا ہی اہم تھا جتنا جنوری 1915 میں گاندھی کا وہ سفر جب وہ بیس برس قبل وطن واپس لوٹے تھے۔

جناح ایک نئے جوش اور ولولے کے ساتھ واپس آیا۔ اس کے لیے موقع اس انتشار میں پوشیدہ تھا جو برطانوی حکومت کی جانب سے ہندوستان کے لیے نئے آئینی خاکے کی کوششوں کے نتیجے میں پیدا ہوا۔ یہ سلسلہ سائمن کمیشن سے شروع ہو کر بالآخر 1935 کے گورنمنٹ آف انڈیا ایکٹ پر منتج ہوا۔ اگرچہ انگریز دلی میں اقتدار میں شراکت پر آمادہ نہیں تھے مگر انہوں نے صوبوں میں زیادہ ذمہ دار حکومت کی اجازت دے دی تھی۔ اس بار ووٹرز کی تعداد بھی خاصی بڑھا دی گئی۔ 1937 کے انتخابات میں تیس ملین ووٹرز نے حق رائے دہی کا استعمال کیا جبکہ اس سے قبل یہ تعداد صرف ساڑھے چھ ملین تھی۔

یہ پورا عمل مختلف فیصلوں سے عبارت تھا۔ 1932 میں ریمزے میکڈونلڈ نے 'کمیونل ایوارڈ' کے نام

سے ایک اعلان کیا۔ مقصد یہ تھا کہ صوبوں میں نمائندہ حکومت کا دائرہ پھیلایا جائے۔ اس میں مختلف قومیتوں کو ان کی 'اہمیت' کی بنیاد پر نشستیں الاٹ کی گئیں۔ یہاں اہمیت سے مراد آبادی کے تناسب کے بجائے سیاسی و سماجی اثر و رسوخ تھا۔ انتخابی حلقے علیحدہ کر دیے گئے اور پورا نظام اس طرح ترتیب دیا گیا کہ سلطنت کے مفادات کو تحفظ حاصل رہے۔ مثال کے طور پر بنگال میں یورپی باشندے کی محض ایک فیصد آبادی تھی مگر انہیں 250 میں سے 25 نشستیں دی گئیں۔ ہندوؤں کو 80 نشستیں ملیں، جن میں 70 اعلیٰ ذات کے ہندوؤں کے لیے اور 10 اچھوتوں کے لیے مخصوص تھیں، حالانکہ 1931 کی مردم شماری کے مطابق ہندو کل آبادی کا 44 فیصد تھے۔ مسلمانوں کو 119 نشستیں دی گئیں جن میں دو نشستیں خواتین کے لیے مخصوص تھیں۔ تاہم یہ بھی آبادی کے لحاظ سے کم تھیں کیونکہ بنگال میں مسلمانوں کی آبادی 54 فیصد تھی۔

تاہم ہندو اشرافیہ کی تمام تر تشویش صرف اس ایک نکتے پر مرکوز تھی کہ مسلمانوں کی نشستیں ہندو نشستوں سے کہیں زیادہ ہو گئیں۔ اس سے قبل کی بنگال کونسل میں ہندوؤں کے پاس 46 نشستیں تھیں اور مسلمانوں کے پاس 39۔ اب انہیں اندیشہ تھا کہ کہیں بنگال مسلمانوں کے زیر اقتدار نہ آ جائے۔

ایک طرف اس بات پر افسوس کیا جا رہا تھا کہ گویا پلاسی کی تاریخی فتح ''بے معنی'' ہو گئی ہے کیونکہ جس اقتدار کو مسلمانوں سے چھینا گیا تھا اب وہی اقتدار دوبارہ انہی کے سپرد کیا جا رہا تھا۔ یہ کہا جا رہا تھا کہ جس طرح لارڈ کلائیو نے وحشی مسلمانوں سے بنگالی ہندوؤں کو بچایا تھا اب وہی انگریز دوبارہ اقتدار ان وحشیوں کے سپرد کر رہے ہیں۔ ہندو سبھا کے رہنما بی سی چیٹر جی نے اس اقدام کو ''دھوکہ'' قرار دیا۔ کچھ معتدل مزاج حلقے بنگالی ہندو تہذیب و ثقافت کے اعلیٰ معیار کی بنیاد پر خصوصی رعایت کے خواہاں تھے۔ بردوان کے مہاراجہ نے ایک عرضداشت پیش کی جس پر کلکتہ کے معزز ترین افراد نے دستخط کیے۔ اس میں کہا گیا کہ ''اگرچہ بنگال میں ہندو اقلیت میں ہیں مگر وہ تہذیب و ثقافت میں اعلیٰ ترین مقام رکھتے ہیں، اور خواندگی میں آبادی کا 64 فیصد انہی پر مشتمل ہے۔'' کانگریس کے رہنما یا تو اسی سوچ کے حامی تھے یا بات کو ٹالتے رہے۔

خلافت تحریک کے اچانک خاتمے کے بعد مسلمانوں کی کانگریس سے بددلی کا عمل شروع ہو چکا تھا۔

1932 کے ردعمل اور بیانات نے مسلمانوں کے ان خدشات کو اور تقویت دی کہ بنگال کی کانگریس محض ایک پردہ پوش ہندو جماعت ہے۔اس دور کے مقبول ترین مسلم رہنما اے کے فضل الحق جو بعد میں جناح کے اہم اور فیصلہ کن حلیف ثابت ہوئے، انہوں نے 12 اکتوبر 1933 کو 'اسٹیٹس مین' میں لکھا کہ ''اگر میں کسی بھی جج کو یہ باور کرانے میں ناکام رہا کہ بنگال کے ہندو فرقہ وارانہ خودغرضی کی جیتی جاگتی مثال ہیں تو مجھے پھانسی دے دی جائے۔''

جناح نے پورے برصغیر میں پھیلے مسلم اضطراب کے ان بکھرے ہوئے دھاگوں کو یکجا کرنا شروع کیا اور انہیں ایک ہم آہنگ تصویر میں پرو دیا۔اس کا پہلا امتحان 1937 کے انتخابات تھے۔وہ اس میں کامیاب نہ ہو سکا۔مسلم اکثریتی صوبوں جیسے بنگال، پنجاب، سندھ اور سرحد میں مسلم لیگ کے امیدواروں کو خاصی ناکامی کا سامنا کرنا پڑا۔کانگریس نے شاندار کامیابی حاصل کی۔ذات پات والے ہندوؤں کے لیے مخصوص 1585 میں سے 711 نشستیں کانگریس کے حصے میں آئیں۔اس کے علاوہ اچھوتوں کے لیے مخصوص نشستوں میں بھی اکثریت کانگریس نے حاصل کی۔جناح کے لیے قدرے تسلی کی بات یہ تھی کہ اگر مسلمان اس کے حق میں ووٹ نہیں دے سکے تو کانگریس کے حق میں بھی نہیں دیا۔کانگریس نے مسلمانوں کے لیے مخصوص 482 نشستوں میں سے محض 58 پر امیدوار کھڑے کیے تھے اور ان میں سے صرف 26 پر کامیابی حاصل کی۔گو جناح مسلمانوں کا اکلوتا ترجمان نہیں بن سکا مگر وہ یہ مؤقف برقرار رکھنے کے قابل ضرور ہو گیا کہ کانگریس صرف ہندوؤں کی نمائندہ جماعت ہے۔

جناح کے مسائل میں سے ایک بڑا مسئلہ یہ تھا کہ مسلم لیگ ایک غیر مؤثر اور کمزور جماعت بن چکی تھی۔حتیٰ کہ بنگال جیسے اہم صوبے میں اس کی کوئی سنجیدہ موجودگی نہیں تھی۔وہ شخصیات جو بعد میں مسلم لیگ کا چہرہ سمجھی جانے لگیں، جیسے تاجر حسن اصفہانی اور سیاست دان حسین شہید سہروردی، ان لوگوں نے 1937 کے انتخابات کے لیے ڈھاکہ کے بااثر نواب کی مدد سے ایک متحدہ مسلم پارٹی قائم کر لی۔یہ کم ہی لوگ جانتے ہیں کہ ڈھاکہ کے نواب کشمیری نژاد تھے اور انہوں نے ابتدائی طور پر چمڑے کے کاروبار سے دولت کمائی تھی۔عبدالغنی کو 1875 میں نواب کا خطاب دیا گیا جو بعد میں 1857 کی وفاداری کے صلے میں موروثی بنا دیا گیا۔

جناح نے 1937 کی شکست کو اس سے کہیں بہتر طریقے سے استعمال کیا جتنا کانگریس نے اپنی فتح کو کیا۔ کانگریس کے رہنماؤں نے صوبوں میں حکومتیں بنالیں۔ ابتدا میں یہ بات یقیناً باعثِ افتخار تھی مگر حکومت چلانا ایک مسلسل دردِ سر بھی تھا۔ جناح نے کانگریسی حکومتوں کے ہاتھوں مسلمانوں کے ساتھ روا رکھے گئے ہر حقیقی یا مبالغہ آمیز مظالم کو ابھارا، تا کہ مسلمانوں اور گاندھی کے درمیان فاصلہ بڑھایا جا سکے۔ اس کا اندازہ درست تھا کہ جتنا مسلمان گاندھی سے دور ہوں گے اتنا ہی جناح کے قریب آئیں گے، کیونکہ دہلی میں اپنا مقدمہ پیش کرنے کے لیے مسلم لیگ ہی اب واحد قومی پلیٹ فارم تھا۔ جناح نے چابک دستی سے ان تمام متبادل سیاسی دھڑوں کو ختم کر دیا جو مسلمانوں کو اپنی طرف مائل کر سکتے تھے۔ انہوں نے علاقائی رہنماؤں کو کسی بھی شرط پر مسلم لیگ میں شامل کر لیا۔ انہیں اپنی سابقہ حیثیت برقرار رکھنے کی پوری آزادی دی گئی۔ فرق صرف اتنا تھا کہ اب وہ مسلم لیگ کے پرچم تلے سرگرم تھے۔ 1938 تک ہندوستان کے دو اہم ترین مسلم رہنما پنجاب کے سر سکندر حیات خان اور بنگال کے فضل الحق جو لیگ سے باہر تھے اور اپنے اپنے صوبوں کے وزیر اعلیٰ بھی تھے، وہ بھی مسلم لیگ میں شامل ہو گئے۔

سیاسی جماعتوں کے ڈھانچے خود بھی خاصے کمزور تھے۔ گاندھی کا اصرار تھا کہ کانگریس ایک ایسا سائبان ہے جو ہر اس شخص کو سایہ فراہم کرتا ہے جو اتحاد اور آزادی کی وسیع راہ پر چلنے کا خواہاں ہو۔ جناح نے بھی مسلم لیگ کو ایک ایسا ہی سائبان بنا دیا جو ان لوگوں کے لیے تھا جو ابھی تک واضح نہ ہونے والی مسلم آزادی کی تنگ راہ پر گامزن ہونا چاہتے تھے۔ جناح نے اپنی راہ کو مناظرانہ انداز میں واضح کرنا شروع کیا۔ جب 1937 کی انتخابی مہم کے دوران جواہر لال نہرو نے یہ اعلان کیا کہ ہندوستان میں صرف دو قوتیں ہیں، ایک برطانوی اور دوسری کانگریس، اور جو کانگریس کے مخالف ہیں ان کا عوام سے کوئی تعلق نہیں، تو جناح نے اس بیان کا کلکتہ سے جذباتی انداز میں جواب دیا۔ انہوں نے کہا کہ ''میں کانگریس کی صف میں شامل ہونے سے انکار کرتا ہوں۔ اس ملک میں ایک تیسری قوت بھی موجود ہے اور وہ ہیں مسلمان۔''

نہرو جنہوں نے اپنے سیاسی کیریئر کی ابتدا سیویل رو (Saville Row) کے سوٹوں میں کی تھی

لیکن اب کھدر پہنتے تھے اور جناح کے بارے میں کافی تحقیر آمیز رویہ رکھتے تھے۔ ان کے نزدیک جناح ایک ایسا شخص تھا جو کسی ہندوستانی زبان سے نابلد تھا، معاشی مسائل میں کوئی دلچسپی نہیں رکھتا تھا اور عوامی جذبات کو بھڑکا کر اپنے جال میں پھنسانا چاہتا تھا۔ جناح نے نہرو کو تکبر کا نشانہ بنایا، تاہم خود بھی انگریزی سوٹوں کو کسی حد تک ترک کر کے شیروانی اور ٹوپی پہننے لگا تھا۔ یہ نئی وضع ان کے اس نئے پیغام کے زیادہ مطابق تھی کہ ''اسلام خطرے میں ہے۔''

یہاں جناح نے شعوری طور پر اسلامی لاشعور میں پیوست ایک خوف کو ہوا دی۔ یہ وہ اندیشہ تھا کہ مسلمان دارالحرب میں زندگی گزارنے پر مجبور ہو جائیں گے، ایک ایسا ملک جہاں انہیں اپنے مذہب پر آزادی کے ساتھ عمل کرنے کی اجازت نہیں ہوگی۔ جناح نے تو شائستہ زبان میں اور ان کے ساتھیوں نے کہیں زیادہ کھردری زبان میں کانگریس کے ہندوستان کو ہندو راج کے مترادف قرار دینا شروع کر دیا۔ علما اور خطبا یہ پرچار کرنے لگے کہ اگر ہندو اقتدار میں آ گئے تو مسلمانوں کو جمعے کے دن مسجدوں میں کھلے عام نماز پڑھنے اور قرآن کی تلاوت کرنے کی اجازت بھی نہیں ملے گی۔ یہ پروپیگنڈہ کافی مؤثر ثابت ہوا۔

جناح نے بڑی مہارت سے گاندھی کی مذہبیت کو خود کانگریس کے خلاف ایک ہتھیار میں بدل دیا۔ گاندھی اکثر ہندوستان میں ''رام راج'' قائم کرنے کا خواب دیکھتے تھے۔ یہ اس مثالی ریاست کا استعارہ تھا جو رام چندر جی کے عہد میں قائم تھی۔ اس میں مساوات تھی اور کسان کے پیٹ کو روٹی میسر تھی۔ ہندو اس تصور سے وابستہ ہو جاتے تھے۔ جناح نے اسی رام راج کو ایک حاکمانہ ہندو ریاست کی شکل میں پیش کیا۔ گاندھی کے رام راج کے تصور کو مسلمانوں کے لیے ایک ڈراؤنے خواب میں بدل دیا۔ گاندھی نے ہمیشہ اس غلط تعبیر پر افسوس کا اظہار کیا مگر 1937 میں کانگریسی حکومتوں کے قیام کے بعد مسلمانوں کے جذبات ان کے خلاف ہوتے چلے گئے۔

ایک سائبان کو تیز آندھیوں کے مقابلے میں سنبھالنے کے لیے مضبوط ہاتھوں کی ضرورت ہوتی ہے۔ کانگریس کا سائبان اس وقت بکھرنے لگا جب اسے ایک طرف بیرونی عالمی جنگ اور دوسری طرف اندرونی خانہ جنگی کے دباؤ کا سامنا کرنا پڑا۔ 3 ستمبر 1939 کو برطانیہ نے جرمنی کے خلاف

جنگ کا اعلان کر دیا۔ ہندوستان چونکہ سلطنت برطانیہ کا حصہ تھا، اس لیے لندن میں ہونے والے فیصلے کے تحت وہ بھی اس جنگ میں شامل ہو گیا۔ کانگریس خود اس جنگ کو اپنے مقاصد کے لیے کیسے استعمال کرے اس پر تذبذب کا شکار تھی۔ اس نے فیصلہ کیا کہ 1937 کے انتخابات کے نتیجے میں جو کانگریسی حکومتیں قائم ہوئی تھیں ان سب کو مستعفی ہو جانا چاہیے۔ جناح نے اس موقع پر ''یوم نجات'' کا اعلان کیا اور مسلمانوں سے کہا کہ اللہ کا شکر ادا کریں۔

جناح نے اس موقع پر ونسٹن چرچل کا بھی شکریہ ادا کیا اور برطانوی جنگی کوششوں کے لیے اس مسلم قوم کی مکمل حمایت کا اعلان کیا جو ابھی دنیا میں آنے والی تھی۔ برطانوی حکومت اس بات پر شکر گزار تھی کہ کم از کم ایک ہندوستانی رہنما ایسا ہے جو نہ الجھن کا شکار تھا اور نہ ہی موقع پرست۔ جناح اس وقت بھی اپنے مؤقف پر قائم رہا جب برطانیہ شکست کے دہانے پر کھڑا نظر آ رہا تھا۔ اس کے برعکس کانگریس اس الجھن کے بوجھ تلے دب کر خاموشی اختیار کر گئی جس کے تلخ نتائج برآمد ہوئے۔

جناح نے صرف ایک تجویز پیش کی اور پھر مناسب وقت کا انتظار کرتا رہا کہ اسے ایک باقاعدہ مطالبے میں بدلا جا سکے۔ یہ تجویز لاہور میں پیش کی گئی۔ ایک ایسا شہر جو بجا طور پر جدید ہندوستان اور پاکستان دونوں کا جائے پیدائش کہلا سکتا ہے۔ 1929 میں لاہور ہی میں کانگریس نے ہندوستان کی آزادی کا مطالبہ کیا تھا اور 1940 میں اسی شہر میں مسلم لیگ نے پاکستان کا مطالبہ پیش کیا۔

دلچسپ بات یہ ہے کہ مسلم لیگ کی جس قرارداد کو آج ہم قراردادِ پاکستان کہتے ہیں اس میں ''پاکستان'' کا لفظ کہیں نہیں آیا تھا۔ یہ قرارداد 23 مارچ 1940 کی دوپہر دیر گئے پیش کی گئی اور اگلے روز اسے بھرپور تائید سے منظوری مل گئی۔ جناح پر اگر یہ الزام لگایا جائے کہ اس میں مبہم زبان کا استعمال دانستہ کیا گیا تو شاید یہ نامناسب نہ ہو کیونکہ اس نے خود اس انداز کو روا رکھا تھا۔ اس مسودے کو پنجاب اور بنگال کے وزرائے اعلیٰ سر سکندر حیات خان اور ''شیر بنگال'' فضل الحق نے تیار کیا تھا۔ فضل الحق ہی اس وقت سبجیکٹس کمیٹی کے صدر بھی تھے۔ قرارداد کا تیسرا پیراگراف کچھ یوں تھا:

> ''یہ آل انڈیا مسلم لیگ کے اس اجلاس کی پختہ رائے ہے کہ ملک میں کوئی بھی آئینی خاکہ نہ تو قابل عمل ہوگا اور نہ ہی مسلمانوں کے لیے قابل قبول جب تک کہ وہ

مندرجہ ذیل بنیادی اصولوں پر مبنی نہ ہو: یعنی جغرافیائی طور پر باہم مربوط اکائیوں کو اس انداز سے الگ الگ خطوں میں تقسیم کیا جائے کہ جہاں مسلمان اکثریت میں ہوں، جیسا کہ ہندوستان کے شمال مغربی اور مشرقی علاقوں میں، انہیں اس طرح یکجا کیا جائے کہ وہ خودمختار اور خودحاکم آزاد ریاستیں تشکیل دے سکیں۔ ان ریاستوں کے تمام اکائیوں کو مکمل خودمختاری اور اقتدارِاعلیٰ حاصل ہو۔''

اس کا مطلب کیا تھا؟ ایک مسلم ریاست یا ایک سے زیادہ؟ ہندوستان کے اندر یا ہندوستان سے باہر؟ یہ ابہام شاید دانستہ رکھا گیا تھا۔ بعض مؤرخین کا خیال ہے کہ شاید بنگال کے رہنما فضل الحق نے اس ابہام کو اس لیے دانستہ طور پر شامل کیا تھا تاکہ مستقبل میں ایک آزاد مسلم بنگال کے قیام کی راہ ہموار ہو سکے اور یوں لاہور کو مستقبل میں بنگلہ دیش کا جائے پیدائش بھی بنا دیا جائے۔ تاہم جناح کے ذہن میں کوئی ابہام نہیں تھا۔ اس مؤقف کی وضاحت سرکاری ملاقاتوں اور عوامی اجتماعات میں میڈیا کے سامنے بار بار ہوتی رہی۔ 27 جون 1940 کو جناح نے شملہ کے وائسرائے ہاؤس میں لارڈ لنلتھگو سے ملاقات کی۔ اس ملاقات کے بعد اپنے نوٹس میں جناح نے لکھا کہ وائسرائے نے اسے یقین دلایا ہے کہ مسلمانوں کی پیشگی منظوری کے بغیر کوئی حتمی منصوبہ نافذ نہیں ہوگا اور یہ کہ قرارداد پاکستان اب ''مسلم ہندوستان کا متفقہ ایمان'' بن چکی ہے۔

اسی یقین کے ساتھ 26 دسمبر 1941 کو آل انڈیا مسلم اسٹوڈنٹس فیڈریشن سے خطاب کرتے ہوئے جناح نے کہا کہ ''مسلم لیگ نے آپ کو ایک ایسا نصب العین دیا ہے جو میری رائے میں آپ کو اس ارض موعود تک لے جائے گا جہاں ہم اپنا پاکستان قائم کریں گے۔ لوگ کچھ بھی کہیں، جو چاہیں بولیں۔ مگر ہنستا وہی ہے جو آخر میں ہنستا ہے۔''

بے شک آخر میں مسکراہٹ جناح ہی کی تھی، مگر اس مسکراہٹ کے پس منظر میں ایک ہلکی سی بے یقینی کی پرچھائیں ضرور موجود تھی۔

جناح جانتے تھے کہ انہیں اس وقت تک انتظار کرنا ہوگا جب تک جنگ کا فیصلہ نہیں ہو جاتا۔ جنگ کے بعد ہونے والے عام انتخابات میں چرچل کی شکست جسے خود انہوں نے طنزیہ انداز میں ''آرڈر

آف دی بوٹ'' کہا تھا، ہندوستان کی آزادی کی راہ میں حائل آخری رکاوٹ بھی دور کرگئی۔ برطانوی حکومت جناح کے خواب کے معاملے پر منقسم تھی۔ ایک جانب وہ لوگ تھے جو جنگ میں جناح کی وفاداری کو سراہتے ہوئے انہیں انعام دینا چاہتے تھے، اور دوسری طرف وہ حلقے تھے جو ہندوستان کی تقسیم کے بھیانک نتائج سے خائف تھے۔ دوسرے آخری وائسرائے لارڈ ویول کا خیال تھا کہ جغرافیہ کو بدلا نہیں جاسکتا، مگر وہ ان لوگوں سے نمٹ رہے تھے جو تاریخ بدلنے پر تلے ہوئے تھے۔

1945-46 کے انتخابات کے نتائج بالکل واضح تھے۔ کانگریس نے ہندو حلقوں میں شاندار کامیابی حاصل کی جبکہ مسلم لیگ نے مرکزی اسمبلی کے لیے ڈالے گئے کل مسلم ووٹوں میں سے 86.7 فیصد اور صوبائی سطح پر 74.7 فیصد ووٹ حاصل کیے۔ دوسری جانب کانگریس کو مسلمانوں کے ووٹ میں محض 1.3 فیصد اور 4.67 فیصد ووٹ ملے۔ جناح اکثر کہا کرتے تھے کہ ہندو اور مسلمان کے درمیان صرف ایک قدر مشترک ہے، اور وہ ہے انگریزوں کی غلامی۔ اب وہ اپنا موقف ثابت کر چکے تھے۔ 2 جون 1947 کو برطانوی پارلیمنٹ نے ''انڈین انڈیپنڈنس ایکٹ'' منظور کرلیا، جس کے تحت برصغیر کی آزادی دو علیحدہ قوموں کے لیے تسلیم کرلی گئی۔

آخری وائسرائے اور آزاد ہندوستان کے پہلے گورنر جنرل لارڈ ماؤنٹ بیٹن نے 17 اگست 1947 کو لندن بھیجی گئی ''ذاتی رپورٹ نمبر 17'' میں لکھا کہ کراچی میں آزادی کی تقریبات کا پروگرام دوپہر کے کھانے سے بدل کر عشائیے تک مؤخر کرنا پڑا کیونکہ جناح یہ بھول گئے تھے کہ رمضان کا مہینہ ہے اور مسلمان روزے سے ہوتے ہیں۔ پاکستان کے قیام کے چار دن بعد عید آئی۔ مگر خوشی کا کوئی خاص سامان نہیں تھا۔ لاکھوں پناہ گزین انجان سرحدوں کو عبور کر رہے تھے۔ راستے میں خون اور نفرت کی کہانیاں رقم ہو رہی تھیں۔ جناح کی اپنی صحت بھی تیزی سے بگڑ چکی تھی۔ ٹی بی اور پھیپھڑوں کے سرطان نے ان کے جسم کو تباہ کر دیا تھا۔ مگر انہوں نے نہ سگریٹ نوشی چھوڑی نہ شراب نوشی ترک کی۔

یہی وہ شخص تھا جو مسلمانوں کو جدید بنانے کا خواب رکھتا تھا۔ اب انہوں نے اپنی تخلیق کردہ نئے ملک کے مستقبل کے لیے ایک سنجیدہ راستہ متعین کرنے کی کوشش کی۔ جب 11 اگست 1947 کو

پاکستان کی دستور ساز اسمبلی کا پہلا اجلاس کراچی میں منعقد ہوا تو جناح نے فی البدیہہ تقریر کی۔ یہ تقریر کسی کاغذ پر نہیں بلکہ ان کے دل میں لکھی ہوئی تھی۔ انھوں نے کہا:

''میں آپ سے چند باتیں کہوں گا جو اس وقت میرے ذہن میں آ رہی ہیں... آپ آزاد ہیں۔ آپ آزاد ہیں کہ اپنے مندروں میں جائیں، آزاد ہیں کہ اپنی مسجدوں میں جائیں، یا پاکستان کی اس ریاست میں کسی بھی عبادت گاہ میں جائیں... آپ کا کسی بھی مذہب، طبقہ یا عقیدے سے تعلق ہو، اس کا ریاستی امور سے کوئی تعلق نہیں۔''

جناح نے اسلامی ریاست کے تصور کو لغو قرار دیا تھا، لیکن یہ بات دوسروں کے لیے ہرگز لغو نہیں تھی۔ جماعتِ اسلامی کے بانی اور نظریہ ساز مولانا مودودی، جن کی جماعت سیاست میں سرگرم کردار ادا کرتی تھی، نے جناح پر قرآن کو نظرانداز کرنے کا الزام عائد کیا۔ دستور ساز اسمبلی میں ایک اور بااثر عالم دین مولانا شبیر احمد عثمانی نے اشرافیہ کو خبردار کیا کہ اگر وہ یہ چاہتے ہیں کہ علما صرف معاشرتی اصلاح تک محدود رہیں اور خود دن رات مسلم سماج کو بگاڑنے میں آزاد رہیں تو انہیں یہ بھی گوارا ہونا چاہیے کہ علما اقتدار میں آ کر ایک حقیقی اسلامی ریاست کے قیام کی جدوجہد کریں۔

ادھر ہندوستان نے اپنی آزادی ایک ایسے وقت پر قبول کی جو نجومیوں نے تجویز کیا تھا۔ گاندھی نے جشن منانے سے انکار کر دیا۔ وہ اس وقت دہلی میں نہیں بلکہ کلکتہ میں موجود تھے، جہاں وہ بکھرتے ہوئے ہندوستان کے زخم سمیٹنے میں مصروف تھے۔ یہ شرف جواہر لال نہرو کو حاصل ہوا کہ وہ آدھی رات کے وقت ہندوستان کے نئے دور کے آغاز (India's tryst with destiny) کو خوش آمدید کہیں۔

صبح کے وقت ہندو مسلم فسادات کی ایسی لہر اٹھی جو اس سے پہلے کبھی نہیں دیکھی گئی تھی۔ اب ہندوستان اور پاکستان ایک دوسرے کو صرف اس خون کی دیوار کے پار سے دیکھ رہے تھے جو ان کے درمیان کھڑی ہو چکی تھی۔ جناح اس ہولناک منظر پر دل گرفتہ تھے، ایسی ہولناکی جس کا انہوں نے کبھی تصور بھی نہ کیا تھا۔ گاندھی بھی شدید مایوسی میں ڈوبے ہوئے تھے۔ شاید اگر وہ قتل نہیں بھی کیے جاتے تو بھی زیادہ عرصہ تک زندہ نہیں رہ پاتے۔

ناتھورام ونایک گوڈسے نے ایک خودکار پستول نمبر 606824اور سات گولیاں حاصل کیں۔ 30 جنوری 1948 کی شام، جب پانچ بجنے میں ابھی دس منٹ باقی تھے، وہ اپنے ہدف پر پہنچ چکا تھا۔ دہلی کے برلا بھون کے دروازے پر، جہاں گاندھی قیام پذیر تھے، کسی نے بھی اسے روکنے کی زحمت نہیں کی۔ گاندھی ابھی ابھی ایک اور ''مرتے دم تک بھوک ہڑتال'' سے ابھرے تھے، مگر ان کی باتوں میں اب موت کی چھاپ صاف جھلکنے لگی تھی، شاید اس لیے کہ چاروں طرف فضا میں خون کی بو رچی ہوئی تھی۔

یہ بھوک ہڑتال کوئی برطانوی مظالم کے خلاف نہیں تھی، بلکہ ان لوگوں کے خلاف تھی، جنہیں وہ آزادی دے چکے تھے، ان ہندو اور مسلمان کے خلاف جنہوں نے اپنی آزادی کا جشن بے مثال قتل و غارت کے ذریعے منایا تھا۔ عدم تشدد کا اصول اب ایک مذاق بن چکا تھا۔ 20 جنوری کو پاکستان سے آئے ہوئے ایک ہندو مہاجر کو گاندھی کی دعائیہ مجلس میں ایک دستی بم کے ساتھ گرفتار کیا گیا۔ اسی دن ایک بم جو مہاتما گاندھی کو نشانہ بنانے کے لیے نصب کیا گیا تھا تقریباً 25 گز کے فاصلے پر زوردار آواز کے ساتھ پھٹ گیا، مگر کسی کو نقصان نہیں پہنچا۔ گاندھی بدستور پرسکون رہے، بالکل ویسے ہی جیسے وہ واقعی یقین رکھتے ہوں کہ وہ جیسا اکثر کہا کرتے تھے، 125 یا 133 برس کی عمر تک زندہ رہیں گے، یعنی وہ عمر جو شاستروں کے مطابق انسانیت کی خدمت کرنے والوں کو ملتی ہے۔

22 جنوری تک گاندھی کی طبیعت اتنی سنبھل چکی تھی کہ وہ لان میں بغیر سہارے کے چلنے پھرنے لگے۔ اسی ہفتے انہوں نے برطانوی صحافی کنگزلی مارٹن کو ایک انٹرویو دیا جس کا حوالہ ٹنڈولکر کی سوانح حیات میں بھی موجود ہے۔ بات چیت کا رخ عدم تشدد کے فلسفے کی طرف مڑ گیا۔ ایک بار جنوبی افریقہ کے ایک کروڑ پتی نے گاندھی سے کہا کہ یہ پرامن مزاحمت تو محض ایک مجبوری ہے، کیونکہ ہندوستانیوں کے پاس تو کوئی فوج ہی نہیں تھی۔ گاندھی نے جواب دیا کہ عیسیٰ علیہ السلام تو پرامن مزاحمت کے سب سے بڑے علمبردار تھے، کیا آپ انہیں کمزور کہیں گے؟

کنگزلی مارٹن نے پوچھا کہ ہٹلر جیسے جابر حکمران کے مقابلے میں عدم تشدد کیسے مؤثر ہو سکتا ہے؟ گاندھی نے مسکراتے ہوئے، کچھ معصومیت کے انداز میں جواب دیا کہ وہ حکومت کے آدمی نہیں ہیں،

اس لیے حکومتوں کے نظریاتی جواز کے وہ ذمہ دار نہیں ہو سکتے۔ پھر کہا کہ ان کے ساتھی مولانا آزاد نے اس معاملے پر کہیں زیادہ صاف اور دوٹوک مؤقف اختیار کیا ہے۔ گاندھی نے آزاد کا قول دہراتے ہوئے کہا: ''جب ہمیں اقتدار حاصل ہوگا تو ہم اسے عدم تشدد کے بل پر برقرار نہیں رکھ سکیں گے۔''

28 جنوری کو کانگریس کی ایک رفیق، راجکماری امرت کور، ان کی سلامتی کے بارے میں فکر مند ہو کر ان سے ملنے آئیں۔ گاندھی نے بے ساختہ جواب دیا: ''اگر مجھے کسی پاگل کے ہاتھوں گولی کا نشانہ بننا ہے تو میں ہنستے ہوئے موت کو گلے لگا لوں گا۔'' 29 جنوری جمعرات کی شب سونے سے پہلے گاندھی نے اپنی پوتی مَنّو کو ایک شعر سنایا:

بہار گلشنِ ہستی دو روزہ ہے سو ہے<br>
تماشہ دیکھ لے فرصت ہے چند روزہ ہے

30 جنوری جمعہ کی صبح گاندھی حسب معمول ساڑھے تین بجے بیدار ہوئے۔ عبادت کی اور پھر اپنے کاموں میں مشغول ہو گئے۔ آٹھ بجے مالش کرائی اور غسل کے بعد چہرے پر تازگی نمایاں تھی۔ اب وہ بنگالی زبان لکھنے کی مشق کرنے بیٹھ گئے۔ ساڑھے نو بجے ناشتہ کیا جس میں بکری کا دودھ، پکی اور کچی سبزیاں، سنگترے اور ادرک و لیموں کا آمیزہ شامل تھا۔ اس کے بعد کانگریس کے لیے ایک نئے دستور پر کام شروع کیا جو تنظیم کے ڈھانچے کو از سر نو ترتیب دینے کے لیے تھا۔ دوپہر کے وقت قیلولہ کیا۔ کچھ مسلم علماء جو یہ سن کر فکر مند تھے کہ گاندھی دہلی چھوڑنے والے ہیں، ان سے ملنے آئے۔ گاندھی نے انہیں تسلی دی۔ پھر اپنے اہم خطوط منگوا کر کہا کہ ''آج ہی جواب لکھنا ضروری ہے، کیا معلوم کل ہوں یا نہ ہوں۔''

بعد ازاں سندھ سے آئے ہوئے مہاجرین کے ایک وفد سے ملاقات ہوئی۔ گاندھی نے مسکراتے ہوئے بتایا کہ ایک مشتعل مہاجر نے مشورہ دیا کہ وہ ہمالیہ چلے جائیں۔ کہنے لگے کہ ''مجھے تو یہ خیال بہت پسند آیا، وہاں جا کر دوہرا مہاتما بن جاؤں گا، اور شاید بھیڑ پہلے سے زیادہ ہو جائے گی۔'' شام چار بجے سردار ولبھ بھائی پٹیل صلاح مشورے کے لیے آئے۔ جواہر لال نہرو اور مولانا آزاد بعد میں ملنے والے تھے۔ گاندھی ان دنوں کانگریس کی اعلیٰ قیادت کے درمیان امن قائم کرنے کی کوششوں

میں مصروف تھے۔ پانچ بجے جیب سے گھڑی نکالی اور پٹیل سے کہا کہ اب پوجا کا وقت ہو گیا ہے۔

اسی وقت ناتھورام گوڈسے برلا بھون کے احاطے میں موجود تھا۔ اس نے جیب میں ہی پستول کا سیفٹی لاک کھول لیا۔ گاندھی جن کو کندھوں کا سہارا منّو اور ابھا دے رہی تھیں، پوجا کے لیے اسٹیج کی طرف بڑھ رہے تھے۔ گوڈسے نے انہیں دیکھ کر خود کو مستعد کیا۔ جیسے ہی گاندھی چند سیڑھیاں چڑھنے لگے، گوڈسے دو قدم آگے بڑھا مگر ٹھٹک گیا کہ کہیں منّو قریب نہ ہو۔ جب وہ تین قدم کے فاصلے پر پہنچا تو پستول ہاتھ میں تھام کر ہتھیلیاں جوڑیں، سر جھکایا اور ''نمستے'' کہا۔ بعد میں عدالت میں بتایا کہ یہ گاندھی کی خدمات کا اعتراف تھا۔

ایک قدم اور آگے بڑھ کر گوڈسے نے منّو کو ایک طرف دھکیلا اور پستول کا گھوڑا دبا دیا۔ دباؤ کچھ زیادہ ہو گیا اور یکے بعد دیگرے تین گولیاں نکل گئیں۔ گاندھی لڑکھڑائے مگر پیروں پر جمے رہے۔ پھر دو اور گولیاں چلیں۔ گاندھی کے لبوں سے صرف ایک صدا نکلی: ''ہے رام!'' اور وہ دھیرے سے زمین پر گر پڑے۔ ان کے سفید کھدر پر خون کا دھبہ پھیلتا چلا گیا۔ یہ وہ قیمت تھی جو انہوں نے مسلمانوں کے ساتھ امن قائم کرنے کی خواہش کے عوض چکائی۔

ادھر قیام پاکستان کے معمار جناح اب اس فکر میں گم تھے کہ یہ کیسا پاکستان وجود میں آیا ہے۔ اقتدار تو انگریزوں نے ان 'کلب والوں' کے حوالے کر دیا تھا مگر اس کی کوئی ضمانت نہیں تھی کہ یہ طبقہ اسے ہمیشہ سنبھال پائے گا۔ یہ وطن صرف ان لوگوں کا نہیں تھا جو گولف کھیلنے کے خواب دیکھتے تھے، مذہبی حلقے بھی اپنے خواب سجائے بیٹھے تھے۔ یوں پاکستان میں جناح کے گروہ اور علماء کے مابین ایک خاموش کشمکش شروع ہو چکی تھی۔ برسوں تک یہ توازن برقرار رہا، یہاں تک کہ جنرل ضیاء الحق نے ذوالفقار علی بھٹو کو تختہ دار پر چڑھانے کے بعد کھلم کھلا مذہبی ریاست کے قیام کی راہ اپنالی تھی۔ امریکی مہمانوں کے سامنے وہ دلجوئی سے مسکراتے مگر ان کے چہرے کئی تھے اور رخ ہر محفل کا علیحدہ تھا۔

14

# دوراسامہ میں احیاء جناح

''میری اطاعت کرو جب تک میں اللہ اوراس کے رسول کی اطاعت کرتا ہوں۔ اگر میں ان کی نافرمانی کروں توتم پر میری اطاعت واجب نہیں۔''

(مسلمانوں کے خلیفہ اول حضرت ابوبکر صدیق، جب انہیں امت کی قیادت سونپی گئی۔)

''کیا تم ایک بطخ کو دریا سے ڈرا رہے ہو؟''

(یہ کہاوت حسن بن صباح، ''پہاڑوں کے بوڑھے''، اکثر اس وقت دہراتے جب انہیں جان سے مار دینے کی دھمکیاں دی جاتیں۔)

''کابل کے بعد، اسلام آباد!... طالبان! طالبان!''

یہ نعرے 15 مئی 1994 کو لاہور ہائی کورٹ کے باہر مولویوں کے ایک ہجوم نے لگائے۔ وہ دو پاکستانی عیسائیوں سلامت اور رحمت مسیح کے خلاف توہین رسالت کے مقدمے میں دی گئی سزائے موت کے خلاف نظر ثانی کی اپیل کی سماعت کے لیے جمع ہوئے تھے۔

جہاد کیسے ایک ایسی منظم اور مربوط جنگ میں ڈھل گیا جو حکومتوں کی گرفت سے باہر تھی اور جس کا رخ اب براہ راست امریکہ کی طرف ہو چکا تھا؟ وہی امریکہ اور برطانیہ جنہوں نے 1980 کی دہائی میں افغانستان کو سوویت تسلط سے بچایا تھا، اب کیوں اسی سرزمین پر حملہ آور ہو گئے؟ پاکستان کیسے دہشت گرد تنظیموں کا اڈہ بن گیا، جہاں سے جس جگہ بھی دشمن نظر آتا ایک مقدس جنگ چھیڑ دی جاتی؟

ہم دیکھ چکے ہیں کہ مسلمانوں کی افواج نے ہندوستان پر پہلی یلغار گیارہویں صدی کے ابتدائی عشروں میں کی تھی۔ اس وقت ان کا مقصد صرف مالِ غنیمت تھا، اور اچھی طرح سے مال لوٹا بھی۔ یہ سب مشرق وسطیٰ میں صلیبی جنگوں کے آغاز سے کچھ پہلے ہوا۔ ہندوستان کی بے پناہ دولت نے مزید لالچ کو ہوا دی۔ بارہویں صدی کے وسط تک مسلمان دہلی میں قابض ہو چکے تھے۔ پھر ان کا اقتدار مسلسل قائم رہا، کبھی طاقت کے ساتھ، کبھی کمزور پڑ کر، یہاں تک کہ 1857 کی خونریز اور اعصاب شکن جنگ کے بعد برطانیہ نے اسے ہمیشہ کے لیے ختم کر دیا۔ ہندوستان ہمیشہ سے ایک ہندو اکثریتی خطہ تھا۔ مگر مسلم اقتدار صدیوں تک اس سرزمین پر زندہ رہا، کبھی مستحکم اور کبھی لرزاں، آخرکار برطانوی طاقت کے سامنے شکست کھا کر ختم ہوا۔

مسلمانوں کے ردِعمل میں غصہ اور بے چینی دونوں شامل تھیں۔ انیسویں صدی کی جہادی تحریکیں برطانوی قوت نے کچل دی تھیں۔ مگر یہ جذبہ بیسویں صدی کے اوائل میں دوبارہ ابھرا جہاں یہ گاندھی کی قیادت میں ایک وسیع تر قومی تحریک میں ضم ہو گیا۔ گاندھی نے ایک منفرد تجربہ کیا۔ مسلمانوں کو عدم تشدد پر مبنی جہاد کا راستہ دکھایا۔ مگر یہ تجربہ ناکام رہا۔ مسلمانوں کی سیاست نے ایک الگ راستہ اپنایا، اور پھر جلد ہی علیحدگی پسند رخ اختیار کر لیا۔ 1947 میں ہندوستانی مسلمانوں کے ایک طبقے نے اپنے لیے ایک الگ وطن حاصل کر لیا جسے پاکستان کہا گیا۔ آغاز ہی سے پاکستان نے جہاد کو ریاستی پالیسی کا ایک ذریعہ بنا لیا۔

پاکستان ایک ایسا جدید اور جمہوری مسلم ملک بن سکتا تھا جو شاید دنیا کے نقشے پر اپنی الگ پہچان قائم کر لیتا۔ یہ مغلیہ سلطنت کے انہدام کے ملبے سے ابھرا تھا، نوآبادیاتی نظام کی چھلنی سے گزر کر وجود میں آیا تھا۔ ایسا نہیں تھا کہ صرف مغرب یا مشرق وسطیٰ اور مغرب کے مسلمانوں کے نصیب یورپ میں ڈھلے۔ جنوبی ایشیا کے مسلمان بھی اسی عمل سے گزرے۔ البتہ اسرائیل کے قیام نے مغرب وسطیٰ کو بین الاقوامی منظرنامے پر کہیں زیادہ نمایاں کر دیا۔ تاہم دو جنگیں ایک ساتھ شروع ہوئیں، ایک 1947 میں، دوسری 1948 میں، اور دونوں آج تک ختم نہیں ہوئیں۔ مشرق وسطیٰ کے تنازعات پر تو کسی بھی کتاب فروش کی دکان میں درجنوں کتابیں مل جاتی ہیں لیکن برصغیر کے انھی جیسے

خونیں المیوں پر عالمی توجہ کہیں کم رہی ہے۔ مگر حالیہ دو عوامل نے اس رجحان کو بدل دیا ہے۔ اب بھارت اور پاکستان صرف علاقائی تباہی ہی کا خطرہ نہیں رکھتے، بلکہ دنیا کی سب سے بیش قیمت زمینی پٹی (تیل میں بھیگے ہوئے صحراؤں) پر ایٹمی بادل منڈلانے کی صلاحیت بھی رکھتے ہیں۔ اور پاکستان دہشت گرد تنظیموں کی محفوظ پناہ گاہ بن چکا ہے، جہاں ایک ''ریاست کے اندر ریاست'' قائم ہو چکی ہے۔

پاکستان کے سولھویں سربراہ حکومت اور پہلے شخص جنہوں نے اس خطرے کو کھل کر چیلنج کیا وہ تھے صدر (اور جنرل) پرویز مشرف، جنہوں نے 12 جنوری 2002 کو قوم سے خطاب میں اس بات کا اظہار سب سے واضح الفاظ میں کیا۔ انہوں نے مطالبہ کیا کہ پاکستان میں اس ''جہادی ژ ذہنیت'' کا خاتمہ ہونا چاہیے جس نے ملک کو دوسروں سے زیادہ خود کو زخمی کیا ہے۔ انہوں نے انتہا پسند علماء سے کہا کہ وہ معصوم نوجوانوں کو شہادت کے خواب دکھا کر موت کے راستے پر نہ دھکیلیں۔ پاکستان نے دنیا بھر میں ہونے والے جہاد کی کوئی ذمے داری قبول نہیں کی۔ وہ مساجد کو انتہا پسندی کے اڈے نہیں بننے دیں گے، نہ ہی مدارس کو نفرت کے اسکول۔ کلاشنکوف کلچر کا خاتمہ ہوگا۔ انہوں نے اعلان کیا کہ پاکستان کسی مذہبی ریاست میں تبدیل نہیں ہونے پائے گا۔ انہوں نے ان ملاؤں کا مذاق اڑایا جو آرام دہ پجیرو گاڑیوں میں بیٹھ کر جہاد کے وعظ دیتے ہیں۔ انہوں نے مثال دی کہ ایک ملا نے اپنے خود ساختہ ''مقدس جہاد'' کے نام پر اپنے ہاتھوں سے لوگوں کو قتل کیا۔ طالبان اور ان کے پاکستانی حلیف یہ زعم پالتے رہے کہ وہ کوئی ''اسلامی نشاۃ ثانیہ'' برپا کر رہے ہیں، حالانکہ حقیقت یہ تھی کہ وہ ملک کو تشدد اور خونریزی کے ایک گندے دلدل میں دھکیل چکے تھے۔ مشرف نے دوٹوک الفاظ میں اعلان کیا کہ اس ''ریاست کے اندر ریاست'' کا خاتمہ کر کے دم لیں گے۔ پاکستان کی سرزمین سے اب کوئی بھی خواہ کشمیر میں ہو یا دنیا کے کسی اور خطے میں، جہاد کے نام پر کوئی مہم نہیں چلا سکے گا۔ یہ باب اب بند ہو چکا ہے۔

ابتدائی ردعمل میں عسکریت پسند علماء نے مشرف کی باتوں کو مذاق میں اڑا دیا۔ کہا کہ انہیں کچھ معلوم ہی نہیں کہ وہ کیا کہہ رہے ہیں۔ مگر کم از کم ایک پاکستانی جنرل تو یہ طے کر چکا تھا کہ وہ اس ملبے کو سمیٹے گا

جو ایک دیگر جنرل ضیاء الحق نے کھڑا کیا تھا۔ جنرل ضیاء الحق نے 1977 میں اقتدار پر قبضہ کیا تھا۔ اپنے دس سالہ دورِ حکومت میں انہوں نے پاکستان کو اسلامائز کر دیا۔ ان کے بعد کسی بھی حکمران میں یہ ہمت نہیں ہوئی کہ اس میراث کو کھل کر چیلنج کر سکے۔ اب مشرف کو بھی کم از کم اتنا وقت تو درکار تھا کہ وہ اس جہادی میراث کو پلٹ سکے جو افغانستان میں سوویت یونین کے خلاف جہاد کے پردے میں پروان چڑھی تھی۔

امریکہ نے اپنی پہلی افغان جنگ کے دوران یہ سوال اٹھانے کی زحمت ہی نہیں کی کہ اُس کے اصل ''دوست'' کون ہیں۔ اس وقت افغانستان صرف ایک میدانِ جنگ تھا، جبکہ حقیقی محاذ سوویت یونین اور کمیونزم کے خلاف کھلا تھا۔ اب اپنی دوسری افغان جنگ میں وقت ہی بتائے گا کہ امریکہ نے ان قوتوں کو کتنا اور کس حد تک سمجھا ہے جنہیں کبھی حلیف سمجھا گیا۔ لیکن یہ جنگ بھی ایک بڑے عالمی تصادم کی ہی توسیع ہے۔ فرق صرف کرداروں کا ہے۔ اس بار امریکہ وہی کردار ادا کر رہا ہے جو کبھی سوویت یونین کا تھا۔ جنگ کی نوعیت بھی بدل چکی ہے۔ ایک دشمن کھلے میدان میں ہے، دوسرا پردے میں چھپا ہوا۔ 11 ستمبر 2001 کے دہشت گردانہ حملوں میں اگرچہ کوئی ریاست براہ راست ملوث نہیں تھی، مگر یہ حملے ہو چکے تھے۔ اور ان حملوں کے بعد دنیا یکسر بدل گئی تھی۔

اس فکری الجھن کو مزید پیچیدہ بنانے میں اس اصطلاح کا بھی بڑا دخل ہے جو آج کل تقریباً ہر تنازعہ کا عنوان بن چکی ہے، یعنی ''بنیاد پرستی''۔ مغرب میں اکثر لوگ بنیاد پرستی کو ہر خرابی کی جڑ تصور کرتے ہیں۔ لیکن اگر اس سے مراد دین کے بنیادی عقائد پر یقین رکھنا ہے تو پھر دنیا کے نوے فیصد سے زیادہ مسلمان بنیاد پرست کہلائیں گے۔ متبادل اصطلاحیں جیسے ''اسلامسٹ'' بھی کم ابہام پیدا نہیں کرتیں۔ شاید بہتر یہی ہو کہ ''بنیاد پرستی'' کی اصطلاح ہی استعمال کی جائے، مگر اس کے ساتھ یہ وضاحت ضرور ہو کہ اس سے کیا مراد ''نہیں'' ہے۔

مسیحیوں سے اگر یہ پوچھا جائے کہ کیا واقعی وہ یقین رکھتے ہیں کہ حضرت عیسیٰؑ نے پانی کو شراب میں تبدیل کر دیا تھا یا مردہ لاطزر (Lazarus) کو زندہ کیا تھا، تو غالباً ان میں سے اکثر کندھے اچکا کر بات ٹال دیں گے۔ اس کے برعکس، مسلمان اس میں کوئی شک نہیں رکھتے کہ بدر کے میدان میں

اللہ کے فرشتوں نے نبی اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی مدد کی تھی۔ ان کے لیے اللہ ایک زندہ اور حاضر و ناظر خدا ہے جو اتنا ہی حقیقی اور بامعنی ہے جتنا ایک مثالی والد ہو سکتا ہے۔ مسلمان اس بات کو نہیں سمجھ پاتے کہ ایمان اور دہشت گردی کے درمیان وہ خاموش سی نسبت کیوں جوڑی جاتی ہے جو اکثر ایسے مغربی حلقے قائم کرتے ہیں جن کا اپنا ایمان کمزور ہو چکا ہے۔

اسی طرح مسلمانوں کے لیے یہ الزام بھی پریشان کن ہے کہ وہ مغرب یا عیسائی دنیا سے نفرت کرتے ہیں۔ حقیقت یہ ہے کہ مسلمان مغرب یا عیسائیوں سے نہ غیر معمولی نفرت رکھتے ہیں، نہ ہی وہ بدھ مت یا جاپان جیسے غیر مسلم معاشروں سے۔ البتہ مغربی عیسائی دنیا کے خلاف ان کے دلوں میں ایک گہرا اور شدید غصہ ضرور پایا جاتا ہے۔ یہ غصہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی توہین سے پیدا ہوا، متواتر جنگوں نے اسے پروان چڑھایا، اور اسرائیل کے مقابلے میں مسلمانوں کی بے بسی نے اسے مزید شدید کر دیا۔ اسرائیل کو وہ امریکہ کا نمائندہ سمجھتے ہیں اور یہی نظر ان کے اپنے حکمرانوں پر بھی ہے۔ ان کا یقین ہے کہ بیشتر اسلامی ممالک کی حکومتیں امریکہ کی کٹھ پتلی ہیں اور یہ احساس انہیں سب سے زیادہ تکلیف دیتا ہے۔

یہی تضاد جمہوریت کے باب میں بھی دکھائی دیتا ہے۔ اگر امریکہ واقعی جمہوریت کا داعی ہے، تو پھر وہ عرب دنیا کی بادشاہتوں اور سامراجوں کی سرپرستی کیوں کرتا ہے؟ سوویت یونین کے زوال کے بعد سے امریکہ نے جمہوریت کو اپنی مرکزی خارجہ پالیسی قرار دیا ہے، لیکن سعودی عرب جیسے ممالک پر یہ اصول کیوں لاگو نہیں ہوتا؟ واشنگٹن اگر لیبیا میں آزاد انتخابات کا مطالبہ کرتا ہے تو مصر کے لیے یہ اصول کیوں فراموش کر دیتا ہے؟ اس طرح کے دوہرے معیار نے جمہوریت کے تصور کو ہی مشکوک بنا دیا ہے۔ اسلامی دنیا میں جمہوریت کا فقدان نمایاں ہے خواہ وہ ممالک امریکہ کے حامی ہوں یا مخالف۔

حتیٰ کہ پاکستان میں بھی جناح جمہوریت کو پائیدار نہ بنا سکے۔ انھوں نے برطانوی پالیسی کے بکھرے ہوئے دھاگوں سے ایک ریاست کی بنیاد رکھی لیکن وہ دھاگے دراصل جمہوری حقوق کے لیے چلائی گئی تحریک کی بھٹی میں تیار ہوئے تھے۔ پاکستان کا قیام اس نظریے پر عمل میں آیا تھا کہ

جہاں مسلمان اقلیت میں ہوں گے وہاں انہیں انصاف نہیں ملے گا۔ یہ دلیل جناح نے پوری حکمت اور استقامت کے ساتھ استعمال کی اور بالآخر ایک نئی ریاست قائم کی۔ مگر یہ سوال برقرار ہے کہ پھر پاکستان میں جمہوریت کو کیا ہوا؟ دلچسپ بات یہ ہے کہ آج دنیا میں جو مسلمان طویل المدت جمہوری آزادی سے فیضیاب ہیں وہ پاکستان میں نہیں بلکہ بھارت میں رہتے ہیں۔

بھارتی مسلمانوں کو یقیناً مسائل کا سامنا رہا ہے۔ ایک طرف انہیں اپنے آباواجداد کی مبینہ غلطیوں کی سزا ملی تو دوسری طرف مسلم لیگ کی کامیابی کا بوجھ بھی انہی کے کندھوں پر آن پڑا۔ مگر اس کے باوجود وہ دنیا کے واحد مسلم قوم ہیں جنہیں مکمل جمہوری حقوق حاصل ہیں، اور ان کی تعداد اب کم و بیش تیرہ کروڑ سے بڑھ چکی ہے۔ جمہوریت نے ان کے تمام مسائل حل نہیں کیے، بلکہ بابری مسجد کی شہادت یا گجرات کے فسادات جیسے بعض واقعات ان کے زخموں میں مزید نمک چھڑکا۔ تاہم جمہوریت نے انہیں یہ اختیار ضرور دیا کہ وہ حکومتوں اور سیاسی جماعتوں کو اپنے ووٹ سے جوابدہ بنا سکیں۔ 1947 کی علیحدگی کے بعد وہ دوبارہ اُٹھ کھڑے ہوئے اور اب قومی ریاست کی تشکیل میں فعال کردار ادا کر رہے ہیں۔ یہ حقیقت کہ آج بھارت میں کوئی اقلیتی فرد وزیراعظم بننے کی دوڑ میں شامل ہو سکتا ہے، یہ وہی خواب ہے جو جناح نے پاکستان کے لیے دیکھا تھا کہ ایک دن مسلمان اور ہندو سیاسی طور پر مذہب سے ماورا ہو جائیں گے۔ یہ خواب آج بھارت میں حقیقت بن رہا ہے، اس لیے نہیں کہ بھارتی پاکستانیوں سے بہتر ہیں، بلکہ اس لیے کہ ان کا سیاسی نظام بہتر ہے۔ پاکستانی مسلمانوں کے لیے تاحال صرف لمحاتی طور پر آزادی کی لذت چکھنا ممکن ہوا ہے۔

ایسی مختصر شناسائی بھی ان سے زیادہ ہے جتنی مسلمانوں کو دیگر خطوں میں نصیب ہوئی ہے۔ مراکش میں اب بھی ایک بادشاہت ہے۔ تیونس نے فرانسیسی تہذیب کے دلدادہ سخت گیر رہنما حبیب بورقیبہ کی انقلابی روش دیکھی، اور اب ایک جماعتی نظام پر قانع ہے یا شاید راضی نہیں ہے۔ الجزائر نے آزادی کے بعد ایک روشن خیال آمرانہ حکومت کے سائے تلے پہلا تجربہ کیا، پھر ناکام انتخابی تجربات سے گزرتے گزرتے فوجی آمریت تک جا پہنچا۔ سوڈان کبھی قرآنی قانون کے زیراثر کبھی کرنل جعفر نمیری جیسے طاقتور آمروں کے تسلط میں ڈگمگاتا رہا، اور آخرکار ایک ایسے آمرانہ نظام پر

رک گیا جو نظریاتی ضرورتوں کے تحت خود کو قائم رکھے ہوئے ہے۔ لیبیا اور مصر دونوں میں زوال پذیر بادشاہتوں کو فوج نے ہٹایا۔ جمال عبدالناصر سے مصر کو ایک نئی امید کی کرن نظر آئی اور معمر قذافی سے لیبیا کو ایک ''سبز کتاب'' حاصل ہوئی لیکن دونوں اپنے عوام کو جمہوریت دینے میں ناکام رہے۔

شام اور عراق آج بھی بعثی ریاستیں کہلاتی ہیں، اگرچہ یہ اصطلاح اب اپنی معنویت کھو چکی ہے۔ ''بعث'' ایک قرآنی لفظ ہے جس کا مطلب ہے از سر نو حیات۔ مائیکل عفلق جو ایک یونانی آرتھوڈوکس عیسائی تھے، وہ یقین رکھتے تھے کہ اسلامی عرب سوشلسٹ قوم پرستی، شاہوں اور امراء کے روایتی اسلام کو چیلنج کرے گی اور یورپ کو اس ابھرتی طاقت سے خوف زدہ کر دے گی۔ عفلق کی عرب قوم پرستی تمام فرقوں، شیعہ، سنی، دروز اور عیسائی کے لیے کشادہ تھی مگر ریاستی طاقت ایک ہی جماعت کے ہاتھ میں سمٹ گئی۔ یہ جماعت بھی اب ایک ہی خاندان کی حکمرانی تک محدود ہو چکا ہے۔ مساوات کے علمبردار عفلق کو اندازہ نہیں تھا کہ وہ پرانے سلاطین کی جگہ نئے سلاطین لے آئیں گے اور وہ بھی کسی خاص وقار کے بغیر۔ وہی فرقے جنہیں وہ متحد کرنے کا خواب دیکھ رہے تھے، لبنان میں ایک دوسرے کے خلاف خونی جنگوں میں الجھ گئے۔

اردن ایک نسبتاً آزاد خیال مملکت ہے جو ہاشمی خاندان کو اس وقت سونپی گئی تھی جب عربیہ پر آل سعود کا قبضہ تسلیم کر لیا گیا تھا۔ اپنے اختلافات کے باوجود ہاشمی اور سعودی دونوں جانتے ہیں کہ ان کے شاہی اقتدار کے اصل محافظ کون ہیں۔ یہی تحفظ خلیجی امرا کو بھی حاصل ہے۔ یہ تمام شاہی خاندان جن پر ان لوگوں کی حقارت بھری نظر ہے جنہوں نے امریکہ کے خلاف جہاد کا علم اٹھا رکھا ہے۔ یمن ایک چھوٹا سا جمہوریہ ہے جس کی اپنی آزاد روایات ہیں مگر یہاں بھی انتخابات میں 93 فیصد کامیابیوں کے نتائج آتے ہیں۔

حجاز کی وہ سرزمین جو نبی کریم ﷺ کا وطن اور اسلام کا مرکز ہے، اسے سامراجی برطانوی افسروں اور غلبہ پسند عناصر نے اپنے تنخواہ دار خاندان کے سپرد کر دیا۔ آل سعود نے اس ملک کو اپنی ملکیت بنا لیا۔ تاریخ میں کہیں ایسا واقعہ نہیں ملتا کہ کسی ملک کا نام کسی خاندان کے نام پر رکھا گیا ہو۔ عربیہ کبھی ''سعودی'' نہیں تھا، یہ تو آل سعود کے قبضے کے بعد ہی ہوا۔ آج کے عرب حکمران یہ سمجھتے ہیں کہ تیل

کی دولت میں سے تھوڑا بہت بانٹ کر وہ اپنے عوام کی وفاداری خرید چکے ہیں، ایسی وفاداری جس میں اکثر ان کی لالچ، شاہ خرچی اور بدترین بدعنوانی کو بھی برداشت کرنا شامل ہوتا ہے۔لیکن انسان صرف ایئر کنڈیشنر پر زندہ نہیں رہ سکتا، چاہے وہ سعودی عرب ہی کیوں نہ ہو۔

افغانستان میں ایک نرم مزاج بادشاہ کی جگہ رفتہ رفتہ سخت گیر آمروں کا راج قائم ہوا۔ پھر طالبان آئے جن کی سب سے ہولناک دہشت گردی خود افغان عوام کے خلاف تھی، خاص طور پر خواتین کے خلاف۔ بنگلہ دیش میں فوجی وردیوں میں ملبوس قاتلوں نے جمہوریت کے وعدے کو خون میں نہلا دیا۔مگر طویل خونریزی اور فوجی حکمرانی کے بعد ملک نے بالآخر حقیقی انتخابات کی راہ اپنالی۔اس سے یہ ثابت ہوا کہ اسلام اور جمہوریت کے درمیان کوئی بنیادی تضاد نہیں ہے۔تضاد تو ان اشرافیہ کے ساتھ ہے جنہوں نے مسلم ممالک کو اپنے کھلونوں میں بدل رکھا ہے۔

ملیشیا میں عملی طور پر ایک جماعتی نظام قائم ہے، اور انڈونیشیا میں ابھی حال ہی میں عوام کو ووٹ ڈالنے کا حق ملا ہے۔ برونائی محض ایک خاندانی جاگیر ہے۔ افریقی مسلم ممالک خواہ وہ کسی مذہب یا قبیلے سے ہوں، آج تک اپنے عوام کو ایک مستحکم جمہوریت فراہم نہیں کر سکے۔

وسطی ایشیا کے مسلم ممالک نے اگرچہ سوویت یونین سے آزادی حاصل کر لی ہے، مگر اپنے رہنماؤں کو اب بھی 99 فیصد ووٹوں سے منتخب کرنے کا پرانا انداز نہیں بدلا ہے۔البانیہ گویا کہیں کھو گیا ہے۔ ترکی اب بھی یورپ کے دروازے پر دستک دے رہا ہے، وہاں جمہوریت کی ریڑھ کی ہڈی فوج کے ہاتھ میں ہے۔اگرچہ یہ ایک تضاد سا لگتا ہے۔

ایران میں نوآبادیاتی طاقتوں نے شاہ کو مسلط کیا تھا۔ پچاس کی دہائی کے ابتدائی برسوں میں ایران نے آزادی کا خواب دیکھا، لیکن سی آئی اے کو یہ خواب پسند نہیں آیا۔شاہ مختصر جلاوطنی کے بعد واپس آیا اور برسوں ملک پر قابض رہا۔آخر کار آیت اللہ خمینی نے اس قدیم تہذیب کو بیدار کیا۔ایک مومن اور صاحب فکر رہنما کے طور پر آیت اللہ خمینی نے جدید اسلامی تاریخ میں دو نئی راہیں پیدا کیں۔ انہوں نے اسلام کو ایسے غیر روایتی ذرائع سے قوت دی جن کے ذریعے لوگ اپنی حکومتوں کو نظر انداز کرتے ہوئے اپنا جہاد خود منظم کر سکیں۔اور انہوں نے ایک جدید اسلامی ریاست کی بنیاد ڈالنے کی

سنجیدہ کوشش کی جس کے اصول علماء کی نگرانی میں محفوظ رہیں۔اس نظام نے ایک محدود سی جمہوری فضا پیدا کی۔ یہ گنجائش شاہ رضا پہلوی کے آمرانہ دور کے مقابلے میں بہر حال زیادہ تھی،لیکن اس کو مکمل جمہوریت سمجھ لینا بھی غلط ہوگا۔ یہ تجربہ قائم تو ہے مگر آج تک اس نے وہ نتائج نہیں دیے جو تصور میں رکھے گئے تھے۔ایران نے آٹھ برس تک جہاد کیا،اسرائیل کے خلاف نہیں بلکہ ایک دوسرے مسلم ملک،عراق کے خلاف۔ایران اور عراق دونوں نے اپنے نوجوانوں کو یہ یقین دلایا کہ اگر وہ اس جہاد میں جان دے دیں گے تو جنت میں ایک آسمانی گھوڑے کی پشت پر سوار ہو کر جائیں گے۔

اس کے مضمرات کیا ہیں؟ جب عوام کو اپنے ہی ملک کے معاملات میں آواز نہیں ملتی تو وہ اظہار کے دوسرے راستے تلاش کرتے ہیں۔ ہر مسلمان دو شناختوں میں جیتا ہے:ایک قومی شناخت کا دائرہ اور دوسرا امت کا دائرہ۔قومی تشخص ایک ایسے عالم گیر دین کے عقیدے کے ساتھ وابستہ ہوا ہے جو ایک منفرد تاریخ پر فخر کرتا ہے اور ایسی جذباتی وابستگیاں رکھتا ہے جو قومی سرحدوں سے ماوراہوتی ہیں۔

مایوسی کے عہد میں ایک ایسے ہیرو کی ضرورت اور بھی شدید ہو جاتی ہے جو امت کو وحدت کے احساس اور فتوحات کی امید دے سکے۔آج کا منظر نامہ کچھ ایسا ہی ہے جیسا کہ ایک ہزار برس پہلے تھا جب صلیبیوں نے یروشلم فتح کر کے فلسطین کے قلب میں طاقتور عیسائی ریاستیں قائم کر لی تھیں،تقریباً اسی سرزمین پر جہاں آج اسرائیل واقع ہے۔اس وقت زنگی،نورالدین اور سب سے بڑھ کر صلاح الدین ایوبی کی قیادت نے مسلمانوں کو اس ذلت سے نکالا تھا۔مگر آج ایسا کوئی ہیرو افق پر دکھائی نہیں دیتا۔ایسی مایوسی ایک ایسی زمین بن جاتی ہے جہاں غیر روایتی کردار ابھرتے ہیں جو خود پر اور اپنے مخصوص تصور دین پر غیر متزلزل یقین رکھتے ہیں۔

اسامہ بن لادن بھی اسی روایت سے وابستہ ایک اور مشہور نام ہے جو ہمیں گیارہویں صدی کے حسن بن صباح کی یاد دلاتا ہے، وہی ''بوڑھا پہاڑی آدمی'' جس کے نام سے انگریزی زبان میں assassin کا لفظ پیدا ہوا۔ان کی پیدائش کا سال معلوم نہیں البتہ 1124ء میں ان کا انتقال ہوا اور شاید یہی شہرت کی معراج ہے۔وہ ایران کے شہر قم کے ایک شیعہ خاندان میں پیدا ہوئے اور جوانی میں مسلسل سفر کرتے اور مختلف آقاؤں کی خدمت کرتے رہے۔ 1090ء میں انہوں نے اپنے

عسکری نظریے کا مستقل مرکز قلعہ الموت میں قائم کیا جو البرز کے پہاڑوں میں ایک بلند چٹان پر ایک زرخیز وادی کے اوپر واقع تھا۔ اس کے بعد وہ 34 برس تک اس قلعے سے نیچے نہیں اترے یہاں تک کہ وفات پا گئے۔ وہیں سے انہوں نے مبلغین اور دہشت گردوں کا ایک ایسا نیٹ ورک قائم کیا جو اپنے زمانے کی سب سے خوفناک قوت بن گیا۔ ایک صدی سے زیادہ عرصے تک یہ فرقہ جسے حشیشین کہا جاتا تھا، صلیبی عیسائیوں اور ان عرب امیروں دونوں کے دلوں میں دہشت بٹھائے رہا جنھوں نے عیسائیوں کی فتوحات کا راستہ ہموار کیا تھا۔

حسن بن صباح اپنے مقصد کے شہیدوں سے جنت کا وعدہ کرتا تھا، غالباً چالاکی سے حشیش کے ذریعے انہیں اس کا ذائقہ چکھا کر۔ اسی سے hashishin اور پھر assassin کا لفظ بنا۔ انہوں نے خودکش کارروائیوں کی حکمت عملی کو اس قدر مہارت سے فروغ دیا کہ ان کی تنظیم کی رازداری ضرب المثل بن گئی۔ یہاں تک کہ صلاح الدین ایوبی جیسے سلطان بھی اس بات پر یقین نہیں کر سکتے تھے کہ کہیں ان کے اپنے محافظ ہی قاتل نہ ہوں جو اپنے آقا کے اشارے کے منتظر ہوں۔

صلاح الدین پر ان قاتلوں نے دو بار حملے کیے۔ پہلی بار 75–1174 کے جاڑے میں جب وہ حلب کا محاصرہ کر رہے تھے اور دوسری بار 22 مئی 1176 کو جب یہ لوگ سپاہیوں کا بھیس بدل کر خنجر لے کر ان پر ٹوٹ پڑے۔ اس کے بعد صلاح الدین نے سخت حفاظتی انتظامات کے بغیر سونا ترک کر دیا اور صرف ان افراد کو اپنے قریب آنے کی اجازت دی جو ان کے قریبی اور شناسا تھے۔ جب کبھی حسن بن صباح کو اپنی زندگی کے کسی خطرے کی اطلاع ملتی تو وہ قہقہہ لگا کر کہاوت دہراتا کہ ''کیا تم ایک بطخ کو دریا سے ڈرا رہے ہو؟''

اس فرقے کی سب سے بڑی کامیابی اس وقت حاصل ہوئی جب رچرڈ دوم کی صلیبی جنگ ایک نازک موڑ پر تھی۔ یہ کارروائی نہایت چابک دستی اور منصوبہ بندی کے ساتھ کی گئی جو بے مثال طریقے سے انجام پائی۔ دو قاتل عیسائی راہبوں کا بھیس بنا کر یروشلم کے بادشاہ مارکوئیس کونراڈ آف مونٹفرات کے دربار میں اس وقت شامل ہو گئے جب وہ شہر صور (Tyre) میں تھا۔ اس کے مکمل اعتماد کو جیتنے کے بعد 28 اپریل 1192 کو اسے قتل کر دیا۔ یہ اپنے وقت کا ''نائن الیون'' تھا۔ ان

قاتلوں نے اس زخم میں نمک اس وقت چھڑکا جب انہوں نے یہ ''اقرار'' کرلیا کہ اس قتل کے پیچھے رچرڈ دوم کا ہاتھ تھا۔

تاہم جب عرب قیادت نے صلاح الدین کی فتوحات کو تحفظ دیا تو قاتلوں کی یہ رومانویت بھی ماند پڑ گئی۔ جب مسلمانوں کو صلاح الدین جیسا رہنما مل گیا تو دہشت گردی کی ضرورت باقی نہ رہی۔ یہ تحریک رفتہ رفتہ گمراہی کی حدود میں داخل ہوگئی اور بالآخر ہلاکو خان کے ہاتھوں بکھر کر صفحۂ ہستی سے مٹ گئی۔ (یہ گم نامی میں ہی پھلی پھولی۔ آج کے آغا خان جو اسماعیلی فرقے کے سربراہ ہیں، اسی ''بوڑھے پہاڑی آدمی'' کی نسل سے ہیں۔)

شاید اس قصے میں ہمارے دور کے لیے بھی ایک سبق پوشیدہ ہو۔ جب صلاح الدین ایوبی نے رچرڈ دوم کے خلاف جہاد کا علم بلند کیا تھا تو اس کی صدا ہندوستان تک جا پہنچی تھی۔ آج بھی عوام کا جوش و ولولہ کم نہیں ہے مگر صلاح الدین جیسا کوئی رہنما کہیں نظر تو آئے۔ صدام حسین جیسے آمر عوام کی محرومی سے جنم لینے والے غصے کو کسی اور طرف موڑنے کے لیے استعمال کرتے ہیں۔ بیشتر مسلمانوں کے خیال میں امریکہ صرف ان آمروں کا تختہ پلٹتا ہے جو واشنگٹن کے مفادات سے ٹکرا جائیں۔ گویا فیصلہ ہمیشہ امریکی مفاد کے تابع ہوتا ہے، مسلمانوں کے مفاد کے نہیں۔ اس کی سب سے نمایاں مثال آل سعود کی بادشاہی ہے جو واشنگٹن کی وفادار حکمرانی کا روشن نمونہ بنی ہوئی ہے۔ ''بادشاہ'' ان کا سب سے اہم لقب نہیں ہے بلکہ وہ ''خادم الحرمین الشریفین'' بھی کہلاتے ہیں۔ تاہم بہت سے مسلمانوں کے نزدیک آل سعود درحقیقت امریکی تیل کے محافظ ہیں۔

مئی 1932 میں ایک امریکی اور ایک برطانوی ایجنٹ وخفیہ اہلکار نے لندن کے اسٹرینڈ پر واقع سمپسن ریسٹورنٹ میں دوپہر کا کھانا کھایا امریکی تھا فرانسس بی لومس، جو صدر تھیوڈور روزویلٹ کے دور میں نائب وزیر خارجہ رہ چکا تھا اور اُس وقت اسٹینڈرڈ آئل کمپنی آف کیلیفورنیا (سوکال) کا امور خارجہ کا مشیر تھا۔ اس نے ہیری سینٹ جان بریجر فلبی کو مدعو کیا تھا، جو انہی دنوں سعودی عرب سے لوٹا تھا۔ اس وقت سعودی عرب کی مالی حالت خستہ تھی۔ آمدنی مسلسل کم ہو رہی تھی اور عبدالعزیز بن سعود کے شاہی اخراجات بڑھتے جا رہے تھے۔ فلبی کے بقول (اگرچہ وہ ایک ناقابل اعتبار

راوی تھا) عرب کے تمام تیل کے معاہدے محض ایک ملین ڈالر کے عوض کسی کو بھی دیے جا سکتے تھے۔

1928 میں امریکی، برطانوی، ڈچ اور فرانسیسی تیل کی کمپنیوں نے سلطنت عثمانیہ کے مفتوحہ علاقوں میں تیل کے حقوق آپس میں تقسیم کر لیے۔ ان میں اسٹینڈرڈ آئل کمپنی آف نیو یارک (جو آج موبل کہلاتی ہے)، اسٹینڈرڈ آئل کمپنی آف نیو جرسی (ایکسون)، اینگلو پرشین (جو اب برٹش پیٹرولیم یعنی بی پی ہے)، رائل ڈچ شیل اور فرانسیسی کمپنی 'کمپنی فرانسیز دی پٹرول' (Compagnie Francaise des Petroles) شامل تھیں۔ سوکال (اسٹینڈرڈ آئل کمپنی آف کیلیفورنیا) اس کارٹیل میں شامل نہیں تھی، لیکن اس نے بحرین میں تیل کی تلاش شروع کر دی تھی اور یکم جون 1932 کو اسے کامیابی ملی۔ 1932 میں لندن کے اس دوپہر کے کھانے کے ایک سال کے اندر اندر سعودی حکومت سے معاہدے کی شرائط طے پا گئیں۔ ابتدائی طور پر 30 ہزار پاؤنڈ سونے میں بطور قرض دیے گئے، اگلے اٹھارہ ماہ میں مزید 20 ہزار پاؤنڈ ادا کرنے تھے اور سالانہ کرایہ 5 ہزار پاؤنڈ طے ہوا۔ 25 اگست 1933 کو سوکال نے نیدرلینڈز ٹریڈنگ سوسائٹی کے منیجر کے دفتر کی میز پر 35 ہزار سونے کے سکے گن کر رکھے۔ اس کے بدلے انہیں برطانیہ کے رقبے سے چار گنا بڑے علاقے میں تیل کی تلاش کے حقوق مل گئے۔ مزید ایک لاکھ پاؤنڈ ادا کر کے نجد اور کویت کے نیوٹرل زون میں بھی حقوق حاصل کیے۔ سال کے آخر تک امریکی کارکن الاحساء (Hasa) علاقے میں پہنچ چکے تھے۔ ان کے ساتھ کرینیں، فولادی ڈھانچے، گاڑیاں، ٹرک، بجلی کے پنکھے، شاور اور مغربی طرز کے بیت الخلا بھی آ گئے۔ آگے کی کہانی تو سب کو معلوم ہے۔ مارچ 1938 تک دمام نمبر 7 کے کنویں سے روزانہ تقریباً چار ہزار بیرل تیل نکل رہا تھا۔ 18 فروری 1943 کو امریکی صدر فرینکلن ڈی روزویلٹ نے انڈر سیکریٹری آف اسٹیٹ ایڈورڈ اسٹیٹنس کے نام ایک ایگزیکیٹو آرڈر نمبر 8926 جاری کیا جس میں امریکہ کی پالیسی کی وضاحت ان الفاظ میں کی گئی "میں یہ تسلیم کرتا ہوں کہ سعودی عرب کا دفاع ریاست ہائے متحدہ امریکہ کے دفاع کے لیے ناگزیر ہے۔" حکومت سعودی عرب کو قرض و امداد کی سہولتیں مہیا کر دی گئیں۔ برطانیہ بتدریج پس منظر میں چلا گیا۔ امریکی فوجی دستے ظہران میں تعینات کر دیے گئے۔ واشنگٹن اور ریاض کے درمیان باہمی انحصار کی بنیاد پڑ چکی تھی۔

پیغمبر اسلام کا ایک قول ہے جو ان مسلمانوں کو ضرور معلوم ہوگا جنہوں نے اپنے دین کی بنیادی تعلیمات حاصل کی ہیں: ''اگر کوئی امام اپنی رعایا کی حفاظت نہ کرے تو اسے جنت کی خوشبو بھی میسر نہیں ہوگی۔'' حضرت ابوبکر صدیق نے خلافت کا بار سنبھالتے ہی پہلے خطبے میں کہا تھا کہ ''مجھے تم پر امیر بنایا گیا ہے حالانکہ میں تم میں سب سے بہتر نہیں۔ اگر میں اچھا کروں تو میری مدد کرو، اور اگر برائی پر چلوں تو مجھے سیدھی راہ دکھاؤ۔ جب تک میں اللہ اور اس کے رسول کی اطاعت کروں، تم بھی میری اطاعت کرو، اور اگر میں اللہ اور اس کے رسول کی نافرمانی کروں تو تم پر میری اطاعت لازم نہیں۔''

خلافت عثمانیہ کے چوبیس خلفاء میں سے تیرہ کو شیخ الاسلام کے فتوے کے ذریعے معزول کر دیا گیا تھا کیونکہ ان پر یہ فتویٰ صادر ہوا کہ وہ مسلمانوں کی حفاظت کے اہل نہیں رہے اور اللہ کی راہ سے غافل ہو چکے ہیں۔ اسلامی شریعت نے اختلاف رائے کی گنجائش رکھی ہے اور اس کے ازالے کے لیے راستے بھی چھوڑے ہیں۔ سعودی عرب میں اس اختلاف کو دبایا جا سکتا ہے لیکن اس کی بازگشت پھر بھی سفر کرتی رہتی ہے۔ علماء کا ایک حلقہ اکثر تبدیلی کی آواز بن جاتا ہے۔ سعودی حکومت مذہبی سرگرمیوں پر فیاضی اسی لیے برتتی ہے تاکہ علماء کو خوش رکھا جا سکے۔ مگر یہ تدبیر ہمیشہ کامیاب نہیں ہوتی۔ جب امریکہ القاعدہ اور طالبان کے خلاف جنگ میں مصروف تھا، اسی دوران سعودی حکام نے ایک معمر، نابینا، 80 سالہ جلیل القدر عالم، شیخ حمود بن عقیلہ الشعیبی کو طلب کر کے اُن سے پوچھا کہ کیا واقعی انہوں نے شاہی خاندان کے خلاف فتویٰ دیا ہے؟ شیخ حمود نے سادہ سا جواب دیا کہ ''جو کافر کے ساتھ مل کر مسلمانوں کے خلاف ہو، وہ خود بھی کافر ہے۔''

نبی اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا تھا کہ ''عرب میں دو دین جمع نہیں ہوں گے۔'' لیکن آل سعود نے اس فرمان میں یہ اضافہ کر دیا ہے کہ اب سعودی عرب میں دو رائے بھی نہیں ہوں گی۔

دوسری جنگ عظیم کے بعد جیسے ہی برطانیہ کی عالمی بالادستی زوال پذیر ہوئی اور امریکہ نے اس کی جگہ سنبھالی، غصہ بھی پرانی نوآبادیاتی طاقت سے نکل کر امریکی نوآبادیاتی نظام پر منتقل ہو گیا۔ اسرائیل کے قیام کے بعد اس تنازعے میں تینوں توحیدی مذاہب، یعنی یہودیت، عیسائیت اور اسلام، الجھ گئے۔ یہ تہذیبوں کے تصادم کی جنگ کم ہے اور سیاسی اثر و رسوخ، معاشی طاقت اور مذہبی اختلافات

سے ابھرتی ہوئی قومی وقار کی لڑائی زیادہ ہے۔ مسلمانوں کا گزری ہوئی عظمت کے کھو جانے پر جو کرب ہے وہ یہودیوں کے دو ہزار سالہ جلاوطنی کے بعد دوبارہ ابھرنے والی توانائی سے واضح طور پر متصادم ہے۔ مسلمانوں کے لیے یہ ضروری سا ہو گیا کہ اپنی کوتاہیوں کا الزام کسی اور پر ڈالیں اور اس کردار کے لیے امریکہ سے زیادہ موزوں کوئی نظر نہیں آیا۔

برصغیر کے مسلمانوں نے تو 1930 کی دہائی میں اپنا ''صلاح الدین'' تلاش کر لیا تھا، اگرچہ وہ خود اس مثال سے گریز کرتے۔ 421 صفحات پر مشتمل بانی پاکستان کی سب سے جامع انگریزی سوانح عمری اسٹینلے وولپرٹ کی کتاب Jinnah of Pakistan میں ''صلاح الدین'' کا ذکر تک نہیں ملتا۔ جناح روایتی اسلامی تاریخ کے ہیروز پر یقین نہیں رکھتے تھے۔ اگر ان کے لیے کوئی ماڈل تھا تو وہ مصطفیٰ کمال اتاترک تھا، وہ ترک رہنما جس نے خلافت کو ختم کر کے ایک نئی قوم پرستی کی بنیاد رکھی۔

آخر وہ کون سا مقام تھا جب ہندوستان میں مسلمان ''اقلیت'' بن گئے؟ یہ سوال محض خطیبانہ ہے کیونکہ برصغیر میں مسلمان ہمیشہ ہی عددی اعتبار سے اقلیت رہے ہیں۔ البتہ بنگال میں ہونے والے وسیع قبول اسلام کے بعد ہندوستان دنیا میں سب سے بڑی مسلم آبادی کا حامل خطہ بن چکا تھا۔ یہ اکثریت بنیادی طور پر ہندو ذات پات کے نظام کے نچلے طبقوں سے اسلام کے مساوات کے پیغام کی طرف راغب ہو کر آئی تھی۔ لیکن اپنی طویل موجودگی کے دوران مسلمانوں نے کبھی کوئی علیحدہ مسلم سلطنت یا کوئی ایسا صوبہ نہیں مانگا تھا جو صرف ان کے لیے مخصوص ہو۔ نہ ہی کبھی انہیں ہندوؤں سے کسی حفاظتی بندوبست کی ضرورت محسوس ہوئی۔

پھر یہ کس موڑ پر ہوا کہ وہ ''اقلیت'' بن گئے؟ اس کا آغاز مغلیہ سلطنت کے زوال اور 1857 کی شکست کے بعد قدیم مسلم اشرافیہ کے بکھرنے سے ہوا۔ اقتدار کی زبان فارسی سے انگریزی میں بدل گئی۔ اقتدار کے ڈھانچے اس طرح ترتیب دیے گئے جو برطانوی مفادات کے موافق ہوں۔ انتخابات جیسے نئے تصورات متعارف ہونے لگے۔ اس وقت انتخابات کا مکمل فہم پیدا ہونا تو دور کی بات کوئی یہ بھی نہیں جانتا تھا کہ آخر یہ ''ووٹ'' نام کا کونسا جانور ہے اور چلے گا، دوڑے گا یا اسے کھلانے والے کے ہاتھ کو واپس مڑ کر ڈنک مار دے گا۔

تاہم جب جناح نے اپنے لیے ایک ''وطن موعود'' حاصل کرلیا تو وہ اس شخصیت سے بالکل مختلف نظر آنے لگے جو یہ انعام جیت کرلائے تھے۔ 11 اگست کو قانون ساز اسمبلی کے افتتاحی اجلاس میں ان کی تقریر میں بے چینی چھپی ہوئی تھی۔ اگرچہ وہ اس بات پر مصر تھے کہ تاریخ تقسیم کو درست ثابت کرے گی مگر اب وہ اس فتح پر مطمئن دکھائی نہیں دیتے تھے۔ انہوں نے کہا کہ ''متحدہ ہندوستان کا کوئی تصور کامیاب نہیں ہوسکتا تھا۔ میری رائے میں اگر یہ ہوتا تو ہم ایک زبردست تباہی کی طرف چلے جاتے۔ شاید میرا یہ نقطہ نظر درست ہے، یا نہیں ہے، یہ تو وقت ہی بتائے گا... شاید!''

انہوں نے دستور ساز اسمبلی میں کہا کہ پاکستان اس وقت کامیاب ہوگا جب اس کی قیادت عوام، خصوصاً غریبوں کی فلاح و بہبود کے لیے کام کرے گی اور ماضی کی تلخیوں کو دفن کر کے اس بات کو یقینی بنائے گی کہ ہر شہری کو برابر کے حقوق، مراعات اور ذمہ داریاں حاصل ہوں۔ انہوں نے کہا کہ ''خواہ وہ کسی بھی طبقے سے تعلق رکھتا ہو، چاہے اس کے ماضی میں آپ سے کیسے ہی تعلقات رہے ہوں، چاہے اس کا رنگ، ذات یا عقیدہ کچھ بھی ہو، وہ پہلے، بعد میں اور آخر میں صرف اس ریاست کا شہری ہے جس کے مساوی حقوق، مراعات اور ذمہ داریاں ہیں۔ اگر آپ نے یہ اصول اپنا لیا تو آپ کی ترقی کی کوئی حد نہیں رہے گی۔ آپ آزاد ہیں، آپ اپنے مندروں میں جانے کے لیے آزاد ہیں، اپنی مسجدوں میں جانے کے لیے آزاد ہیں، یا پاکستان کی اس ریاست میں کسی بھی عبادت گاہ میں جانے کے لیے آزاد ہیں۔ آپ کا تعلق کسی بھی مذہب، ذات یا عقیدے سے ہو، ریاستی امور کو اس سے کوئی لینا دینا نہیں ہوگا۔''

انہوں نے اس بات پر بار بار زور دیا کہ ''ہم اس بنیادی اصول کے ساتھ آغاز کر رہے ہیں کہ ہم سب ایک ریاست کے شہری ہیں اور مساوی شہری ہیں۔'' پھر انہوں نے ایک حیران کن بات کہی کہ ''میرا خیال ہے کہ ہمیں اسے اپنے سامنے ایک نصب العین کے طور پر رکھنا چاہیے، اور وقت کے ساتھ آپ دیکھیں گے کہ ہندو ہندو نہیں رہیں گے اور مسلمان مسلمان نہیں رہیں گے۔ میرا مطلب مذہبی اعتبار سے نہیں ہے کیونکہ مذہب ہر شخص کا ذاتی معاملہ ہے، بلکہ ریاست کے شہری ہونے کی حیثیت سے سیاسی اعتبار سے...'' لیکن اس بات کا کوئی مطلب نہیں لگ رہا تھا کیوں کہ یہی بات تو گاندھی بھی

کہہ سکتے تھے۔

1947 سے پہلے ہندوستان میں جناح اپنا موقف ثابت کر چکے تھے۔ پاکستان کا المیہ یہ تھا کہ 1947 کے بعد وہ یہ موقف ہار گئے۔ یہیں سے پاکستان کا انتظامی انتشار، من مانی حکومت اور آمرانہ روش کی ابتدا ہوئی جس سے شدت پسند تنظیموں کو پنپنے کا موقع ملا۔

علماء نے آغاز ہی سے اسلامی حکومت کا نعرہ بلند کر دیا۔ ان کا مؤقف تھا کہ چونکہ پاکستان اس لیے قائم ہوا کہ اسلام خطرے میں تھا، تو اب اسلام کو خطرے سے بچانے کا واحد طریقہ اسلامی حکومت ہی ہے۔ مگر جناح اس تصور کو سختی سے رد کرتے تھے۔ وہ ''مذہبی حکومت کے (Theocratic) نظام'' کو حقارت سے دیکھتے تھے، لیکن بیماری کے ہاتھوں نڈھال، ان کی صحت تیزی سے روبہ زوال تھی۔ 11 ستمبر 1948 کی رات 10 بج کر 20 منٹ پر کراچی میں وہ خاموشی سے رخصت ہو گئے۔ ان کا جسد خاکی جو صرف ستر پاؤنڈ رہ گیا تھا، اگلے روز سپرد خاک کر دیا گیا۔ ان کے اصول بھی زیادہ دیر زندہ نہیں رہ سکے۔

ان کے جانشین وزیراعظم لیاقت علی خان نے 7 مارچ 1949 کو دستور کی قراردادِ مقاصد پیش کی، جس میں کہا گیا کہ پاکستان کی حاکمیت اللہ کے پاس ہے۔ تاہم جناح کا وژن اس قرارداد پر غالب تھا، جو پانچ روز کی بحث کے بعد منظور ہوئی۔ اس میں جمہوریت، آزاد عدلیہ، آزادی، مساوات اور اقلیتوں کے حقوق کا وعدہ شامل تھا۔ افسوس کہ ان میں سے کوئی اصول عملی طور پر نافذ نہ ہو سکا۔

قائد کے بعد ان کے جانشین وزیراعظم لیاقت علی خان نے 7 مارچ 1949 کو دستور ساز اسمبلی میں قرارداد مقاصد (Objectives Resolution) پیش کی، جس میں اعلان کیا گیا کہ پاکستان کی اقتدار اعلیٰ اللہ تعالیٰ کو حاصل ہے۔ اگرچہ اس قرارداد کی بنیاد مذہبی تھی، لیکن اس پر بانئ پاکستان کا جمہوری وژن نمایاں رہا۔ پانچ روز کی طویل بحث کے بعد منظور کی جانے والی اس قرارداد میں جمہوریت، آزاد عدلیہ، انفرادی آزادی، مساوات اور اقلیتوں کے حقوق کا عہد کیا گیا مگر افسوس کہ ان میں سے کوئی اصول عملی طور پر نافذ نہ ہو سکا۔

16 اکتوبر 1951 کو ایک افغان شہری سید خان جس کے بارے میں بعد میں معلوم ہوا کہ وہ سابق برطانوی انٹیلی جنس ایجنٹ تھا، اس نے لیاقت علی خان کو قتل کر دیا۔ اس کے بعد اقتدار کی جنگیں ان چند شہری سیاستدانوں کے درمیان چھڑ گئیں جنہیں ''رہنما'' کہنا دراصل اس لفظ کی توہین تھی۔

جناح کے بعد گورنر جنرل بننے والے خواجہ ناظم الدین استعفیٰ دے کر وزیر اعظم کے منصب پر فائز ہو گئے۔ مالیات کے وزیر غلام محمد جو ایک پنجابی بیوروکریٹ تھے ریاست کے سربراہ بن بیٹھے۔ اپریل 1953 میں اچانک اور بغیر کسی واضح وجہ کے غلام محمد نے ناظم الدین کی حکومت برطرف کر دی، حالانکہ ناظم الدین نے اسمبلی میں اپنی اکثریت ثابت کر دی تھی۔ ایک اور بنگالی محمد علی بوگرا کو وزیر اعظم بنا دیا گیا۔ شاید بنگالیوں کو خوش کرنے کے لیے، یا پھر امریکیوں کو، یا دونوں کو۔ بوگرا نے اس قانون میں ترمیم کی کوشش کی جس کے تحت گورنر جنرل کے پاس حکومت برطرف کرنے کے من مانے اختیارات تھے۔ اس کے جواب میں غلام محمد نے 24 اکتوبر 1954 کو ایمرجنسی نافذ کر دی اور نہ صرف کابینہ بلکہ پوری دستور ساز اسمبلی کو بھی برخاست کر دیا۔ بوگرا نے سمجھوتہ کر لیا، اسمبلی کی تحلیل کو قبول کر لیا اور اپنے عہدے پر برقرار رہے۔ اس کے بعد پاکستان میں پہلی مرتبہ ''کابینۂ ماہرین'' یا ''کیبنٹ آف ٹیلنٹس'' کے نام سے ایک حکومت تشکیل دی گئی۔ یہ ایک ایسا خود ساختہ لقب تھا جو اکثر آمریت پسند حکومتیں اپنے لیے پسند کرتی ہیں۔

اگست 1955 میں اقتدار کی خواہش رکھنے والے ایک وزیر اسکندر مرزا فوج کی حمایت سے گورنر جنرل بن گئے۔ ایک بیوروکریٹ چودھری محمد علی وزیر اعظم مقرر ہوئے۔ بالآخر 29 فروری 1956 کو دستور کا بل منظور ہو گیا۔ پاکستان اسلامی جمہوریہ کہلانے لگا اور گورنر جنرل کا عہدہ صدر میں تبدیل ہو گیا۔ مشرقی پاکستان میں اس پر سخت ناپسندیدگی پائی گئی کیونکہ دستور میں دونوں حصوں کو برابر نشستیں دی گئیں، حالانکہ بنگالیوں کی عددی اکثریت واضح تھی۔ مسلمان ملک میں بھی سب مسلمان برابر نہیں تھے۔ اگلے چند برسوں میں تین اور وزیر اعظم آئے اور چلے گئے۔ ان میں حسین شہید سہروردی بھی شامل تھے، جو واقعی انتخابات کرانے کے حق میں نظر آتے تھے اور مخلوط انتخابی حلقوں کی وکالت بھی کرتے تھے۔ مگر اسکندر مرزا نے 7 اکتوبر 1958 کو مارشل لا نافذ کر کے اور دستور معطل

کر کے ان تمام امیدوں کا خاتمہ کر دیا۔ چند ہی دن بعد فوج نے خود اسکندر مرزا کی امیدوں پر بھی پانی پھیر دیا۔ فوج کے سربراہ، جنرل محمد ایوب خان، چیف مارشل لا ایڈمنسٹریٹر کے طور پر اقتدار میں آ گئے اور عوامی احتجاج کے نتیجے میں مارچ 1969 میں اقتدار جنرل یحییٰ خان کو سونپنے پر مجبور ہوئے۔ یحییٰ خان 1947 کے بعد واحد پاکستانی حکمران تھے جنہوں نے آزادانہ اور منصفانہ انتخابات کرائے۔ شاید انہیں ایسا کرنے کی ضرورت نہیں تھی۔ ان انتخابات کا نتیجہ جنگ اور ایک اور تقسیم کی شکل میں ظاہر ہوا۔ بنگلہ دیش اسی لیے وجود میں آیا کہ مشرقی پاکستانیوں کو مغربی پاکستان کے برابر کا درجہ نہ دیا گیا تھا۔

پاکستان میں تمام سیاسی ہلچل، مارشل لا، آمریتوں اور بے ترتیبیوں کے باوجود ایک پالیسی ایسی رہی جس پر ہمیشہ اتفاق رہا: بھارت کے خلاف کشمیر کے مسئلے پر جہاد۔ ''فاصلے پر رہ کر جہاد'' کی اس حکمت عملی کا آغاز ہوا جس کی مالی امداد اور منصوبہ بندی خفیہ ادارے کرتے تھے۔ یہ آزادی کے محض چند ہفتوں کے اندر شروع ہو چکا تھا۔ یہ عمل بعد میں ایک مستقل اور وسیع طرز عمل بن گیا۔ دلچسپ امر یہ ہے کہ کشمیر کی پہلی جنگ اس وقت شروع ہوئی جب بھارت اور پاکستان کے درمیان کشمیر پر کوئی باضابطہ تنازعہ موجود ہی نہ تھا۔ اس وقت کشمیر بھارت کا حصہ بھی نہ تھا۔

برطانیہ نے 15 اگست 1947 کو ہندوستان چھوڑ دیا تھا مگر بھارت نے آخری وائسرائے لارڈ ماؤنٹ بیٹن کو اپنا پہلا گورنر جنرل برقرار رکھا۔ جناح نے ایسا کوئی مشورہ قبول کرنے سے انکار کر دیا، تاہم پاکستان کی سرکاری مشینری میں کئی اعلیٰ برطانوی افسر اور عہدیدار موجود رہے۔ انہی میں سے ایک سر جارج کننگھم بھی تھے جو شمال مغربی سرحدی صوبے کے گورنر تھے۔ یہ صوبہ قبائلی علاقوں پر مشتمل تھا جو کشمیر اور افغانستان کی سرحدوں سے ملتا تھا۔ سر جارج نے 17 اکتوبر 1947 کی اپنی ڈائری میں لکھا (جسے برائن کلو فلے نے اپنی کتاب A History of the Pakistan Army، اوکسفرڈ یونیورسٹی پریس، کراچی، 1999 میں نقل کیا ہے):

''(میرے عملے کے ایک رکن) مجھے بتایا کہ ہزارہ کے علاقے میں کشمیر کے خلاف جہاد کی ایک حقیقی تحریک ابھری ہے۔ وہاں بندوقیں جمع کی جا رہی ہیں اور مہم کا ایک

باقاعدہ منصوبہ بھی تیار ہو چکا ہے، بظاہر یہ لوگ وادی جہلم کے اس حصے پر قبضے کا ارادہ رکھتے ہیں جو دومیل کے اوپر واقع ہے۔ میں نے جس جس سے ممکن ہو سکا، یہاں تک کہ آفریدی اور مہمند قبائل کو بھی خبردار کر دیا ہے کہ اس قسم کی کسی بھی کارروائی میں شریک نہ ہوں کیونکہ اس کے نتیجے میں بھارت اور پاکستان کے درمیان جنگ چھڑ سکتی ہے۔ فی الحال یہ بات واضح نہیں ہے کہ آیا اس کو جنگ چھیڑنے کا جواز (casus belli) بنایا جا سکتا ہے یا نہیں کیونکہ کشمیر نے ابھی تک کسی بھی ڈومینین کے ساتھ الحاق نہیں کیا۔''

یہی دراصل معاملے کا نچوڑ تھا۔ مسلم اکثریتی ریاست کشمیر پر ایک رنگین مزاج ہندو مہاراجہ ہری سنگھ حکمرانی کرتا تھا جس کا خواب تھا، کہ کشمیر ایک آزاد ریاست بنے۔ مسئلے کی پیچیدگی یہیں ختم نہیں ہوتی تھی۔ مسلمانوں کے سب سے مقبول رہنما شیخ محمد عبداللہ نے مسلم لیگ کی حمایت نہیں کی تھی۔ آزادی کے بعد سرینگر میں اپنے پہلے عوامی جلسے (4 اکتوبر 1947) میں شیخ عبداللہ نے صاف کہہ دیا تھا کہ ''میں نے کبھی پاکستان کے نعرے پر یقین نہیں رکھا۔ میرا پختہ یقین ہے کہ یہ نعرہ ہمارے لیے مصیبت لائے گا۔'' (یاد رہے کہ 46-1945 میں کشمیر میں کوئی انتخابات نہیں ہوئے تھے کیونکہ یہ ایک نوابی ریاست تھی اور باضابطہ طور پر برٹش انڈیا کا حصہ نہیں تھی۔) مہاراجہ ہری سنگھ نے بھارت اور پاکستان دونوں سے ''اسٹینڈ اسٹل ایگریمنٹ'' (عارضی معاہدہ) پر دستخط کیے تھے۔ اس معاہدے کے تحت ریاست کی موجودہ حیثیت کو برقرار رکھا گیا تھا، یہاں تک کہ اس کے مستقبل کا حتمی فیصلہ ہو۔

مگر پاکستان نے مداخلت کی۔ جہاد کی یہ تیاریاں کوئی ڈھکی چھپی بات نہیں تھیں جیسا کہ بعد کی یادداشتوں سے ظاہر ہوتا ہے۔ ایچ وی ہاڈسن اپنی کتاب The Great Divide (ہچنسن، 1969) میں لکھتے ہیں کہ پاکستان کے کمانڈران چیف جنرل سر فرینک میسروی نے وزیراعظم لیاقت علی خان کو اس کاروائی سے باز رہنے کا مشورہ دیا تھا۔ جواہر لال نہرو کو بھی اس سازش کی پوری خبر تھی۔ انہوں نے 27 ستمبر 1947 کو اپنے وزیر داخلہ سردار پٹیل کو خط میں لکھا کہ ''پنجاب اور شمال مغربی سرحدی صوبے میں مسلم لیگ کشمیر میں بڑی تعداد میں داخلے کی تیاریاں کر رہی ہے۔ سردیوں

کی آمد سے کشمیر باقی ہندوستان سے کٹ جائے گا۔ میری معلومات کے مطابق پاکستان کی حکمت عملی یہ ہے کہ اس وقت کشمیر میں سرایت کر جائیں اور جب سردیوں کے باعث کشمیر مکمل طور پر الگ تھلگ ہو جائے تو کوئی بڑی کارروائی کریں۔''

نہرو کی تشویش کے باوجود حکومت ہند اس وقت تک کچھ نہیں کر سکتی تھی جب تک مہاراجہ ہری سنگھ اپنا فیصلہ نہ کر لیتے۔ یہ تذبذب اس وقت ختم ہوا جب 21 اکتوبر 1947 کی رات چھ ہزار کے قریب مسلح قبائلی حملہ آور پاکستان سے سری نگر کی طرف روانہ ہوئے۔ ہری سنگھ کو اس بحران کی خبر 24 اکتوبر کو اس وقت ملی جب ان کے محل کی بجلی گل ہو گئی۔ تب مہورہ کا پاور ہاؤس حملہ آوروں کے قبضے میں آ چکا تھا۔ اگلے روز صبح گیارہ بجے حکومت ہند کی دفاعی کمیٹی کی میٹنگ ہوئی جس کی صدارت لارڈ ماؤنٹ بیٹن نے کی۔ نہرو کو کشمیر کی سلامتی کی فکر تھی اور ماؤنٹ بیٹن کو وادی میں موجود تین سو کے قریب برطانوی شہریوں کی۔ بھارتی فوج کو فوری طور پر ہوائی جہازوں کے ذریعے سری نگر پہنچانے کی تیاری کا حکم دیا گیا۔ ساتھ ہی ایک ایلچی ہری سنگھ کے پاس بھیجا گیا تاکہ الحاق کے معاہدے پر دستخط لیے جائیں جس کے بغیر بھارتی فوج قانونی طور پر مداخلت نہیں کر سکتی تھی۔

بھارتی فوج شاید وقت پر نہیں پہنچ پاتی اور سری نگر ہاتھ سے نکل جاتا مگر غیر متوقع طور پر انہیں مہلت مل گئی۔ حملہ آور جہاد کے لیے بھیجے گئے تھے، لیکن لوٹ مار اور عصمت دری میں لگ گئے۔ سب سے ہولناک واقعہ سینٹ جوزف اسپتال میں سات راہبات کی اجتماعی عصمت دری تھی۔ حملہ آور ابھی تک سری نگر کے باہر ہی تھے کہ سکھ رجمنٹ کی پہلی بٹالین 27 اکتوبر کو پیر کے دن ہوائی اڈے پر اتر گئی۔

آج یہ تنازعہ ایک ایٹمی رخ اختیار کر چکا ہے۔ غیر جمہوری حکومتیں جو اپنی قانونی حیثیت کے لیے کسی بھی سہارے کی تلاش میں رہتی ہیں، ایسے موقعوں کو غنیمت جانتی ہیں۔ پاکستان پر اب تک صرف دو ایسے حکمران طویل عرصے تک مسلط رہے ہیں اور دونوں ہی ایسے جنرل تھے، جنہوں نے تختہ پلٹ کر اقتدار پر قبضہ کیا تھا۔ پہلے فیلڈ مارشل ایوب خان جنہیں ''وسکی جنرل'' کہا جاتا تھا، وہ بھی 1947 کے انداز پر کشمیر میں غیر روایتی فوجی دستے بھیجنے کے وسوسے سے خود کو نہ روک سکے۔ ان کا

1965 کا جہاد بھی نا کام رہا۔ دوسرے جنرل ضیاء الحق تھے جنہوں نے پاکستان کے پہلے منتخب وزیر اعظم ذوالفقار علی بھٹو کو ہٹا کر پھانسی دے دی اور جولائی 1977 سے اگست 1988 تک گیارہ برس تک حکومت کی۔ ضیاء الحق کے ہتھکنڈے اگرچہ بے رحم تھے مگران کا عنوان دینداری تھا۔ انہی کے دور میں پاکستان تھیوکریسی کے قریب آیا، اسامہ بن لادن اسلام کا مجاہد بن کر ابھرا اور ملا عمر نامی ایک شخص سے اس کی دوستی ہوئی۔

ضیاء الحق چاہتے تھے کہ پاکستان کے یوم آزادی کی تاریخ بدل دی جائے۔ وہ سمجھتے تھے کہ اس عظیم موقع کو اسلامی تقویم کے مطابق ستائیسویں رمضان کے دن یاد کیا جانا چاہیے، نہ کہ 14 اگست کو۔ یہ تجویز نظر انداز کر دی گئی۔ تاہم انہوں نے اپنے پہلے ٹیلی ویژن خطاب میں اپنے ذہن کی جھلک دے دی۔ انہوں نے کہا کہ پاکستان اسلام کے نام پر قائم ہوا تھا اور یہ اسی وقت باقی رہے گا جب یہ اسلام سے وابستہ رہے۔ ان کے نزدیک ''اسلامی نظام'' کا نفاذ ناگزیر تھا۔

ضیاء الحق اپنی دینداری میں مخلص تھے۔ وہ 12 اگست 1924 کو ہندوستان کے شہر جالندھر کے ایک متوسط گھرانے میں پیدا ہوئے اور اعلیٰ تعلیم کے باوجود اپنے والدین کے سکھائے گئے اصولوں کو کبھی نہیں چھوڑا۔ دہلی کے معروف سینٹ اسٹیفن کالج میں تعلیم حاصل کی جو اس دور میں اشرافیہ کا مرکز تھا۔ پھر برطانوی ہندوستانی فوج میں افسر کی حیثیت سے جنگیں لڑیں لیکن ان کے نظریات کو نہ تو جنگیں نہ بیرکیں بدل سکیں۔ بیرکیں عام طور پر آدمی کو انگریز بنا دیتی ہیں۔ ضیاء الحق کہا کرتے تھے کہ ان کے ذہن پر جو سب سے گہرا نقش ہے وہ اپنی والدہ کا وہ منظر ہے جب وہ قیام پاکستان کے بعد اپنا کل اثاثہ سمیٹ کر سرحد پار کر رہی تھیں۔ لیکن جو افسر برما، ملایا اور جاوا کے محاذوں پر لڑ چکا ہو، اس کے بارے میں یہ تصور کرنا مشکل ہے کہ وہ ایک معمولی کسان کی طرح اپنے ہی گھر والوں کو تحفظ نہ دے سکا ہو۔

جب وہ اپنی توقع سے کہیں زیادہ عرصہ اقتدار میں باقی رہے تو ان کے بعض بددل ساتھیوں نے طنزیہ طور پر کہا کہ ضیاء الحق نے اللہ کا اس سے زیادہ سہارا لیا جتنا اللہ نے ان کا لیا۔ خوشامدیوں کی کمی نہ تھی جو ضیاء کو ''تقدیر والا'' قرار دیتے جو ایک پرانا مگر آمروں کا محبوب لقب ہوا کرتا تھا۔ مگر اس

بات کاالزام خود ضیاءالحق کو نہیں دیا جا سکتا۔ اگست 1950 میں، اپنی چچا زاد شفیقہ سے شادی کے بعد انہیں گائیڈز کیولری میں تعینات کیا گیا جہاں انہوں نے اپنے سینئر افسروں کو متاثر کیا۔ 1969 میں انہیں اردن بھیجا گیا جہاں انہوں نے فلسطینی مہاجر کیمپوں کے خلاف سخت کارروائی میں حصہ لیا اور فلسطینی تنظیم پی ایل او میں سخت ناپسندیدہ ہو گئے۔ واپسی پر انہیں پہلی بکتر بند ڈویژن کی کمان سونپی گئی۔ 1976 میں جب بھٹو ایک ایسا جنرل تلاش کر رہے تھے جس پر وہ اعتماد کر سکیں (بھٹو کو خوش فہمی تھی) تو انہوں نے کئی سینئر جرنیلوں کو نظر انداز کر کے ''نیک نیت'' ضیاءالحق کو آرمی چیف بنا دیا۔ ایسے مواقع ہی تقدیر پر یقین کو پختہ کر دیتے ہیں۔ جولائی 1977 میں ضیاءالحق نے امریکی سفیر سے اشارہ لے کر اقتدار پر قبضہ کر لیا، جب بھٹو نے وہ انتخابات بری طرح خراب کئے جن کا انہوں نے خود اعلان کیا تھا۔

ضیاءالحق کا پہلا وعدہ یہ تھا کہ وہ ''آزادانہ اور منصفانہ'' انتخابات جلد از جلد اور شاید اکتوبر ہی میں کرا دیں گے۔ یہ ان کا آخری وعدہ بھی ثابت ہوا۔ اگست 1988 میں ایک پراسرار فضائی حادثے میں ہلاکت تک کوئی انتخاب نہ کرا سکے۔ جس شخص نے انتخابات کے وعدے پر تختہ الٹا تھا اس کے دور میں کوئی انتخاب نہیں ہو سکا۔

ضیاءالحق نے بھٹو کو جس طریقے سے ہٹایا اسے صرف ''عدالتی قتل'' ہی کہا جا سکتا ہے۔ انہوں نے عدالتی عمل کو اپنے قبضے میں لے لیا اور 4 اپریل 1979 کی صبح بھٹو کو تختۂ دار پر چڑھا دیا گیا۔ اس کے بعد ضیاءالحق مغرب اور عرب دنیا دونوں میں معتوب ہو گئے۔ یہ سب بھٹو کے لیے احترام کی وجہ سے تھا۔ عرب دنیا بھٹو کے اس خفیہ منصوبے کی بھی بھرپور حمایت کر رہی تھی جسے ''اسلامی بم'' کا نام دیا گیا تھا (پاکستان آج بھی واحد مسلم ایٹمی طاقت ہے)۔ امریکہ نے اقتصادی امداد معطل کر دی۔ مگر ضیاءالحق کے ''دیرینہ رفیق''، یعنی ''تقدیر'' نے ایک بار پھر ان کی مدد کر دی۔

1979 میں ایران کے شاہ کو آیت اللہ خمینی کی عوامی تحریک نے تخت سے بے دخل کر دیا۔ امریکہ کو اچانک اس خلا کا سامنا کرنا پڑا جہاں کبھی اس کا بہترین دوست بیٹھا کرتا تھا۔ بھٹو کی پھانسی کے صرف 23 دن بعد کابل میں سوویت نواز پیپلز ڈیموکریٹک پارٹی آف افغانستان نے جس کی

قیادت جز وقتی شاعر نور محمد ترکئی کے ہاتھ میں تھی، اقتدار پر قبضہ کرلیا۔ اس تبدیلی نے وسیع پیمانے پر عوامی احتجاج کو جنم دیا جو خود پارٹی کی قیادت میں تقسیم کا سبب بنے۔ ترکئی کے اپنے وزیر اعظم حفیظ اللہ امین کے حامیوں نے 14 ستمبر کو ترکئی کو قتل کر دیا۔ پھر 27 دسمبر کی شام کابل اندھیرے میں ڈوب گیا۔ بجلی کا نظام تباہ کر دیا گیا تھا۔ شام سات بجے کے بعد تقریباً پانچ ہزار سوویت فوجی صدارتی محل کی طرف بڑھنے لگے۔ ان کے نامزد کردہ رہنما ببرک کرمل اس رات کابل میں موجود نہ تھے بلکہ قریب ہی تاجکستان کے دارالحکومت دوشنبے میں احکامات کے انتظار میں بیٹھے تھے۔ صبح تین بجے ایک نئی حکومت کے قیام کا اعلان کر دیا گیا۔ کرمل کا پہلا اعلان یہ تھا کہ وہ سوویت افواج جو پہلے ہی کابل میں داخل ہو چکی تھیں ان کی ''فوری اور پر خلوص'' موجودگی چاہتے ہیں۔ 31 دسمبر کو سوویت یونین کی کمیونسٹ پارٹی کی مرکزی کمیٹی نے ایک خفیہ (اب غیر خفیہ یعنی ڈسکلاسیفائیڈ) دستاویز منظور کی، جو کامریڈ زیو۔ آندروپوف، اے۔ گرومیکو، ڈی۔ اوستینوف اور بی۔ پونوماریوف نے تیار کی تھی۔ اس میں لکھا تھا کہ حفیظ اللہ امین کو اس لیے سزا دی گئی کہ اس نے ''سوویت یونین کے خلاف من گھڑت افواہیں پھیلانا شروع کر دی تھیں'' اور '' کابل میں امریکی ناظم الامور سے خفیہ رابطے قائم کر لیے تھے۔''

روس نے اس وقت افغانستان میں اپنی مہم کے ابتدائی دنوں میں فتح کا اعلان کر دیا۔ اس دستاویز میں لکھا تھا کہ ''عوام کی وسیع اکثریت نے امین کے خاتمے پر کھلے دل سے خوشی کا اظہار کیا۔'' اسی لمحے سے پاکستان سرد جنگ میں کمیونزم کے خلاف اگلے محاذ کا ملک بن گیا۔

ضیاء الحق کے پاس کامیاب موقع پرستی کی خوب مہارت تھی۔ انہوں نے امریکی صدر جمی کارٹر کی طرف سے دی جانے والی 400 ملین ڈالر کی امداد کو ''مونگ پھلی'' قرار دے کر ٹھکرا دیا۔ اور انہوں نے ٹھیک ہی کیا کیوں کہ اس کے بعد صدر رونالڈ ریگن نے ان کے لیے ''سیب'' بھیجے، یعنی چھ سال کے دوران 3.2 ارب ڈالر کی امداد۔ یہ اس کے علاوہ تھا جو سی آئی اے پشاور کے ذریعے جنگی مہم میں لٹا رہی تھی۔ ضیاء الحق نے اس امریکی چشم پوشی سے بھرپور فائدہ اٹھایا اور پاکستان کے جوہری پروگرام کو آگے بڑھایا۔ جولائی 1986 میں شائع ہونے والی کارنیگی ٹاسک فورس رپورٹ آن نان

پرولیفریشن ان ساؤتھ ایشیا (The Carnegie Task Force Report on non-proliferation in South Asia) کے مطابق پاکستان کے پاس اس وقت سالانہ ایک سے چار ایٹم بم بنانے کے لیے کافی ذخائر موجود تھے۔ رپورٹ کے مطابق بھارت سالانہ 15 سے 30 بم بنانے کی صلاحیت رکھتا تھا۔

ضیاءالحق نے اپنے غیر متنازعہ اقتدار کو پاکستان میں اسلامائزیشن کے عمل کو تیز کرنے کے لیے بھرپور طور پر استعمال کیا۔ ابتدا میں انہوں نے جماعتِ اسلامی کا سہارا لیا، جو گزشتہ صدی کے سب سے بااثر اسلامی مفکر مولانا ابوالاعلیٰ مودودی کی قائم کردہ ایک مذہبی و سیاسی جماعت تھی۔ شاید جماعت اسلامی یہ گمان کر بیٹھی کہ ضیاء ان کے ساتھ واقعی اقتدار میں شراکت کریں گے۔ لیکن ضیاءالحق کا ارادہ کچھ اور تھا۔ انہیں درحقیقت اپنے رفقائے کار جرنیلوں کے ساتھ ہی اقتدار کی تقسیم کرنی تھی، اور ریاستی طاقت کے اہم مناصب انہی جرنیلوں کو سونپے گئے جو ان کے نظریات کے ہم خیال تھے۔ ان میں سب سے مؤثر عہدہ انٹر سروسز انٹیلی جنس (آئی ایس آئی) کے سربراہ کا تھا جو بھٹو کے دور میں قائم کیا گیا تھا۔

ضیاءالحق نے امریکہ سے ایک نہایت اہم رعایت حاصل کر لی تھی۔ افغانستان میں سوویت یونین کے خلاف جنگ کے لیے اسلحہ، تربیت اور مالی امداد کا سارا انتظام صرف پاکستانی فوج کے توسط سے ہوگا، اور سی آئی اے کسی بھی صورت میں براہِ راست کوئی کارروائی نہیں کرے گی۔ ضیاء نے اس تمام عمل کی نگرانی کے لیے آئی ایس آئی کو اپنا مرکزی ادارہ بنا لیا تھا۔

سوویت جارحیت کے فوری بعد ضیاءالحق نے آئی ایس آئی کے ڈائریکٹر جنرل کے طور پر لیفٹیننٹ جنرل اختر عبدالرحمن خان کو تعینات کیا جو ان ہی کی طرح "دیندار اور پیشہ ور" جرنیل تھے۔ ان کے سینے پر اعزازات کی تین قطاریں سجی ہوتیں اور انہیں اپنے اسلامی اصولوں پر اسی قدر ناز تھا جتنا اپنے افغان النسل ہونے پر۔ جہاد کے تمام اسلحہ، سازوسامان، تربیت اور مالی وسائل کی ترسیل کا اختیار آئی ایس آئی کے ہاتھ میں آ گیا۔ یہ اسلحہ امریکہ، مصر، سعودی عرب، برطانیہ، فرانس اور حتیٰ کہ اسرائیل سے بھی آ رہا تھا۔ اس کے اصل مصرف کا تعین آئی ایس آئی ہی کرتی تھی۔ جنرل اختر اسی طیارے

میں سوار تھے جس کے حادثے میں ضیاء الحق ہلاک ہوئے تھے۔ اس وقت تک وہ چیئرمین جوائنٹ چیفس آف اسٹاف کے منصب تک پہنچ چکے تھے۔ مربی اور جانشین دونوں ایک ہی ساتھ اس دارفانی سے رخصت ہوئے۔

ضیاء الحق نے اسلامی قوانین کے نفاذ کی کوشش بھی شروع کر دی۔ مگر اس سلسلے میں عوامی حمایت حاصل کرنے میں تین بڑی رکاوٹیں پیش آئیں۔ پہلی بڑی رکاوٹ سنی اور شیعہ مکاتب فکر کے درمیان گہرے اختلافات تھے، مثلاً نکاح کے قوانین پر۔ شیعہ فقہ میں ''متعہ'' یعنی عارضی نکاح کا تصور موجود ہے جو بسا اوقات مردوں کے لیے بڑی سہولت کا باعث بن جاتا ہے۔ دوسری رکاوٹ عوامی ردعمل تھا، خاص طور پر ضیاء الحق کی نافذ کردہ سخت سزاؤں کے خلاف، جیسے کوڑوں کی سزا۔ تیسری بڑی رکاوٹ بدعنوانی اور بدانتظامی تھی۔ مثلاً زکوٰۃ کے قانون کے نفاذ کے بعد اس کے جمع اور تقسیم کے بارے میں بے شمار شکایات پیدا ہوگئیں۔

ضیاء الحق ان تمام مخالفتوں سے بے نیاز تھے۔ انہوں نے ایک قانون منظور کروایا جس کے تحت رمضان المبارک کے دوران دن کے وقت سرعام کھانے پینے پر پانچ سو روپے جرمانہ یا دو ماہ قید کی سزا مقرر کر دی گئی۔ مذہبی حلقوں کی دلچسپی اسلامی معاشرت کے قیام سے زیادہ ''طالبانائزیشن'' میں تھی۔ انہوں نے مارشل لا کے تحت یہ عرضی پیش کی کہ مردوں کے لیے داڑھی اور عورتوں کے لیے پردہ لازم قرار دیا جائے (جو ضیاء الحق کے بعد طالبان نے افغانستان میں پوری سختی کے ساتھ نافذ کر دکھایا)۔ یہ علما ایک مذہبی پولیس کے بھی خواہش مند تھے جو دن میں پانچ وقت کی نماز کی پابندی کروائے۔ حتیٰ کہ یہ بحث بھی چھڑ گئی کہ آیا خون کا عطیہ دینا شرعی طور پر جائز ہے یا نہیں۔

ضیاء الحق بدستور مطمئن اور بے نیاز رہے۔ 1979 میں ان کے شروع کردہ اسلامی پروگرام کو مئی 1981 میں اس وقت باضابطہ ادارہ جاتی حیثیت مل گئی جب وفاقی شرعی عدالت قائم کی گئی اور اس میں علماء بطور جج مقرر ہوئے۔ اگست 1982 میں سپریم کورٹ کے مسلم قوانین پر مشتمل تین رکنی اپیلٹ بنچ میں بھی علماء کو شامل کر دیا گیا۔

علمائے دین کی ذہنیت میں ابھرتی ہوئی بے رحم تنگ نظری کھل کر سامنے آ گئی۔ ایک دل دہلا دینے

والے واقعے میں ایک نابینا خادمہ صفیہ بی بی کو اس لیے پندرہ کوڑوں کی سزا سنائی گئی کہ وہ مسلسل زیادتی کا شکار ہو کر حاملہ ہو گئی تھی۔ حیرت کی بات یہ کہ جنسی زیادتی کے مرتکبین کو ''شواہد کی کمی'' کی بنیاد پر بری کر دیا گیا! ضیاء الحق کے عہد میں علما کی طاقت اور مدارس کا پھیلاؤ (جس میں سعودی سرمائے کا بڑا کردار تھا) بے مثال حد تک پہنچ گیا، لیکن ملاؤں کی طلب کبھی پوری نہیں ہوئی۔ شاید خود ضیاء الحق بھی کبھی کبھی یہ سوچتے ہوں کہ وہ کس راستے پر نکل کھڑے ہوئے ہیں۔ ایک سرگوشی مہم (کانا پھوسی) شروع ہوئی جس میں یہ الزام لگایا گیا کہ ضیاء الحق ''سچا مسلمان'' نہیں بلکہ قادیانی ہے، یعنی ایسا کافر جو ختم نبوت کا منکر ہو۔ ضیاء الحق کو اس افواہ کی کھلے عام تردید کرنا پڑی مگر واپسی کا دروازہ اب بند ہو چکا تھا۔

ضیاء الحق کے انتقال کے بعد فوج کے حیران کن طور پر تیزی سے بیرکوں میں واپس جانے اور ایک جمہوری عمل کے ذریعے سویلین حکومت کے قیام سے یہ حقیقت ظاہر ہوئی کہ قوم نہ تو ضیاء الحق کے مذہبی بیانیے سے قائل ہوئی تھی نہ آمریت سے۔ تاہم، اس دور کی شدید مذہبی ذہن سازی نے ملک میں ایسے کٹر اور نظریاتی عناصر کی ایک پائیدار نسل تیار کر دی تھی جسے اب قومی زندگی سے مٹانا ممکن نہ رہا۔ نہ ہی کوئی آنے والی حکومت ان قوانین اور اختیارات کو واپس لے سکی جو ضیاء الحق کی سرپرستی میں علماء نے پارلیمان میں حاصل کر لیے تھے۔

یہی شدت پسند عناصر بعد میں ضیاء الحق کے جانشین بھٹو کی مغرب زدہ آکسفرڈ اور ہارورڈ تعلیم یافتہ بیٹی بے نظیر بھٹو کے خلاف بھی صف آرا ہو گئے۔ نومبر 1994 میں تحریک نفاذ شریعت محمدی (یعنی وہ گروہ جو اسلامی قوانین کے مکمل نفاذ کا خواہاں تھا) نے اپنی مخصوص سیاہ پگڑیوں کے ساتھ (جو بعد میں ملا عمر کے طالبان کی علامت بھی بنیں)، شمال مغربی سرحدی صوبے کے علاقے ملاکنڈ سے بے نظیر بھٹو کے خلاف جہاد کا اعلان کر دیا۔ اسی برس فوج کے اندر ایک اور سازش بے نقاب ہوئی جس میں بھٹو حکومت کا تختہ پلٹ کر پاکستان کو ''سنی اسلامی ریاست'' بنانے کا منصوبہ تھا۔ اس سازش میں ملوث تین اعلیٰ فوجی افسران میجر جنرل ظہیر الاسلام عباسی، بریگیڈیئر مستنصر بلہ، اور کرنل عنایت اللہ خان تھے۔ ان کے ہمراہ چند جونیئر افسران بھی شامل تھے جنہوں نے 30 ستمبر کو سینئر فوجی کمانڈروں

کے اجلاس پر حملے کا منصوبہ بنا رکھا تھا۔

ضیاء الحق نے امریکہ کے ساتھ دوغلی حکمت عملی بڑی مہارت سے نبھائی۔ ایک طرف انہیں ملک میں اپنی بقا اور بیرونی محاذ پر سوویت یونین کے خلاف جنگ کے لیے امریکی حمایت درکار تھی، تو دوسری طرف وہ انہی دنوں مغرب کے خلاف ایک نئی عسکری تحریک کی بنیاد بھی ڈال رہے تھے، جس کے نتائج کی شاید خود ان کو بھی توقع نہیں تھی۔ اس کی ایک علامتی مثال 21 نومبر 1980 کا واقعہ ہے جب یہ افواہ پھیل گئی کہ سعودی عرب میں موجود امریکی افواج نے مکہ مکرمہ میں خانہ کعبہ پر حملہ کیا ہے۔ اس افواہ کے نتیجے میں اسلام آباد میں امریکی سفارتخانے کو نذر آتش کر دیا گیا۔ ضیاء الحق اس موقع پر مشکل سے ہی اپنی خوشی چھپا سکے۔ جب امریکہ اسلام کو کمیونزم کے خلاف ایک ہتھیار کے طور پر استعمال کر رہا تھا، عین اسی وقت ضیاء الحق ایک ایسی جنگ کے بیج بو رہے تھے جس کے نتائج شاید ان کے اپنے تصور سے بھی باہر تھے۔

26 فروری 1993 کو ورلڈ ٹریڈ سینٹر پر بم دھاکے کے بعد ہی امریکہ کی آنکھ کھلی کہ پاکستان میں قائم بنیاد پرست عناصر عالمی سطح پر سرگرم ہو چکے ہیں۔ 19 نومبر 1994 کو اسلام آباد میں مصر کے سفارت خانے پر ایک خودکش حملہ ہوا جسے القاعدہ سے وابستہ تنظیم ''الجہاد'' کے ایک بمبار نے انجام دیا۔ اس حملے میں اٹھارہ افراد ہلاک اور سولہ زخمی ہوئے تھے۔

ضیاء الحق کی پالیسیوں کا ایک نہایت افسوسناک نتیجہ پاکستان میں مسیحی اقلیت کے خلاف بڑھتا ہوا تشدد تھا۔ مسیحیوں کا قیام پاکستان کی سیاست یا تقسیم ہند میں کوئی کردار نہیں رہا تھا، اسی لیے 1947 کے بعد انہیں نسبتاً امان نصیب رہی۔ مگر جب اسلامی شدت پسندوں کی توجہ ''مسیحی مغرب'' کی جانب مبذول ہوئی تو تاریخ کی پرانی تلخیاں مقامی سیاست میں گونجنے لگیں۔

تین غریب پاکستانی مسیحی شہری سلیمات، منظور اور رحمت مسیح پر توہین رسالت کا الزام عائد کیا گیا۔ پاکستان میں اس جرم کی سزا موت ہے، چنانچہ یہ مقدمہ ایک عالمی انسانی حقوق کا مسئلہ بن گیا۔ 5 اپریل 1994 کو لاہور ہائی کورٹ سے واپسی پر شدت پسندوں نے منظور کو گولی مار کر قتل کر دیا۔ پندرہ مئی کو جب لاہور ہائی کورٹ میں مسیح بھائیوں کی اپیل پر سماعت ہو رہی تھی تو باہر علما نے مظاہرہ

کیا اور اسلام کے محافظ کے طور پر ایک نئی جماعت طالبان کو آواز دی۔ علما نے اپنے نعروں میں دینی مدارس کے ان طلباء (یعنی طالبان) کو پکارا کہ وہ پاکستان میں اسلام کی حفاظت کریں، جسے اب مسیحیوں (جیسے مسیح برادری) کے افراد پامال کر رہے ہیں۔ مظاہرین کے نعرے گونج رہے تھے:

''کابل کے بعد اسلام آباد......طالبان! طالبان!''

یعنی اب جب کابل فتح ہو چکا ہے تو اسلام آباد کی باری ہے!

ادھر جب سوویت افواج نے افغانستان پر قبضہ کیا تو اس وقت اسامہ بن لادن کی عمر بائیس برس تھی۔ اس کے والد محمد بن لادن کا تعلق یمن سے تھا اور انہوں نے سعودی عرب میں تیل کی سب سے بڑی کمپنی آرامکو میں مزدور کی حیثیت سے کام شروع کیا۔ مگر جب 1966 میں وہ ہوائی حادثے میں ہلاک ہوئے (جو خودکشی کے مترادف زمرے میں آتا ہے اور بعض ماہرین نفسیات کے لیے قابل توجہ امر ہے) تو وہ دنیا کی سب سے بڑی نجی تعمیراتی کمپنی کے مالک بن چکے تھے اور ان کے خاندان کے افراد کی تعداد بھی دنیا میں شاید سب سے زیادہ تھی... باون بچے۔ ان میں سے ایک اسامہ تھا جو تاریخ کا مرکزی کردار بننے والا تھا۔

اسامہ 1980 میں پاکستان آیا۔ اس کی آمد کو سعودی عرب انٹیلی جنس کے سربراہ شہزادہ ترکی بن فیصل السعود کی پشت پناہی حاصل تھی۔ اس نے پشاور میں اپنا دفتر قائم کیا۔ اور جو کوئی سعودی انٹیلی جنس کا دوست ہوتا تھا وہ پاکستانی آئی ایس آئی کا بھی دوست بن جاتا تھا۔ چنانچہ جنرل اختر عبدالرحمان کی سرپرستی میں اسامہ تیزی سے ترقی کرتا گیا۔ اسامہ کا مشن یہ تھا کہ وہ ایک ایسا متحرک اسلامی عسکری دستہ تشکیل دے جو دنیا میں کسی بھی مقام پر دشمن کو نشانہ بنانے کی صلاحیت رکھتا ہو۔

جماعتِ اسلامی اور آئی ایس آئی جیسی مذہبی تنظیمیں اس وقت سے ہی افغانستان میں فتح کے بعد وسط ایشیا کی ان تمام مسلم ریاستوں کی آزادی کے لیے ایک ہمہ گیر جہاد کی منصوبہ بندی کر رہی تھیں جو سوویت یونین کے زیر تسلط تھیں۔ پرویز مشرف کے اعتراف کے مطابق ضیاء الحق نے ایک ''ریاست کے اندر ریاست'' قائم کر دی تھی، ایسے ادارے اور افراد کا ایک ایسا نظام جو داخلی و

خارجی پالیسیوں میں ایک غیر اعلانیہ مگر واضح ایجنڈے پر عمل پیرا ہوں۔

اسامہ بن لادن نے ذاتی دولت اور ادارہ جاتی تعاون سے عملاً ایک ذاتی فوج تشکیل دی جو زیادہ تر عربوں پر مشتمل تھی، مگر اس میں دنیا بھر کے مسلم نوجوان بھی شامل تھے۔ میدان جنگ میں اگرچہ اس کی شرکت وقفے وقفے سے ہوتی تھی مگر اس کی اصل مہارت تنظیم سازی اور قیادت میں تھی جس کی جھلک اس کے کم عمری کے دور ہی میں نمایاں ہوگئی تھی۔ کراچی میں قیام کے دوران وہ بنوری مسجد سے اپنا کام چلاتا رہا۔ اس مسجد کے امام ایک مولانا عمر تھے۔

افغان جنگ کے تجربے سے اسامہ ایک ناقابل شکست یقین کے ساتھ ابھرا۔ وہ ہر سننے والے کو یہی پیغام دیتا کہ تھوڑی تعداد اور محدود وسائل کے باوجود جہاد کے ذریعے دنیا کی سب سے بڑی سلطنت کو جھکایا جا سکتا ہے۔ اگر سوویت یونین کو زیر کیا جا سکتا ہے تو یہی جذبہ مسلم قوت کو پھر سے زندہ کر سکتا ہے اور اسلام کے سب سے بڑے دشمن امریکہ کو للکار سکتا ہے، وہی امریکہ جس نے اللہ کے عطا کردہ مسلمانوں کے تیل کے وسائل پر قبضہ جما رکھا ہے۔ جب اسامہ وطن واپس لوٹا تو سعودی حکومت اور عوام نے اسے ہیرو کا درجہ دیا۔

مگر پھر 2 اگست 1990 کو صدام حسین نے کویت پر قبضہ کر لیا۔ وہ سمجھتا تھا کہ وہ یہ جرأت بغیر کسی مزاحمت کے کر گزرے گا۔ عرب ممالک اس کی ایران مخالف جنگ میں خاموشی سے پشت پناہی کرتے رہے تھے، اور امریکہ بھی محتاط طریقے سے اس کی حوصلہ افزائی کرتا رہا تھا۔ سعودیوں نے اس حمایت کا شکریہ اپنی روایت کے مطابق نقد رقوم سے ادا کیا۔ امریکہ کو بھی اطمینان ہوا کہ آیت اللہ خمینی کی توانائیاں "شیطان اکبر" یعنی امریکہ کے بجائے ایک مقامی آمر کے خلاف استعمال ہو رہی تھیں۔

مگر دنیا نے اس جارحیت کو قبول نہیں کیا۔ سعودی شاہی خاندان کو خدشہ ہوا کہ اب ان کی باری بھی آ سکتی ہے۔ اسامہ بن لادن نے اپنی حکومت کو پیشکش کی کہ وہ کم از کم دس ہزار مجاہدین پر مشتمل ایک اسلامی فوج تیار کر سکتا ہے جو صدام حسین کی ریپبلکن گارڈ کے مقابلے میں کافی ہوگی۔ اس کا استدلال تھا کہ اپنے وطن کا دفاع ایک مسلمان فوج کو ہی کرنا چاہیے۔

چند روز تک اسے یہ گمان رہا کہ اس کی پیشکش زیر غور ہے۔ لیکن 7 اگست کو یہ اعلان ہوا کہ امریکی افواج سعودی عرب کے تیل کے ذخائر کی حفاظت کریں گی۔ اسے نجی طور پر یقین دہانی کرائی گئی کہ امریکی فوجیں کویت کی آزادی کے بعد واپس چلی جائیں گی۔ مگر جب ایسا نہیں ہوا تو اسامہ نے کھل کر اپنی ناراضگی کا اظہار کرنا شروع کر دیا۔

بعد میں اس نے یہ الزامات واضح طور پر لگائے کہ سعودی شاہی خاندان نے امت مسلمہ سے غداری کی ہے، عیسائیوں اور یہودیوں سے دوستی گانٹھ لی ہے اور اب وہ ان مقدس مقامات کے امین رہنے کے اہل نہیں رہے۔ اس نے پیش گوئی کی کہ ان کا انجام ایران کے شاہی خاندان جیسا ہوگا، وہ بکھر جائیں گے اور تاریخ کے صفحات سے غائب ہو جائیں گے۔ جہاں تک امریکہ کا تعلق ہے اس نے وعدہ کیا کہ وہ تابوتوں میں واپس جائے گا۔

اسامہ بن لادن کو سعودی عرب چھوڑنے کا حکم دیا گیا۔ حکومت نے اس کا پاسپورٹ واپس کر دیا۔ اسامہ کی پہلی منزل پاکستان تھی، جہاں سے وہ اپنے پرانے ٹھکانے افغانستان کی طرف روانہ ہوا۔ مگر اب تک آزاد افغانستان ایک خوفناک تباہی کی شکار ریاست بن چکا تھا۔

1991 میں سوڈان کی نیشنل اسلامک فرنٹ کے نرم گو علمی شخصیت ڈاکٹر حسن الترابی نے اسامہ اور اس کے افغان مجاہد رفقا کو خرطوم میں پناہ دی۔ 'القاعدہ' یا 'دی فاؤنڈیشن' اس کی سیاسی سرگرمیوں کا مرکز بن گئی جب کہ سوڈان میں قیام کے دوران اس کی کاروباری ذہانت نے اس کے اثاثوں میں بھی اضافہ کیا۔

اسامہ اب خود کو ایک نئے خلیفہ یا امام کی صورت میں دیکھنے لگا تھا، ایسا رہنما جو دنیا بھر میں مسلمانوں کے مفادات کا تحفظ کرے گا۔ اس مشن میں اس کے اتحادی مصر کی جماعت 'الجماعہ الاسلامیہ' اور 'الجہاد' جیسے گروہ تھے جنہوں نے انور سادات کے قتل کی سازش رچی تھی۔ اس کا نیٹ ورک پھیلتا گیا۔ الجزائر، مصر، تیونس اور یمن میں جب بھی کوئی شورش یا انتشار برپا ہوا اس میں حکومتوں کو اسامہ کا ہاتھ نظر آیا۔

دنیا کے مختلف حصوں میں اچانک دہشت گردی کے دھماکوں سے خوف کی فضا تیار ہو گئی اور سب سے

غیر متوقع حملہ اس جگہ پر ہوا جسے دنیا کا سب سے محفوظ گوشہ سمجھا جاتا تھا... سی آئی اے کے صدر دفتر کی دہلیز پر۔ جنوری 1993 میں ایک شخص میر ایمل کانسی نے سی آئی اے کے صدر دفتر لینگلی ورجینیا کے گیٹ کے باہر دو اہلکاروں کو گولی مار کر ہلاک کر دیا اور فرار ہو کر پاکستان پہنچ گیا۔ بالآخر 17 جون 1995 کو اسے گرفتار کر کے امریکہ بھیج دیا گیا۔

اسی سال فروری میں ورلڈ ٹریڈ سینٹر پر پہلا حملہ ہوا۔ امریکہ اس وقت صدام حسین کے پیچھے اندھی دوڑ میں مصروف تھا اور دہشت گردی کے حقیقی منبع کی تلاش میں غلط سمت میں دیکھ رہا تھا۔ اس حملے کا اصل منصوبہ ساز پاکستانی نژاد بلوچ رمزی احمد یوسف تھا، جو پاکستان کے ان غیر مرئی بے لگام گروہوں کا حصہ رہ چکا تھا جن پر کسی کا قابو نہیں تھا۔ رمزی نے گرفتاری کے بعد بتایا کہ وہ ہزاروں امریکیوں کو ہلاک کرنا چاہتا تھا۔ اس کا منصوبہ تھا کہ ایک ٹاور کو اتنی شدت سے گرا دیا جائے کہ وہ ڈومینو کی گرتی ہوئی قطار کی طرح دوسرے پر آ گرے۔

26 فروری جمعہ کے دن دوپہر سے ذرا پہلے ایک دھماکے سے ورلڈ ٹریڈ سینٹر کے پارکنگ گیراج کی تین منزلیں تباہ ہو گئیں، جس سے آگ بھڑک اٹھی۔ چھ افراد ہلاک ہوئے اور تقریباً سات سو زخمی ہوئے۔ منصوبے کے مطابق ایک ٹاور کا دھڑام سے گرنا اور ساتھ ہی زہریلی سائنائیڈ گیس کا پھیلنا متوقع تھا مگر ٹاور گرا نہیں اور سائنائیڈ گیس دھماکے کی حرارت میں جل کر ضائع ہو گئی۔ یہ ناکامی امریکیوں کے دل میں جھوٹا اطمینان بھر گئی کہ شاید وہ ناقابل تسخیر ہیں۔

5 مارچ 1993 کو پولیس نے 26 سالہ اردنی محمد صالح کو گرفتار کر کے پہلی گرفتاری کی۔ صالح ایک ٹرک رینٹل کمپنی میں کام کرتا تھا۔ ملبے میں ایک وین ملی جس کا سراغ اسی کمپنی تک پہنچا۔ اس کے بعد دو سال پر محیط تعاقب شروع ہوا۔ آخرکار 20 فروری 1995 کو پاکستان نے 27 سالہ رمزی یوسف کو پشاور کے ایک ہوسٹل سے گرفتار کیا جو اسامہ کی ملکیت تھا، اور اسے امریکی حکام کے حوالے کر دیا۔

مصری نابینا عالم دین شیخ عمر عبدالرحمن کو بھی ورلڈ ٹریڈ سینٹر بم دھماکے کے مقدمے میں سزا سنائی گئی، تاہم ان پر صرف سازش کا الزام ثابت ہوا نہ کہ براہ راست کارروائی کا۔ ان کے وکیل نے دلیل دی کہ شیخ عمر کا واحد 'جرم' یہ تھا کہ وہ اپنی مذہبی کتاب پر یقین رکھتے تھے اور یہ ایک پیچیدہ فکری مسئلہ تھا۔

ایف بی آئی نے سرکاری سطح پر کسی ریاست کی پشت پناہی کی تردید کی جس سے ان حلقوں کو سخت مایوسی ہوئی جو چاہتے تھے کہ امریکہ عراق کے خلاف کارروائی کرے۔

دلچسپ بات یہ ہے کہ رمزی یوسف ستمبر 1992 میں پاکستان سے امریکہ ایک جعلی عراقی پاسپورٹ کے ساتھ آیا، تا کہ سیاسی پناہ کی درخواست دے سکے اور خود کو عراقی حکومت کا مخالف ظاہر کر سکے۔ یہ چالا کی اپنی مثال آپ تھی۔ بم دھماکے کے بعد وہ جے ایف کے ایئر پورٹ سے ایک دوسرے جعلی پاسپورٹ کے ذریعے سکون سے واپس پاکستان روانہ ہو گیا۔ یہ پاسپورٹ قانونی طور پر ایک اور شاطرانہ تدبیر کے تحت نیو یارک میں پاکستانی قونصلیٹ سے حاصل کیا گیا تھا۔

9 نومبر 1992 کو اس نے نیو جرسی پولیس میں رپورٹ درج کرائی کہ اس کا پاسپورٹ گم ہو گیا ہے، اور اپنا نام عبدالباسط محمود عبدالکریم بتایا جو پاکستان میں پیدا ہوا تھا اور کویت میں پلا بڑھا تھا۔ بعد ازاں وہ پاکستانی قونصلیٹ گیا اور گم شدہ پاسپورٹ کی فوٹو کاپی جمع کرائی جس پر اسے عارضی سفری دستاویز دے دی گئی اور کہا گیا کہ واپسی پر اصل معاملہ حل کرے۔ وہ واقعی واپس آیا، لیکن ورلڈ ٹریڈ سینٹر کو بم سے اڑا کر آیا۔ وہ پاکستان میں روپوش رہا حتیٰ کہ ایک ہوسٹل سے گرفتار کیا گیا جو اسامہ بن لادن کی ملکیت تھا۔

اسامہ بن لادن نے بھی مشرق کی جانب رخ کیا تا کہ پناہ حاصل کی جا سکے۔ 1996 تک سوڈانی حکومت پر علاقائی اور امریکی دباؤ اتنا بڑھ گیا کہ اسامہ کو ملک چھوڑنے کا حکم دے دیا گیا۔ اس مرتبہ اس کے لیے افغانستان میں جگہ موجود تھی کیونکہ کابل میں ایک ایسی حکومت قائم ہو چکی تھی جو اسلام آباد کی مدد سے برسر اقتدار آئی تھی۔ اسامہ کا پرانا ساتھی مولوی عمر اب اس طالبان حکومت کا سب سے بڑا حکمران بن چکا تھا۔

مولوی محمد عمر اخوندزادہ قندھار کے ضلع میوند میں پیدا ہوا تھا جہاں کے کسان افیون کی کاشت سے روزی کماتے ہیں۔ جن لوگوں نے اسے دیکھا ہے وہ کہتے ہیں کہ وہ قد آور دبلا پتلا اور بارعب شخصیت کا مالک تھا۔ وہ نہایت مدھم آواز میں بات کرتا، لمبی داڑھی رکھتا اور سیاہ عمامہ پہنتا تھا۔ طالبان کی فتوحات کے دوران اسے تین بار زخم آئے، جن پر وہ فخر کیا کرتا تھا۔

1994 میں بےنظیر بھٹو بظاہر اقتدار میں تھیں، لیکن اس متوازی ریاست پر ان کا قابو نہیں تھا جو اپنے راستے پر چلتی رہی اور بےنظیر کو ایک گمراہ کن وجود سمجھتی تھی۔ تاہم انہوں نے طالبان کی حمایت کی کیونکہ یہ پاکستان کے ایک اہم خارجی مفاد کو پورا کرتے تھے... اور وہ تھا ''کافر'' بھارت کے خلاف ایک محاذ۔ ساتھ ہی طالبان افغانستان کے اندرونی انتشار، خونریز گروہی جھگڑوں اور مسلسل پاکستان و ایران کی طرف آنے والے پناہ گزینوں کے سیلاب کا بھی ایک ممکنہ حل دکھائی دیے۔ افغانستان کی سڑکوں پر ڈاکو راج کرتے تھے جو ٹرکوں اور مسافروں سے بندوق کے زور پر رقم وصول کرتے تھے۔

گرمیوں کے موسم 1994 میں ایک قافلہ قندھار کی شاہراہ پر انہی ڈاکوؤں کے ہاتھوں یرغمال بنالیا گیا۔ ظاہر ہے کہ پاکستان کی حکومت براہ راست مداخلت نہیں کرسکتی تھی۔ البتہ افغان دینی مدارس کے طلبہ ایسے لگتے تھے جیسے وہ اس کام کے لیے تیار ہوں۔ آئی ایس آئی کے ایک اشارہ بھر کی دیر تھی کہ انہیں اسلحہ اور اجازت دے دی گئی۔ تقریباً 2000 طلبہ سڑک پر نکلے، قافلے کو آزاد کروایا، ایک درندہ صفت مقامی کمانڈر کے چنگل سے دو عورتوں کو بچایا، اور ایک داستان رقم کر گئے۔ بعد ازاں انہوں نے افغانستان کے دوسرے سب سے بڑے شہر قندھار پر قبضہ کرلیا۔ ان طلبہ کا رویہ نہایت مثالی تھا۔ نہ کوئی انتقامی قتل ہوا، نہ لوٹ مار۔ انہوں نے ایک نرم اسلامی نظام عدل کے تحت امن قائم کردیا۔

فروری 1995 تک یہ تحریک مکمل طور پر پاکستان کے ہتھیاروں اور سعودی سرمایہ سے لیس ہوچکی تھی۔ سعودیوں نے طالبان کو ایران کے شیعہ اثر ورسوخ کے خلاف ایک سنی دیوار کے طور پر دیکھا۔ اب وہ کابل کے نواح تک پہنچ چکے تھے۔ اگرچہ کابل کا تختہ نہیں پلٹا مگر ہرات ضرور ان کے قبضے میں آ گیا۔ اور وہیں پہلی بار مستقبل کی جھلک نظر آئی۔ ایک نوجوان پر طالبان کے دو افراد کے قتل کا شبہ تھا، اسے کرین پر لٹکا کر پھانسی دے دی گئی جبکہ لاؤڈ اسپیکروں پر قرآن کی آیات تلاوت کی جا رہی تھیں۔

26 ستمبر 1996 کو طالبان کابل میں داخل ہو گئے۔ مگر اب وہ طالبان نہیں تھے جو ابتدائی دنوں میں قندھار آئے تھے۔ آخری سوویت نواز صدر نجیب اللہ جو اپریل 1992 کے زوال کے بعد اقوام متحدہ

کے دفتر میں پناہ گزین تھے، طالبان نے انہیں عوامی طور پر خصی کر کے قتل کر دیا۔ دلچسپ بات یہ ہے کہ طالبان کے خلاف قوتیں شکست کے بعد وہ اتحاد قائم کرنے میں کامیاب ہو گئیں جو وہ فتح کے وقت بھی نہ کر سکیں۔ البتہ یہ اتحاد محض شمالی افغانستان تک محدود رہا، اور انہیں ''شمالی اتحاد'' کا نام دیا گیا۔

طالبان نے پاکستان کو کئی پہلوؤں سے فائدہ پہنچایا، محض سخت گیر مگر بظاہر پر امن استحکام کی فراہمی تک محدود نہیں۔ اسلام آباد کی ایک دیرینہ حکمت عملی یہ تھی کہ مشرق میں بھارت اور مغرب میں افغانستان کے دوطرفہ دباؤ سے نجات حاصل کی جائے۔ طالبان کے کابل پر قابض ہو جانے کے بعد پاکستان کو مغربی سرحد کے حوالے سے کسی بڑی تشویش کا سامنا نہیں رہا۔ طالبان پاکستان کی اس ''ریاست در ریاست'' کے فخر اور قریبی اتحادی بن گئے جو داخلی و خارجی پالیسی میں مخصوص ایجنڈے پر کار بند تھی۔ اس سے اسلام آباد کی مرکزی حکومت کو یہ سہولت ملی کہ وہ ان شدت پسند گروہوں کو جنہیں امریکی دباؤ کے باعث براہ راست پناہ نہیں دی جا سکتی تھی، طالبان کے زیر سایہ منتقل کر دے۔ اسامہ بن لادن بھی ایسے ہی عناصر میں شامل تھا۔

امریکہ نے ابتدا میں اس معاملے کو زیادہ سنجیدگی سے نہ لیا۔ اس کی ایک ممکنہ وجہ یہ بھی تھی کہ بعض حلقے خاص طور پر تیل کی لابی ''بڑے مفاد'' کی بات کرتے تھے۔ ہم سعودی عرب میں سوکال (Socal) کمپنی کا ذکر کر چکے ہیں۔ یہی کمپنی اب وسط ایشیا سے بحر ہند تک ایک ٹرانس-افغان پائپ لائن کی وکالت کر رہی تھی جس کی سلامتی اور کامیابی کی ضمانت طالبان کی ناقابل شکست حکومت کو سمجھا جا رہا تھا۔

امریکہ کی اس خطے میں شدت پسندوں کا تعاقب نہ کرنے کی ہچکچاہٹ کی ایک وجہ شرمندگی بھی تھی، کیونکہ ان میں سے کئی خونخوار کردار خود اس کے اپنے تخلیق کردہ فرینکنسٹائن یعنی سی آئی اے کی پیداوار تھے۔ 1993 میں نیویارک میں ایف بی آئی کے ڈائریکٹر رابرٹ فاکس نے جب ٹیلی وژن پر یہ اشارہ دیا کہ ورلڈ ٹریڈ سینٹر پر حملہ کرنے والوں میں سے بعض کو سی آئی اے نے تربیت دی تھی، تو چند ہفتوں بعد ان کے تبادلے کا حکم ان کی میز پر موجود تھا۔ تاہم واشنگٹن ہمیشہ کے لیے آنکھیں بند نہیں رکھ سکتا تھا۔

فروری 1998 میں افغانستان میں ایک اہم ملاقات ہوئی۔ اس میں اسامہ بن لادن، ایمن الظواہری (مصری تنظیم 'الجہاد' کے رہنما)، رحمان خلیل (پاکستانی انصار)، عبدالسلام محمد (بنگلہ دیش)، اورابو یاسر احمد طہ (مغربی شمالی افریقہ کے نمائندے) شریک ہوئے۔ انہوں نے اسلامی جدوجہد کے ایک متحدہ محاذ (Islamic Struggle Front) کے قیام پر اتفاق کیا تاکہ اپنی کارروائیوں کو مربوط بنا سکیں۔ یہ کہنا مشکل ہے کہ 1998 میں جو کچھ ہوا وہ براہ راست اسی اجلاس کا نتیجہ تھا یا نہیں لیکن ہم ان واقعات کو نشان زد کر سکتے ہیں۔ اور یہ بھی واضح ہے کہ اسامہ کبھی بھی امریکہ میں کسی 'جہادی مشن' کا کریڈٹ لینے سے پیچھے نہیں ہٹتا تھا۔

جون 1998 میں اسامہ نے اے بی سی نیوز کے صحافی جان ملر کو انٹرویو دیتے ہوئے امریکہ کے خلاف 'اعلان جنگ' کیا۔ اس سے زیادہ اعلانیہ اقدام اور کیا ہو سکتا تھا؟ سعودی حکومت اسامہ بن لادن کی بڑھتی ہوئی سرگرمیوں سے پریشان ہو کر طالبان پر دباؤ ڈالنے لگی تاکہ وہ اپنے مہمان کو کچھ خاموش رہنے پر آمادہ کریں۔ سعودی حکمرانوں کو پہلے ہی اسامہ کے اثر ورسوخ کا اندازہ ہو چکا تھا۔ 13 نومبر 1995 کو ریاض میں واقع سعودی-امریکی فوجی دفتر پر ایک حملے میں پانچ امریکی مارے گئے تھے۔ اس کے بعد 25 جون 1996 کو الخبر ٹاورز میں امریکی فوجیوں کے رہائشی کمپلیکس کو ٹرک بم سے نشانہ بنایا گیا، جس میں انیس امریکی ہلاک اور چار سو سے زائد زخمی ہوئے تھے۔ تاہم ملا عمر نے اس وقت بھی اور بعد میں بھی واضح کر دیا تھا کہ اسامہ بن لادن ان کے اپنے آدمی ہیں، اور اسے کسی صورت امریکہ یا کسی اور کے حوالے نہیں کیا جائے گا۔

7 اگست 1998 کو تنزانیہ کے شہر دارالسلام اور کینیا کے شہر نیروبی میں امریکی سفارت خانوں پر ٹرک بم حملے کیے گئے۔ نیروبی میں 247 افراد ہلاک ہوئے جن میں بارہ امریکی بھی شامل تھے۔ دارالسلام میں دس افراد مارے گئے۔ امریکی صدر بل کلنٹن نے اسامہ کو میزائل حملے کے ذریعے ختم کرنے کا حکم دیا، اور 20 اگست کو 'آپریشن اِنفینِٹ ریچ' (Operation Infinite Reach) کے تحت افغانستان کے خوست میں اسامہ کے کیمپ اور سوڈان کے دارالحکومت خرطوم کے قریب ایک دواساز فیکٹری پر میزائل داغے گئے۔ لیکن یہ کارروائی ناکام ثابت ہوئی۔ امریکہ کے انٹیلی جنس

ادارے دنیا بھر میں ثبوتوں کی تلاش میں سرگرم ہو گئے۔ ابتدائی گرفتار ہونے والوں میں سے ایک فلسطینی نژاد شخص محمد صادق عودہ تھا جو کینیا کی شہریت اختیار کر چکا تھا۔ دلچسپ بات یہ ہے کہ اسے نہ تو فلسطین میں اور نہ کینیا میں گرفتار کیا گیا، بلکہ اسے پاکستان میں گرفتار کیا گیا۔

جنرل ضیاء الحق کی سرپرستی میں جو اسلحہ اور منشیات کی ثقافت پروان چڑھی تھی اس سے پاکستان کی ساکھ کو بری طرح متاثر کیا اور اس کی داخلی سلامتی کے لیے مستقل خطرہ بن گئی۔ اپریل 1995 میں امریکہ کے دورے سے قبل وزیر اعظم بے نظیر بھٹو نے کہا تھا کہ پاکستان کا وجود اس 'ڈرگ اینڈ گن کلچر' سے خطرے میں ہے۔ درحقیقت ان کی اپنی جان کو بھی شدید خطرہ لاحق تھا۔ ان پر قاتلانہ حملے کی کوشش کرنے والوں میں رمزی احمد یوسف بھی شامل تھا جس نے اسلام آباد میں ان کی رہائش گاہ کو دھماکے سے اڑانے کی کوشش کی۔ ورلڈ ٹریڈ سینٹر پر حملے میں بھی وہ مکمل طور پر کامیاب نہ ہو سکا تھا۔

بالکل سزا سنائے جانے سے پہلے رمزی احمد یوسف نے امریکی ڈسٹرکٹ کورٹ کے سخت گیر اور تلخ مزاج جج سے کہا کہ ''ہاں، میں دہشت گرد ہوں اور مجھے اس پر فخر ہے۔'' اس نے الزام عائد کیا کہ اسے دہشت گرد خود امریکہ نے بنایا ہے۔ پھر اس نے امریکیوں کو مخاطب کرتے ہوئے کہا کہ ''تم لوگ دہشت گرد سے بھی بڑھ کر ہو۔ تم قصائی، جھوٹے اور منافق ہو۔''

رمزی احمد یوسف نے دو جڑواں ٹاورز (twin towers) کو زمیں بوس کرنے کا خواب دیکھا تھا۔ وہ گرفتار کر لیا گیا مگر اس کے خواب کو مقید نہیں کیا جا سکا، اور وہ خواب 11 ستمبر 2001 کو پورا ہوا جب وہ ٹاورز واقعی زمین پر آ گرے۔

طالبان، القاعدہ اور ان جیسے بہت سے گروہ ایک ریاست یا حکومت کے بغیر بھی زندہ رہ سکتے ہیں کیونکہ ان کی تقرری کا مرکز ذہن ہوتا ہے۔ ذہن میں لڑی جانے والی جنگ صرف اسپیشل فورسز یا کروز میزائلوں سے نہیں جیتی جا سکتی۔

7 اکتوبر 2001 کو امریکہ نے 11 ستمبر کے ردعمل میں طالبان، اسامہ بن لادن اور دہشت گردی کے خلاف اعلان جنگ کیا۔ طالبان اور اسامہ کی شکست اپنی تکمیل کو ضرور پہنچی تھی لیکن فیصلہ کن نہیں تھی۔

جہاد کبھی ختم نہیں ہوتا۔ جنوری 2002 کے آخری ہفتے میں بوسنیا میں نسلی تطہیر کی رپورٹنگ میں نمایاں کردار ادا کرنے والے پلٹزر انعام یافتہ صحافی جان ایف برنز نے پاکستان کے گاؤں ’اعزاز خیل بالا‘ سے ’دی نیویارک ٹائمز‘ کے لیے ایک چشم کشا رپورٹ بھیجی۔ انہوں نے لکھا:

’’اعجاز خان حسین کے انداز میں کچھ بھی ایسا نہیں تھا جو یہ ظاہر کرے کہ وہ افغانستان کی جنگ میں بطور رضا کار کیا کچھ دیکھ چکا ہے۔‘‘

کالج سے تربیت یافتہ ایک فارماسسٹ مسٹر اعجاز خان ہزاروں پاکستانیوں کی طرح جہاد میں شرکت کے لیے افغانستان گئے۔ وہ کابل کے قریب ایک میڈیکل آرڈرلی کی حیثیت سے خدمات انجام دے رہے تھے اور محاذ جنگ سے زخمیوں اور لاشوں کو اٹھایا کرتے تھے۔ اکتوبر میں ان کے ساتھ 43 افراد ایک ٹرک میں سوار ہو کر افغانستان گئے تھے، جن میں سے 41 ہلاک ہو گئے۔ اب جب کہ طالبان اور القاعدہ کو شکست دی جا چکی تھی تو سوال یہ تھا کہ کیا اعجاز خان اور ان جیسے دیگر شدت پسندوں نے جہاد کو خیر باد کہہ دیا؟

کم از کم اعجاز خان کے جواب نے اس سوال کو واضح کر دیا۔ انہوں نے کہا:

’’ہم خوشی خوشی جہاد کے لیے گئے تھے اور اگر کل بھی موقع ملا تو میں دوبارہ جاؤں گا۔ اگر اللہ نے مجھے شہادت کے لیے منتخب کیا ہوتا تو میں آج جنت میں ہوتا... شہد، تربوز اور انگور کھا رہا ہوتا اور خوبصورت حوروں کے ساتھ آرام کر رہا ہوتا جیسا کہ قرآن میں اس کا وعدہ کیا گیا ہے، لیکن میرا نصیب یہی ہے کہ دنیا کی اس محرومی میں زندہ رہوں۔‘‘

مقدس جنگ میں شکست محض ایک عارضی تعطل ہے، جہاد جاری رہتا ہے۔

▪

# فرہنگ اصطلاحات

الف

- اقرا (اقرأ) : پڑھ! وحی کا پہلا لفظ۔
- احرام : حج یا عمرہ کے لیے پہنی جانے والی دو سفید چادریں۔
- اجماع : اسلامی قانون کی تعبیر میں اتفاقِ رائے۔
- امام : نماز کی امامت کرنے والا مذہبی رہنما۔
- امت : مسلمانوں کی عالمی برادری۔
- امیر (ولی) : رہنما، سرپرست۔

---

ب

- بازار (سوق) : عربی زبان میں روایتی منڈی۔

---

ت

- تسنیم : جنت کا چشمہ، پاکیزگی اور وفور کی علامت۔
- توحید : اللہ کی یکتائی۔

---

ج

- جمعہ کا خطبہ (خطبہ): مسجد میں کی جانے والی تقریر۔
- جزیہ : غیر مسلموں پر عائد کیا جانے والا ٹیکس۔

---

- جانثار محافظ (ینی چری): عثمانی سلطنت کا نخبہ فوجی دستہ۔
- جاتیاں (جاتی): برصغیر کی سماجی ذاتیں۔
- جاترا : بنگال کے سیار تھیٹر گروپ۔

---

ح

- حشیش : نشہ آور مادہ۔
- حور : جنت کی حسینائیں۔

---

خ

- خلیفہ : اسلامی خلافت کا سربراہ۔
- خطبہ : جمعہ کے دن کی جانے والی تقریر۔
- خواجہ : صوفی پیشوا کے لیے احتراماً استعمال ہونے والا لقب۔

---

د

- دھرم (سناتن دھرم): ہندومت۔

---

ر

- رئیس : اشرافیہ طبقہ۔
- رکعت : نماز کا ایک جزو۔
- راجہ : بادشاہ۔
- راکھی : بہن کا بھائی کے لیے محبت وحفاظت کا دھاگا۔

---

س

- سلف صالحین : نیک بزرگ، صحابہ اور تابعین۔
- سندور : شادی کی علامت کے طور پر عورتوں کی مانگ میں بھرا جانے والا سرخ پاؤڈر۔
- سوق : عربی بازار۔
- سوراج : خودحکمرانی کا نعرہ۔

---

- صف : نماز کے لیے بننے والی قطار۔
- شربت : میٹھا غیر الکحل مشروب۔
- شریف : وہ متمول مسلمان طبقہ جو خود کو وسط ایشیا کے حملہ آوروں کی نسل سے جوڑتا ہے۔

---

ش

- شریعت : قرآن و سنت پر مبنی اسلامی قانون۔
- شہادت : اللہ کی وحدانیت اور محمد صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی رسالت کا اقرار۔
- شکوہ : شکایت، اردو زبان میں استعمال ہونے والا معروف لفظ – علامہ اقبال کی نظم کا عنوان۔
- شیروانی : لمبا، رسمی لباس۔

---

ص

- صف : نماز کی ترتیب وار قطار۔

---

ع

- عمرہ : حج کے علاوہ بیت اللہ کی زیارت۔

---

ق

- قبلہ : نماز کی سمت۔
- قاضی : اسلامی عدالت کا جج۔
- قصیدہ : اردو شاعری کی ایک صنف۔
- قلندر : اللہ کی محبت میں محوصوفی۔

---

ک

- کلمہ : اسلام کا بنیادی اقرار۔
- کفیہ : عربوں کا سر ڈھانپنے والا کپڑا۔
- کتابت کا پہلا لفظ (اقرأ): پڑھ!

---

- کھانے کی ڈش (پلاو): چاول وگوشت سے تیار کردہ لذیذ کھانا۔

گ

- گاؤں کا رئیس (رئیس): اشرافیہ طبقہ۔

ل

- لبیک : اللہ کی بندگی کا اعلان۔
- لنگم : ہندو مذہب میں شیو کی تخلیقی طاقت کی علامت۔
- لنگی : مردوں کا روایتی لباس۔

م

- مجنوں : جنونی شخص، اکثر شاعر۔
- محب (مرید): صوفی کا عقیدت مند۔
- مفتی : شریعت کا ماہر مذہبی عالم۔
- منصب : مغل دور کا درجہ بندی نظام۔
- منبر : مسجد میں خطبہ دینے کی جگہ۔
- ملا (مولوی) : مذہبی پیشوا۔
- مدرسہ : دینی تعلیم کا ادارہ۔
- منافقین : وہ لوگ جنہوں نے نبی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے دغا کی۔
- مرتد : وہ لوگ جنہوں نے حضرت ابوبکرؓ کی خلافت قبول نہ کی۔
- مہدی : وہ پیشوا جس کے بارے میں روایت ہے کہ وہ دین کی تجدید کرے گا۔

ن

- نمستے : خیر مقدم کرنے کا اشارہ۔
- نواب : ہندوستانی ریاستوں کے شاہی حکمران۔
- ناؤس : پرتگالیوں کے بڑے جہاز۔

- نماز کا جزو (رکعت): نماز کا مکمل حصہ۔

---

پ

- پیشوا : مرہٹہ سلطنت کا وزیرِ اعظم۔
- پلاو : چاول اور گوشت سے تیار کردہ مشہور ڈش۔
- پیر : صوفی پیشوا۔
- پولینز : صلیبیوں اور عربوں کے درمیان نسل کشی سے پیدا ہونے والی نسل۔

---

و

- وزیر : حکومت کا اعلیٰ مشیر۔
- ولی : اسلامی رہنما، صوفی یا سرپرست۔

---

ز

- زمیندار : ہندوستان کے زمین دار طبقے کے افراد۔
- زَنجَبِیل : جنت کا مشروب، ادرک سے تیار شدہ۔

# مطالعے کے لیے تجویز کردہ کتابوں کی فہرست

اس کتاب کے موضوع کی نوعیت ایسی ہے کہ اس سے متعلقہ مواد عمومی طور پر رات سونے سے پہلے پڑھنے والے ہلکے پھلکے مطالعے جیسا ہرگز نہیں ہوتا۔ مگر اس فہرست کو اس نیت سے ترتیب دیا گیا ہے کہ وہ تاریخ کے ان بیشمار گوشوں کو مزید اجاگر کرے جن سے ہم اس سفر میں گزرے ہیں اور حیرت انگیز طور پر، ان میں سے کئی کتب نہ صرف بصیرت افروز بلکہ بعض اوقات تفریحی بھی ثابت ہوتی ہیں۔ یہ جان کر آپ کو اطمینان ہوگا کہ آج کا وہ ماحول جس میں پرانی کتب کے نئے ایڈیشن شائع ہو رہے ہیں، اچھی کتابوں کی دکانیں بعض اوقات کتب خانوں جتنی ہی کارآمد ثابت ہو سکتی ہیں۔

اسلام کے مطالعے کے لیے تین بنیادی متون ناگزیر ہیں:

پہلا اور سب سے مقدم قرآن مجید جس کے لیے میں نے عبداللہ یوسف علی کا معروف ترجمہ اور تشریح (دی ہولی قرآن: ٹیکسٹ، ٹرانسلیشن اینڈ کمنٹری، شائع کردہ: اسلامک پروپیگیشن سینٹر انٹرنیشنل، امانہ کارپوریشن، 1989ء) بطور حوالہ استعمال کیا ہے۔ یہ ترجمہ نہایت عمدہ اشاریہ (انڈیکس) کے ساتھ آتا ہے۔

دوسرا بنیادی ماخذ احادیث نبوی ﷺ ہیں، یعنی نبی اکرم ﷺ کے اقوال و افعال جو مختلف مجموعوں کی صورت میں محفوظ ہیں۔ میں نے اس سلسلے میں امام بخاری کے مرتب کردہ مجموعۂ

احادیث کا استعمال کیا ہے جسے کتاب بھون، دہلی نے 1987ء میں نہایت مناسب قیمت پر شائع کیا ہے۔

تیسری اہم کتاب سیرت نبوی کی سب سے بڑی اور ابتدائی تصنیف ہے جو ابن اسحاق نے لکھی ہے اور جس کا ترجمہ الفریڈ گلویم نے کیا ہے (دی لائف آف محمد، آکسفورڈ، 1955ء)۔

اسلام کے ابتدائی دور کے اہم واقعات کے لیے میں نے عربی و انگریزی دونوں زبانوں کے مصادر و مراجع تلاش کیے جو آج خوش قسمتی سے عمدہ ترجموں کی صورت میں دستیاب ہیں۔ ان قدیم متون میں دلچسپی دوبارہ ابھری ہے، اور بہت سی علمی و تحقیقی تنظیمیں انہیں عام قارئین تک پہنچانے کے لیے کام کررہی ہیں۔

ایک شاندار مثال 'بابرنامہ' اور 'جہانگیر نامہ' کے انگریزی تراجم کی ہے، یعنی ہندوستان کے دو عظیم مغل بادشاہوں کی درباری تواریخ جنہیں اسمتھ سونین انسٹی ٹیوٹ نے آکسفورڈ یونیورسٹی پریس، نیویارک کے تعاون سے بالترتیب 1996ء اور 1999ء میں شائع کیا ہے۔ تاہم، میں نے ان کے زیادہ روایتی تراجم کو ترجیح دی، یعنی 'بیورجیز' کے وہ ترجمے جو بیسویں صدی کی پہلی چوتھائی میں کیے گئے۔

# Bibliography

*A Viceroy's India: Leaves from Lord Curzon's Notebook,* Introduced by Elizabeth Longford; Sidgwick & Jackson, London, 1984. Afnan, Soheil M. ***Avicenna: His Life and Works***, George Allen & Unwin, London, 1958. Aga Khan, H.H. *The Memoirs of Aga Khan*, Simon and Schuster, New York, 1954. Ahmad, S. Hasan. *Iqbal, His Political Ideas at the Crossroads,* Printwell, Aligarh, 1979.

Ahmad, Aijaz. *Lineages of the Present: Political Essays,* Tulika Print Communication Services, Delhi, 1996.

Ahmad, Aziz. *Studies in Islamic Culture in the Indian Environment*, Oxford University Press, Delhi, 1969.

Ahmed, Rafiuddin. *The Bengal Muslims, 1871-1906: A Quest for Identity,* Oxford University Press, Delhi, 1981.

Ajami, Fouad. *The Dream Palace of The Arabs: A Generation's Odyssey,* Vintage Books, New York, 1998.

Akbar, M.J. *India: The Siege Within – Challenges to a Nation's Unity,* Penguin, London, 1985.

Akbar, M.J. *Nehru: The Making of India*, Viking, London, 1988.

Akhund, Iqbal. *Memories of a Bystander: A Life in Diplomacy,* Oxford University Press, Karachi, 1997.

Al-Biruni, *Al-Biruni's India: An Account*, tr. E. Sachau, Chand, Delhi, 1964. Alam, Asadollah. *The Shah and I,* I.B. Tauris, London, 1991.

Albuquerque, A. *Commentaries of Afonso de Albuquerque*. tr., W. de G. Birch, 4 Vols. London, 1875-84.

Ali, Chaudhri Muhammad. *The Emergence of Pakistan*, Columbia University Press, New York, 1967.

Allami, Abu' I-Fazl. *The Ain-i-Akbari. Vol. 1*, Oriental Books Reprint Corpora- tion, New Delhi, 1977.

Allen, Charles. *Soldier Sahibs,* The men who made the North West Frontier. Abacus, London, 2000.

Anderson, Walter K. and Damle, Shridhar D. *The Brotherhood in Saffron: The Rashtriya Swayamsevak Sangh and Hindu Revivalism,* Vistaar Publications, Delhi, 1987.

Anwar, Raja. *The Terrorist Prince: The Life and Death of Murtaza Bhutto*, Van- guard Books, Lahore, 1988. Arberry, A.J. *Sufism*, London, 1950.

Armstrong, Karen. *Muhammad: A Western Attempt to Understand Islam,* Victor Gollanz, London, 1991.

Armstrong, Karen. *A History of Jerusalem: One City,Three Faiths,* Harper Collins, London, 1997.

Armstrong, Karen. *Holy War*, Macmillan, London, 1988.

Athar Abbas, Saiyid. *Shah Abdul Aziz: Puritanism, Sectarian Polemics and Jihad,*

Marifat Publishing House, Canberra, 1980.

Attar, Farid al-Din. *Muslim Saints and Mystics*, tr. A.J. Arberry, Routledge and Kegan Paul, London, 1966.

Battuta, Ibn. *Travels in Asia and Africa 1325-1354*, Routledge and Kegan Paul, London, 1984.

Baxter, Craig. *The Jana Sangh: A Biography of a Political Party,* University of Pennsylvania, Philadelphia, 1969.

Beha ed Din. *The Life of Saladin,* Committee of the Palestine Exploration Fund, London, 1897.

*Bibliotheca Indica: A Collection of Oriental Works; The Tabakat-i-Akbari* (*Or A History of India from the Early Mussalman Invasions to the thirty-sixth year of the reign of Akbar*) *of Khwajah Nizamuddin Ahmad,* tr. B. De, Asiatic Society, Calcutta, 1913.

Biddulph, John. *Tribes of Hindoo Kush,* Ali Kamran Publishers, Lahore, 1986. Brown, Judith M. *Gandhi's Rise to Power: Indian Politics 1915-1922,* Cambridge University Press with Blackie India, 1972.

Burnes, Alexander. *Cabool,* Being a personal narrative of a journey to, and resi- dence in that city, in the years 1836, 7 and 8, Munshiram Manoharlal Publish- ers Private Limited, New Delhi, 2001.

Burton, Richard F. *Pilgrimage to Al-Madinah and Mecca,* Tylston and Edwards, London.

Busbecq, Ogier de. *Turkish Letters*. Sickle Moon Books, London, 2001.
Busteed, H.E. *Echoes from Old Calcutta: Reminiscences of the days of Warren Hastings, Francis and Impey,* Rupa, Delhi, 2000.

Cantwell Smith, Wilfred. *Modern Islam in India; A Social Analysis,* V. Gollancz, London, 1943.

Cantwell Smith, Wilfred. *Islam in Modern History,* Princeton University Press, 1957.

Chagla, M.C. *Roses in December: An Autobiography*, Bharatiya Vidya Bhavan, Bombay, 1974.

Chand, Tara. *History of the Freedom Movement in India,* Government of India Publications Division, Delhi, 1977.

Chandler, David. (general editor) *The Oxford Illustrated History of the British Army*, Oxford University Press, Oxford, 1994.

Chatterjee, Joya. *Bengal Divided: Hindu Communalism and Partition, 1932-1947,* Cambridge University Press, 1996.

Chatterjee, Partha. *The Nation and its Fragments: Colonial and Postcolonial His- tories,* Oxford University Press, New Delhi, 1993.

Chatterjee, Partha. *Nationalist Thought and the Colonial World,* Oxford Univer- sity Press, New Delhi, 1986.

Chatterji, Bankim Chandra. *Anandamath,* tr. and adapted from original Bengali by Basanta Koomar Roy, Orient Paperbacks, New Delhi, 1992.

Chaudhuri, Nirad C. *Clive of India: A Political and Psychological Essay,* Barrie & Jenkins, London, 1975.

Ciardi, John. *The Inferno: Dante's Immortal Drama of a Journey Through Hell,* Mentor, New York, 1982.

Cloughley, Brian. *A History of the Pakistan Army: Wars and Insurrections*, Oxford University Press, Karachi, 1999.

Cooley, John K.E. *Unholy Wars: Afghanistan, America and International Terrorism,* Penguin, 2000.

Currie, P.M. *The Shrine and Cult of Muin al-din Chishti of Ajmer,* Oxford University Press, Bombay, 1989.

Daniel, Norman. *Islam and the West: The Making of an Image,* The University Press, Edinburgh, 1958.

Dupree, Louis. *Afghanistan*, Princeton University Press, 1980.

Eden, Emily. *Up the Country: Letters from India.* Curzon Press, London and

Dublin, 1978.

Elst, Koenraad. *Ayodhya and After: Issues Before Hindu Society,* Voice of India, Delhi, 1991.

Embree, Ainslee T., Hay, Stephen. ed. *Sources of Indian Tradition – Volumes I and II,* Viking, Delhi, 1988, 1991.

Ferrier, R.W. *A Journey to Persia: Jean Chardin's Portrait of a Seventeenth Century,* I.B. Tauris, London, 1996.

Fisher, Michael H. *A Clash of Cultures: Awadh, the British and the Mughals,* Manohar, Delhi, 1987.

Fletcher, Richard. *Moorish Spain,* Phoenix Giant, London, 1992.
Friedman, Thomas L. *From Beirut to Jerusalem*, Anchor Books, Doubleday, New York, 1990.

Fyzee, Asaf A.A. *Outlines of Muhammadan Law*, London, 1949.

Gabrieli, Francesco. *Arab Historians of the Crusades,* Dorset Press, New York, 1989.

Garrett, John. *A Classical Dictionary of Islam,* Rupa, Delhi, 2000.

Geertz, Clifford. *Islam Observed: Religious Development in Morocco and Indonesia,* The University of Chicago Press, Chicago, 1968.

Gerald of Wales. *Opera*, J.S. Brewer. ed. Longman and Company, London, 1861.

*Ghazals of Ghalib: Versions from Urdu.* ed. Ahmad, Aijaz, Oxford University Press, Delhi, 1994.

Gibb, H.A.R., and H. Bowen. *Islamic Society and the West*, London, 1957 Gibb, H.A.R. *Modern Trends in Islam,* London, 1945.

Gibbon, Edward. *Decline and Fall of the Roman Empire*, Seven Volumes. AMS Press, New York, 1974.

Glubb, John Baggot. *The Grea Arab Conquests*, Prentice Hall Inc., Englewood Cliffs, New Jersey, 1963.

Godse, Nathuram. *Why I assassinated Mahatma Gandhi,* Surya Bharti Prakashan, 1993.

Golwalkar, M.S. *Bunch of Thoughts,* Jagarana Prakashana, Bangalore, 1966.
Gommans, Jos J.L. *The Rise of the Indo-Afghan Empire. c. 1710-1780,* Oxford University Press, Delhi, 1995.

Goodwin, Goodfrey. *Islamic Spain: Architectural Guides for Travellers*, Penguin, London, 1990.

Gopal, Sarvepalli. *Anatomy of a Confrontation:The Babri Masjid-Ram Janmabhumi,* Viking, 1991.

Gopal, Sarvepalli. *Jawaharlal Nehru: A Biography,* Oxford University Press, 1984.
Gordon, Stewart. *Marathas, Marauders, and State Formation in Eighteenth-Century India,* Oxford University Press, 1994.

Guillaume, Alfred. *Islam.* Penguin, London, 1954.
Guillaume, Alfred. *The Life of Muhammad*, Oxford, 1955.

Gupta, Narayani. *Delhi between two Empires 1803-1931*, Oxford University Press, Delhi, 1981.

Habib, John S., *Ibn Saud's Warriors of Islam: The Ikhwan of Najd and their Role in the Creation of the Saudi Kingdom*, 1910-1930, E.J. Brill, Leiden 1978. Humanities Press/ New Jersey, 1978.

Hall, Richard. *Empires of the Monsoon*, Harper Collins, London, 1998.
Harrison, Selig S. *India: The Most Dangerous Decades,* Oxford University Press, 1960.

Harvey, Robert. *Clive: The Life and Death of a British Emperor,* Hodder and Stoughton, London, 1998.

Hasan, Mushirul. *Nationalism and Communal Politics in India*, Manohar, New Delhi, 1991.

Heber, Bishop, R. *Narrative of a Journey through the Upper Provinces of India*, John Murray, London, 1849.

Henderson, Michael. *Experiment with Untruth: India Under Emergency,* Macmillan, New Delhi, 1977.

Hersh, Seymour M. *The Samson Option: Israel's Nuclear Arsenal and American Foreign Policy,* Random House, New York, 1991.

Hersh, Seymour M. *Kissinger, The Price of Power*, Faber and Faber, London, 1983.

Herzog, Chaim. *The Arab-Israeli Wars,* Arms and Armour Press, London, 1982.
Hiro, Dilip. *Islamic Fundamentalism*, Paladin, London, 1988.

Hitti, Philip K. *History of the Arabs*, Macmillan, London, 1937.

Hobsbawm, Eric. *The Age of Empire, 1875-1914,* Random House, New York, 1989.

Holden, David and Johns, Richard. *The House of Saud,* Sidgwick and Jackson, London, 1981.

Holt, P.M. *The Age of the Crusades*, Longman, London, 986. Hopkirk, Peter. *The Great Game*, John Murray, London, 1970.

Hopkirk, Peter. *Setting the East Ablaze*, John Murray, London, 1970.

Hunter, W.W. *The Indian Mussalmans.* Lahore, 1968, repeat from the 1871 edition.

Huntington, Samuel P. *The Clash of Civilizations and the Remaking of the New World Order*, Simon and Schuster, New York, 1966.

Hyam, Ronald. *Empire and Sexuality: The British Experience,* Manchester Uni- versity Press, 1992.

Ibn Jubayr. *The Travels of Ibn Jubayr*, tr. R.J.C. Broadhurst, Jonathan Cape, London, 1952.

Ibn Khaldun, *The Muqaddimah: An Introduction to History*, tr. F. Rosenthal, ed. and abridged by J. Dawood, London, 1978.

Iqbal, Mohammad. *The Reconstruction of Religious Thought in Islam*, Javid Iqbal, Ashraf Press, Lahore, 1951.

Irving, Washington. *Tales of the Alhambra,* Ediciones Miguel Sanchez, Granada, 1994.

*Islam and Revolution. Iman Khomeini's Writings and Declarations*: Tr. and annotated by Hamid Algar, KPI Ltd, England, 1985.

Jackson S.J., Paul. tr. *Sharafuddin Maneri: The Hundred Letters,* Better Yourself Books, Bombay, 1985.

Jaffrelot, Christopher. *The Hindu Nationalist Movement and Indian Politics 1925 to the 1990s,* Penguin, Delhi, 1993.

Jalal, Ayesha. *The State of Martial Rule. The Origins of Pakistan's Political Economy of Defence,* Vanguard, Lahore, 1991.

Jalal, Ayesha. *The Sole Spokesman. Jinnah, the Muslim League and the Demand for Pakistan,* Cambridge University Press, 1985.

Juvaini, Ata-Malik. *Genghis Khan: The History of the World Conqueror,* tr. and ed. J.A. Boyle, University of Washington Press, Seattle, 1997.

Kabir, Humayun. *Muslim Politics 1906-47 and Other Essays,* Firma K.L. Mukhopadhyay, Calcutta, 1969.

Kaye, John William. *Lives of Indian Officers,* A. Strahan and Co., Ludgate Hill, Bell and Daldy, York Street, Covent Garden, 1867.

Keay, John. *India: A History,* Harper Collins, London, 2000.

Keay, John. *The Gilgit Game,* Oxford University Press, Karachi, 1993.

Keay, John. *The Honourable Company – A History of the East India Company*, Harper Collins, 1991.

Keddie, Nikki. *An Islamic Response to Imperialism,* University of California Press, 1968.

Khan, M. Ayub. ***Friends not Masters, A Political Biography***, Oxford University Press, London, 1967.

Khan, Roeded. ***Pakistan – A Dream Gone Sour,*** Oxford University Press, Karachi, London, 1998.

Khan, Sultan M. ***Memories and Reflections of a Pakistani Diplomat***, The Centre for Pakistan Studies, London, 1997.

Lawrence, T.E. ***Seven Pillars of Wisdom: A Triumph***, Anchor Books, Doubleday, 1991.

Lelyveld, David. ***Aligarh's First Generation***, Princeton University Press, 1977. Lewis, Bernard. ***The Political Language of Islam,*** The University of Chicago Press, Chicago and London, 1988.

Lewis, Bernard. *The Middle East: History of Civilisation,* Weidenfeld and Nicolson, 1995.

Lewis, Bernard. ***Islam and the West,*** Oxford University Press. New York, 1993. Lewis, Bernard. ***The Jews of Islam,*** Princeton University Press, 1984.

Lewis, Bernard. ***The Assassins,*** Saqi Books, London, 1985.

Lichtenstadter, Ilse. ***Introduction to Classical Arabic Literature,*** Twayne Publish- ers Inc., New York, 1974.

Lings, Martin. ***Muhammad: His Life Based on the Earliest Sources***, George Allen and Unwin, London, 1982.

Maalouf, Amin. ***The Crusades Through Arab Eyes***, tr. John Tothschild, Al Saqi Books, London, 1984.

Maalouf, Amin. ***Samarkand,*** tr. Russell Harris, Abacus, London 1994. MacMunn, George. ***The Martial Races of India***, Mittal Publications, Delhi, 1979. ***Making India Hindu: Religion, Community, and the Politics of Democracy in India,*** ed. David Ludden, Oxford University Press, Delhi, 1996.

Mansel, Philip. ***Constantinople: City of the World's Desire 1453-1924,*** Penguin, London, 1995.

Manucci, Niccolao. ***A Pepys of Mogul India 1653-1708,*** Srishti Publishers and Distributors, Delhi, 1999.

Mason, Philip. ***Skinner of Skinner's Horse,*** Clarion Books, Delhi, 1979.

Mason, Philip. ***A Matter of Honour: An Account of the Indian Army and its Officers and Men***, Penguin, London, 1974.

Masselos, Jim. ***Indian Nationalism,*** Sterling, Delhi, 1985.

*Memoirs of Lt. Gen. Gul Hassan Khan*, Oxford University Press, Karachi, 1993. Metcalf, Barbara Daly. *Islamic Revival in British India: Deoband, 1860-1900*, Princeton, 1982.

Meyer, Karl E. and Blair Brysac, Shareen. *Tournament of Shadows: The Great Game and the Race for Empire in Central Asia,* A Cornelia and Michael Bessie Book, Washington, 1999.

Miles, Jack. *Christ: A Crisis in the Life of God,* Random House, London, 2001. Minault, Gail. *The Khilafat Movement: Religious Symbolism and Political Mobi-*

*lization in India*, Columbia University Press, New York, 1982.

Moon, Penderel. *The British Conquest and Dominion of India,* Gerald Duckworth, London, 1989.

Morris, James. *Heaven's Command: An Imperial Progress; Pax Brittanica; Farewell the Trumpets: An Imperial Retreat* (Trilogy), Penguin, London, 1979.

Mottahedeh, Roy. *The Mantel of the Prophet. Religion and Politics in Iran,* Penguin, London, 1987.

Muhammad, Iqbal *Reconstruction of Religious Thought in Islam,* London, 1934. Muhammad, Iqbal. *The Secrets of the Self: Allama Iqbal's Asrar-i-Khudi,* Intro-duction by Reynold A. Nicholson, Lahore, 1955.

*Muhammad Iqbal: Shikwa and Jawab-i-Shikwa; Complaint and Answer: Iqbal's dialogue with Allah,* tr. Khushwant Singh, Oxford University Press, Delhi, 1981.

Mujeeb, M. *The Indian Muslims,* Allen and Unwin, London, 1967. Mukhopadhyay, Tarun Kumar. *Hicky's Bengal Gazette, Contemporary Life and Events,* Subarnarekha, Calcutta, 1998.

Nasr, Seyyed Hossein. *Ideals and Realities of Islam*, London, 1966.

Nasr, Seyyed Hossein. *Islamic Art and Spirituality,* Oxford University Press, 1990. Nehru, Jawaharlal. *Discovery of India*, Signet Press, Calcutta, 1946.

Newby, Eric. *A Short Walk in the Hindu Kush*, Picador, London, 1974.

Niazi, A.A.K. *The Betrayal of East Pakistan*, Oxford University Press, Karachi, 1998.

Nicholson, Reynold A. *The Mystics of Islam*, Arkana, 1989.

Page, David. *Pakistan: Past and Present*, Stacey International, London, 1977. Page, David. *Prelude to Partition: The Indian Muslims and the Imperial System of Control, 1920-1930*, Manohar, New Delhi, 1982.

Palmer, Alan. *The Decline and Fall of the Ottoman Empire,* John Murray, London, 1992.

Panikker, K.M. *Malabar and the Portuguese*, Bombay, 1929.

Parrinder, Geoffrey. *Jesus in the Quran*, Oneworld Publications, England, 1965.

Pirzada, Syed Sharifuddin (ed). *Foundations of Pakistan: All India Muslim League Documents*, National Publishing House, Karachi, 1969.

Potter, David C. *India's Political Administrators: From ICS to IAS,* Oxford University Press, Delhi, 1996.

Prasad, Bimal. *The Foundation of Muslim Nationalism, Pathway to India's Parti- tion, Volume I; A Nation within Islam: Pathway to India's Partition Volume II.* Manohar, Delhi, 1999 and 2000.

Raeside, Ian. *The Decade of Panipat (1751-56*), tr. from Marathi, Popular Prakashan, Bombay, 1984.

Rashid, Ahmed. *Taliban: Islam, Oil and the New Great Game in Central Asia,* I.B. Tauris, London, 2000.

Reif, Stefan C. *A Jewish Archive from Old Cairo*, Curzon Press, Surrey, 2000.

Reston Jr., James. *Warriors of God: Richard the Lionheart and Saladin in the Third Crusade,* Faber and Faber, 2001

Rodinson, Maxime. *Mohammed*, tr. Anne Carter, Penguin, London, 1971.

Rodinson, Maxime. *Islam and Capitalism*. Penguin, London, 1997.

Rosabi, Morris. *Khubilai Khan: His Life and Times,* University of California Press, Berkeley, Los Angeles, 1998.

Rosenthal, Erwin. *Islam in the Modern National State,* Cambridge University Press, 1965.

Runciman, Steven. *History of the Crusades*, Cambridge University Press, 1951.

Russell, Ralph and Islam, Khurshidul. *Ghalib: Life and Letters*, Oxford University Press, Delhi, 1994.

Ruthven, Malise. *Islam in the World*, Penguin, London, 1984.

Said, Edward W. *Orientalism: Western Concepts of the Orient,* Penguin, 1995.

Salik, S. *Witness to Surrender*, Oxford University Press, Karachi, 1978.

Sampson, Anthony. *The Seven Sisters: The Great Oil Companies and the World They Made*, Hodder and Stoughton, London, 1975.

Sanyal, Usha. *Devotional Islam and Politics in British India: Ahmad Riza Khan and his Movement* 1870-1920, Oxford University Press, Delhi, 1996.

Sarkar, Jadunath. *The History of Bengal*. Vol. 2. *The Muslim Period 1200-1757*, ed., Dacca, 1948.

Saunders, J.J. *The History of Mogul Conquests,* Routledge and Kegan Paul Limited, London, 1971.

Segev, Tom. *One Palestine, Complete: Jews and Arabs under the British Mandate,* Little, Brown and Company, London, 2000.

Sengupta, Nitish. *History of the Bengali-Speaking People,* UBS Publishers' Distributors Limited, Delhi, 2001.

Sharar, Abdul Halim. *Lucknow: The Last Phase of an Oriental Culture,* tr. and ed.

E.S. Harcourt and Fakir Hussain, Paul Elek, London, 1975

Sharma, Dasharatha. ed. *Rajasthan Through the Ages, Vol. 1.* Rajasthan State Archives, 1966.

Singh, Khushwant. *A History of the Sikhs, 2 Volumes,* Oxford University Press, Delhi, 1977.

Sleeman, W.H. *Rambles and Recollections of an Indian Official,* London, 1844. Spear, Percival. *The Nabobs*, Curzon Press, London and Dublin, 1980.

Stein, Aurel. *On Alexander's Track of the Indus*, Phoenix Press, London, 2001. Stephens, Ian. *Pakistan: Old Country, New Nation,* Pelican, Great Britain, 1964. Studdert-Kennedy, Gerald. *Providence & the Raj: Imperial Mission and Missionary Imperialism,* Sage Publications, Delhi, 1998.

Talbot, Ian. *Pakistan: A Modern History,* Hurst and Company, London, 1998. Tendulkar, D.G. *Mahatma: The Life of Mohandas Karamchand Gandhi,* 8 Vol-

umes, Government of India Publications Division, Delhi, 1951.

*The Days of John Company: Selection from Calcutta Gazette 1824-1832,* Das Gupta, Anil Chandra. ed. West Bengal Government Press, Calcutta, 1959.

Tod, Colonel James. *Annals and Antiquities of Rajasthan or The Central and Western Rajput States of India, ed. W. Crooke,* reprint, Oxford University Press, Lon- don, 1920.

Trench, Charles Chenevix. *Viceroy's Agent*, Jonathan Cape, London, 1987. Troll, Christian. *Sayyid Ahmad Khan: A Restatement of Muslim Theology,* New Delhi, 1978.

Tuker, F.I.S. *While Memory Serves*, Cassell, London, 1950.

Verrier, Anthony. *Francis Younghusband and the Great Game,* Jonathan Cape, London, 1991.

*Viceroy's Personal Reports*. In the series *India, The Transfer of Power*, HMSO, London, 1980, 1981, 1983.

Waliullah, Shah. *Shah Waliullah ke Siyasi Maktubat*, ed. Khaliq Ahmad Nizami, Delhi, 1969.

Watt, W. Montgomery. *Islam and the Integration of Society,* Routledge and Kegan Paul, London, 1961.

Weir, Alison. *Eleanor of Aquitaine*, Pimlico, London, 2000.

Willey, Peter. *The Castles of the Assassins,* Craven Street Book, George G. Harrap, London, 1963.

Winius, George D. and Vink, Marcus P.M. *The Merchant Warrior Pacified. The VOC (the Dutch East India Company) and its Changing Political Economy in India,* Oxford University Press, Delhi, 1994.

Wink, Andre. *Al-Hind: The Making of the Indo-Islamic World, Volume I, Early Medieval India and the Expansion of Islam. Seventh to Eleventh Centuries,* Oxford University Press, Delhi, 1990.

Wolpert, Stanley. *Jinnah of Pakistan*, Oxford University Press, New York, 1984.

Younghusband, Francis. *The British Invasion of Tibet*, The Stationary Office, London, 1999.

Zakaria, Rafiq. *The Man Who Divided India,* Popular Prakashan, Mumbai, 2001.

Zakaria, Rafiq. *Muhammad and the Quran,* Penguin, Delhi, 1991.

Zakaria, Rafiq. *The Struggle Within Islam,* Viking, Delhi, 1988.

# خسرو فاؤنڈیشن-ایک نئی پہل

ہندوستان، جنت نشان جو مذہبی، لسانی اور تہذیبی تکثیریت کا ملک ہے، کثرت میں وحدت سے جس کی پہچان ہوتی ہے، اس عظیم ملک کی تاریخ کا ہر دور انسان دوستی کی مثالوں سے بھرا ہوا ہے۔ جس میں شکتی اور شانتی بھکتوں کے گیتوں کا نتیجہ ہے۔ ہندوستان ہمیشہ اس بات کا گواہ رہا ہے کہ دھرتی کے باسیوں کی مکتی پریت میں ہے۔

پتہ نہیں دنیا کو کس کی نظر لگ گئی کہ سماجی قربتیں فاصلوں میں بدلنے لگی ہیں۔ اس دیس کے باسیوں کی بڑی تعداد اگرچہ آج بھی اس عدم اتفاق اور تفریق کا حصہ بننے کو تیار نہیں لیکن غالب ترین اکثریت بھی اگر خاموش رہے تو وہ اس کے وجود کو عدم میں تبدیل کر دیتی ہے۔ اب زیادہ تر لوگ اپنی ذات کے گرد طواف کر رہے ہیں۔ غم زمانہ کی جگہ درِ تنہا سے دوچار ہیں اور وہ انسان جو کبھی ضمیرِ دشت و دریا تھا آج اسیرِ آشیانہ بنا ہوا ہے۔ ان حالات میں ہاتھ پر ہاتھ دھرے بیٹھا نہیں رہا جا سکتا، اس لئے ضروری ہے کہ ایک بار پھر ان تمام علامتوں کو زندہ کیا جائے جو ''محبتوں کی گاتھا'' اور ''پریم کے ڈھائی اکچھر'' سے لوگوں کو ایک دوسرے سے جوڑے رہیں۔ جن کے نزدیک مادرِ وطن، وہاں پیدا ہونے اور بسنے والے، اس کے دریاؤں کا پانی پینے والے، اس کے کھیتوں میں پیدا ہونے والے رزق سے اپنی بھوک مٹانے والوں کو پھر اس بات کا احساس دلایا جائے کہ ان کا مذہب، زبان اور علاقہ کچھ بھی ہوسکتا ہے۔ لیکن ماں اور ماٹی سے ان کا رشتہ اس دنیا کے پیدا کرنے

والے اور چلانے والے رب کی مرضی کا نتیجہ ہے اور جس میں رب راضی اس میں سب راضی رہیں، تو ہی بہتری اور بھلائی ہے۔

ہندوستان میں ایک دوسرے کو جوڑنے والوں کا اگر ذکر کیا جائے تو ان کے نام اور کام گنانے میں کوئی دیر نہ لگے گی لیکن اگر ایک دوسرے کو ایک دوسرے سے الگ کرنے والوں اور بانٹنے والوں کے نام کسی سے پوچھے جائیں تو اسے ان کے نام یاد کرنے اور بتانے میں بڑی مشکل آئے گی۔ اس سب کے باوجود آج پھر یہ دوریاں اور یہ ٹکراؤ جو گاہے بگاہے دیکھنے کو ملتا ہے، اس کا سیدھا سادھا جواب یہی ہے کہ ہم نے انہیں بھلا دیا ہے جنہیں ہمیں یاد رکھنا چاہیے۔ دیوی دیوتاؤں، پیغمبروں، پیروں اور رشیوں مُنیوں کے تیاگ، تپسّیا، سمرپن اور سیوا بھاؤ کو زندہ کرنے کی ضرورت ہے۔ ان کے سندیش اور اپدیش ایک دفعہ پھر لوگوں تک پہنچائے جائیں۔

یہی وہ سوچ اور فکر مندی ہے جس کے تحت ''خسرو فاؤنڈیشن'' کی بنیاد رکھی گئی ہے۔ حضرت امیر خسرو ہندوستان کے عہد وسطیٰ کی وہ محبوب، دلنواز اور ہمہ گیر شخصیت ہیں جنہیں صدیاں گزر جانے کے باوجود یاد رکھا گیا اور ہمیشہ یاد رکھا جائے گا۔ وہ بیک وقت صوفی بھی تھے اور سپاہی بھی، وہ شاعر بھی تھے اور ماہرِ موسیقی بھی، وہ مورخ بھی تھے اور تاریخ ساز بھی۔ غرض ان کی شخصیت کی عبقریت نے ان کو گوں ناگوں صفات کا حامل اور ہمہ جہت پہلوؤں سے اس طرح متصف کیا کہ عہد وسطیٰ کی ہندوستانی تاریخ میں بڑے بڑے ناموں کے نشان مٹ گئے لیکن جب سے آج تک نہ صرف خسرو بلکہ ہماری تاریخ کا ہر جز انسانی ذہنوں میں زندہ و تابندہ ہے۔ مسرت کے لمحے ہوں یا یاس وغم کی گھڑیاں، خسرو کا نام اور کلام ہمہ وقت اپنی جاذبیت اور آفاقیت کے اعتبار سے ہمارے ساتھ ہے۔

اس گتھی کو تو ماہرینِ نفسیات ہی سلجھا سکتے ہیں کہ خسرو نے کس طرح حال وقال، جنگ وجدل، سوز و ساز، خانقاہ اور دربار کے درمیان توازن برقرار رکھا۔ یہ اس لیے بھی اہم ہے کہ تاریخ شہادت دیتی ہے کہ انہوں نے یہ توازن اپنی شخصیت کے کھرے پن کے ساتھ قائم کیا تھا۔ ان کی ہر وابستگی اور ہر رول کھلی کتاب کی طرح سب پر عیاں تھا اور اس کھلے پن کے تعلقات کے باوجود زندگی بھر کامیاب رہے۔ صدق بہ تدبّر کی مثالیں امیر خسرو کی شخصیت کو ہمارے لئے اور بھی آئیڈیل بناتی ہیں۔

اس ''ترک نژاد'' کی وطن دوستی نہ صرف مثالی، بلکہ قابلِ رشک بھی ہے۔خسرو کے نزدیک یہ سرزمینِ ہند،عدن کی جنت، یہاں کے لوگ ہر رنگ میں انہیں عزیز، یہاں کے درباروں کے آگے ایران،توران،خراسان کے دربار ہیچ۔ یہاں کے لوگ ہر صنعت،علم وادب کی ہر شاخ،فنونِ لطیفہ کے ہر میدان اور عسکری تربیت کے ہر انداز میں ''بے نظیر'' اہلِ ہند کا توحیدی مسلک انہیں باوجود ایک راسخ العقیدہ مسلمان ہونے کے عزیز ہے۔ وہ کہتے ہیں کہ اگر چہ وہ (یعنی اہلِ ہند) ہمارے جیسا دین نہیں رکھتے،مگر ان کے اکثر عقیدے ہمارے جیسے ہیں۔

آج ضرورت اس بات کی ہے کہ ہم ہندوستان، ہندوستان کی ہر روایت چاہے وہ مذہبی ہو یا تہذیبی، ثقافتی ہو یا لسانی،علمی ہو یا ادبی، اس کو خسرو کی طرح دیکھیں،اپنائیں، اس پر صدقے اور واری جائیں۔خسرو جن کی ماں ہندی اور باپ ترک تھے،ایسے ہندوستانی ہیں جو ہندوستان کی عظمت کے ترانے ہی نہیں گاتے بلکہ وہ اپنے آپ کو اس مٹی کا اس طرح حصہ بنانا چاہتے ہیں جیسے یہ مٹی ہی سب کچھ ہو اور جس سے تعلق اور محبت کو الطاف حسین حالی نے یوں بیان کیا ہے:

تیری اک مشتِ خاک کے بدلے
لوں نہ ہرگز اگر بہشت ملے

خسرو فاؤنڈیشن وطن دوستی، انسان دوستی،فطرت سے ہم آہنگی، ہر طرح کی تفریق چاہے وہ فرقہ وارانہ ہو یا جنسی سب سے اوپر اٹھ کر محبت کو عام کرنا چاہتی ہے۔اس لئے کہ بقول شیخ ابراہیم ذوق:

گلہائے رنگارنگ سے ہے زینت چمن
اے ذوق اس جہاں کو ہے زیب اختلاف سے

□□□

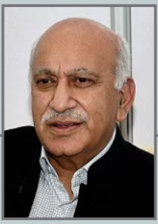

ایم جے اکبر

ایم جے اکبر سے معروف مبشر جاوید اکبر برصغیر کے ممتاز صحافی، مصنف اور دانشوروں میں شمار ہوتے ہیں جو نہ صرف ایک سحر انگیز نثر نگار ہیں بلکہ ہندوستان کے ذہین ترین صحافیوں میں بھی نمایاں مقام رکھتے ہیں۔ انہوں نے اپنے صحافتی سفر میں کئی اہم سنگ میل طے کیے۔ انہوں نے 1976 میں سنڈے گارڈین اور 1982 میں دی ٹیلی گراف کا آغاز کیا۔ یہ دونوں ہی اخبار صحافت کی تاریخ میں سنگِ میل کی حیثیت رکھتے ہیں۔ 1994 میں دی ایشین ایج جیسے بین الاقوامی نظریے سے مزین روزنامہ جاری کیا جس کے وہ خود چیف ایڈیٹر اور منیجنگ ڈائریکٹر رہے۔ 2010 میں انہوں نے ہفتہ وار اخبار سنڈے گارڈین شروع کیا جس کے وہ اب بھی چیف ایڈیٹر ہیں۔ انڈیا ٹوڈے جیسے معتبر ادارے سے بھی وہ ادارتی ڈائریکٹر کے طور پر وابستہ رہے۔

بین الاقوامی سطح پر بھی ان کی رائے کو بڑی اہمیت حاصل ہے۔ وہ کینیڈا کی وزارت خارجہ، دفاع اور سلامتی کے اعلیٰ حکام کے ساتھ متعدد اہم ملاقاتوں میں بھارت کی خارجہ وسکیورٹی پالیسی پر بصیرت افروز تبصرے پیش کر چکے ہیں۔ 2012 میں انہوں نے ہیلیفیکس انٹرنیشنل سکیورٹی فورم میں بھی شرکت کی جہاں افغانستان، پاکستان اور کشمیر کے حوالے سے ان کی رائے کو بڑی سنجیدگی سے سنا گیا۔

بطور مصنف ایم جے اکبر نے متعدد غیر افسانوی کتابیں تحریر کی ہیں جن میں انڈیا: دی سیج وِدِن، بائی لائن، بایوگرافی آف نہرو، رایٹ آفٹر رایٹ اور دی شیڈ آف سوورڈز شامل ہیں۔ ان کی کتاب بلڈ برادرز جو تین نسلوں پر مشتمل ایک خاندانی داستان ہے اور ہندو-مسلم تعلقات کی پیچیدگیوں پر روشنی ڈالتی ہے، پاکستان سمیت کئی اسلامی ممالک میں بیسٹ سیلر رہی ہے۔ ان کی ایک اور معروف تصنیف ٹنڈر باکس، پاکستان کے ماضی، حال اور مستقبل کے سوالات پر مبنی ایک بصیرت افروز تجزیہ ہے۔

ایم جے اکبر نے سیاست میں بھی حصہ لیا اور 1989 سے 1991 تک کانگریس پارٹی کی جانب سے بہار کے کشن گنج پارلیمانی حلقہ سے رکن پارلیمان رہے۔ بعد ازاں بھارتیہ جنتا پارٹی کی سرکار میں وزیر مملکت امور خارجہ اور ممبر پارلیمنٹ راجیہ سبھا کے پُر وقار عہدے پر فائز رہنے کے بعد صحافت کی دنیا میں واپس آ گئے۔

2004ء میں سعودی عرب کی طرف سے مسلم دنیا کے لیے 10 سالہ مسودہ چارٹر بنانے والی خصوصی کمیٹی کے رکن مقرر ہوئے جس کی میٹنگ مکہ میں ہوئی اور بادشاہ کو اس کی رپورٹ پیش کی گئی۔

ایم جے اکبر ایک کشمیری خاندان سے تعلق رکھتے ہیں اور کلکتہ کے معروف پریذیڈنسی کالج سے انگریزی ادب میں بی اے (آنرز) کی ڈگری حاصل کر چکے ہیں۔

ایم جے اکبر کی معرکۃ الآراء تصنیف دی شیڈ آف سوورڈز جس کا اردو ترجمہ "تلواروں کے سائے میں" ایک نہایت اہم اور بصیرت آمیز تصنیف ہے جو جہاد کی تاریخ کو ایک مربوط اور فکری انداز میں پیش کرتی ہے۔ زیر نظر کتاب نہ صرف جہاد کے تاریخی تسلسل کو واضح کرتی ہے بلکہ مسلمانوں کے فکری، سیاسی اور تہذیبی سفر کا ایک عمیق اور بے لاگ تجزیہ بھی پیش کرتی ہے۔ یہ کتاب ان قارئین کے لیے خاص طور پر اہم ہے جو موجودہ عالمی منظرنامے کو ماضی کی روشنی میں سمجھنا چاہتے ہیں۔

ISBN:978-81-985023-1-5

ख़ुसरो फ़ाउण्डेशन خسرو فاؤنڈیشن
KHUSRO FOUNDATION

D-319, Defence Colony, New Delhi-110024 +91 9318431341

@Khusrofounda @khusrofoundation @foundationkhusro @khusro_foundation